لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

محمد رسول الله

تخریج شدہ ایڈیشن

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب



سیرۃ النبی ﷺ

تالیف

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ اسلامیہ

تخریج شدہ ایڈیشن

حصہ ششم

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب

اس حصے میں اخلاق، فلسفۂ اخلاق، حقوق و فرائض، رذائل اور آداب زندگی کے بارے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں رہنمائی کی گئی ہے۔

تالیف

علامہ شبلی نعمانی

علامہ سید سلیمان ندوی

مکتبہ اسلامیہ

کتاب ------------------- سیرۃ النبی ﷺ

تالیف ------------- علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی

ناشر ---------------------------- محمد سرور عاصم

اشاعت ------------------- اکتوبر 2012ء

قیمت ----------------------------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 37244973-042 فیکس: 37232369-042

بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد۔ پاکستان فون: 2631204, 2034256-041

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع ثانی

اللہ تعالیٰ کا ہزار شکر ہے کہ اس نے اپنے ایک حقیر بندہ کی خدمت کو عام مسلمانوں میں اور مخصوص اہل علم کی نگاہوں میں مقبولیت کی نعمت عطا فرمائی: ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (١٤/ ابراهيم: ٣٤) ''خدا کی نعمتوں کا شمار کون کرسکتا ہے۔''

قدردانوں کا تقاضہ تھا کہ اس کی چھوٹی جلد جلد شائع ہو، مگر کتاب کی ضخامت اور کاغذ کی گرانی کے سبب سے اس میں رکاوٹوں پر رکاوٹیں پیش آتی رہیں، اور آخر کئی برسوں کے بعد وہ دن آیا کہ پوری کتاب دوبارہ چھپ کر ختم ہوئی اور اب وہ آپ کے سامنے ہے۔

اب ساتویں جلد (معاملات) کا معاملہ درپیش ہے، بقدرِ توفیق اس کے کچھ صفحات لکھے بھی گئے ہیں، مگر ابھی کام بہت باقی ہے، احباب سے اس کے حسن انجام کی دعا کا خواستگار ہوں۔

والسلام

ہیچ مداں — ۲۹/شوال ۱۳۶۰ھ

سلیمان — ۱۹/نومبر ۱۹۴۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰه الذی انزل الکتاب والحکمۃ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ نبی الرحمۃ۔
وعلی الہ واصحابہٖ اولی العزم والھمۃ۔

اے تو بہمیں صفت سزاوار — نام تو گرہ کشائے ہر کار
اے کردہ ز گنج خانہ راز — بر آدمیاں در سخن باز
عالم ز تو شد بحکمت آباد — حکمت ز تو یافت آدمی زاد

☆☆☆☆☆☆☆

در قربت حضرت مقدس — پیغمبرؐ پاک، رہبرم، بس
گنجینۂ کیمیائے عالم — پیش از ہمہ پیشوائے عالم
نامش بسریر پادشاہی — توقیع سپیدی و سیاہی (خسرو)

سیرتِ نبوی ﷺ کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے، یہ ان اخلاقی تعلیمات کی تفصیل اور تشریح میں ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بتائی اور سکھائی گئیں، یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کی نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہے، عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں۔ اسی لیے عوام کے اس وہم کو دور اور قوموں کی ترقی و تہذیب میں اخلاق کی صحیح اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ان اوراق میں اس باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملت کی تعمیر کا اہم جزو اخلاق کی صحیح تربیت ہے۔

کتاب میں اس نکتہ کی طرف کہ اخلاق حسنہ ''اسمائے حسنیٰ'' کا پرتو ہیں۔ بار بار اشارہ کیا گیا ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی مخلوق، خالق کی کسی صفت میں برابر کی شریک نہیں ہو سکتی۔ ایسا سمجھنا سراسر شرک ہے، بات اتنی ہے کہ بندہ کے جس وصف کو خدائے تعالیٰ کی جس صفت سے مناسبت ہوتی ہے، اس پر اس صفت کا اطلاق مجازاً کر دیتے ہیں، جیسے اللہ کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہیں ہے، جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہے۔ مگر اللہ کی اس صفت علم کے ساتھ ساتھ بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی صفتِ علم اللہ میں ہے، بندہ میں نہیں، لیکن چونکہ خدائے تعالیٰ اپنی صفتِ علم سے بندہ میں ایک انکشافی شان پیدا کر دیتا ہے، اس لیے بندہ کی اس ادنیٰ انکشافی شان کو بھی علم کہہ دیتے ہیں۔ [1] ورنہ درحقیقت ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں، یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کے دوسرے صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہے، اسی لیے بہت سے اہل حق اور اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں میں اوصاف کا اشتراک،

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے معارف لدنیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ ص ۲۴۔ مطبوعہ مدینہ بجنور۔

اشتراک بادنیٰ مناسبت ہے اور بس، ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ: ۱۱)

کتاب میں چند موقعوں پر مختلف مذہبوں سے اسلام کا موازنہ آ گیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس سے مقصود وہ تعلیمات و ہدایات ہیں جو آج ان کی طرف منسوب صحیفوں میں پائی جاتی ہیں، یا ان کے موجودہ پیروان کی طرف منسوب کرتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبر صادق کی تعلیم ہر اعتراض سے بلند اور ہر خردہ گیری سے پاک ہے اور نبوت کے جس دور میں جو ربانی تعلیم آئی، وہ اس کے لیے بالکل مناسب تھی۔ یہاں تک کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کی ہمیشہ کے لیے تکمیل فرما دی گئی۔ کتاب میں کہیں کہیں فقہی مسئلے آ گئے ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہے، اس لیے فقہی جزئیات اور تفصیلات میں الجھا نہیں گیا ہے، ایسے موقع پر اگر شک و شبہ ہو تو ضروری ہے کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فقہ کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے۔

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں اخلاق کی مذہبی اہمیت ظاہر کی گئی ہے پھر کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اخلاق کا ایک فلسفہ مرتب کیا جائے، اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے طریقہ تعلیم کی کچھ خصوصیتیں گنائی گئی ہیں۔ پھر حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کے مختلف عنوانوں سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کی گئی ہے۔

فضائل، رذائل اور آداب کے بعض بعض عنوان میرے رفیق کار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے لکھے ہیں، جن کو میں نے گھٹا بڑھا کر شامل کر لیا ہے۔ موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکر گزار ہوں۔

آیات و احادیث سے احکام کے استنباط اور مصالح و حکم کی تشریح میں اپنے ذوق و فکر کی رہبری سے چارہ نہ تھا۔ سہو و خطا انسان کی فطرت ہے، پھر کیونکر دعویٰ کروں کہ اس میں میرا فکر و ذوق آزاد رہا ہے۔

سلسلہ سیرت کے بانی حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو مدت سے خواب میں نہیں دیکھا تھا۔ اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے، تو میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے اس کے بعض اجزا پڑے ہیں اور وہ اس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔ (رحمۃ اللہ علیہ)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے اور ابنائے ملت میں اس آئینہ محمدی کو دیکھ کر اپنی اخلاقی شکل و صورت کی تزئین و آرائش کا ذوق پیدا کرے اور وہ سمجھیں کہ ایمان و عبادت کی درستی کی بڑی عملی نشانی اسلام کی روشنی میں اخلاق و عادات کی درستی ہے۔

طالب رحمت

سید سلیمان ندوی

(۴ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

تعلیمات نبوی ﷺ کا تیسرا باب

اخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیمات نبوی ﷺ کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے، اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لیے مناسب بلکہ ضروری ہے، انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اسی تعلق کے فرض کو بحسن وخوبی انجام دینا اخلاق ہے، اس کے اپنے ماں باپ، اہل وعیال، عزیز و رشتہ دار، دوست واحباب، سب سے تعلقات ہیں، بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلّہ، وطن، قومیت، جنسیت یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اس کے تعلقات ہیں اور ان تعلقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں۔

دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی اور امن وامان اسی اخلاق کی دولت سے ہے، اسی دولت کی کمی کو حکومت و جماعت اپنے طاقت وقوت کے قانون سے پورا کرتی ہے، اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح ازخود انجام دیں، تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو، اس لیے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو سیدھے راستہ سے بھٹکنے نہ دے، دنیا کے سارے مذہبوں نے کم وبیش اسی کی کوشش کی ہے اور دنیا کے آخری مذہب ''اسلام'' نے بھی یہی کیا ہے، آئندہ ابواب میں اسلام کی انہی کوششوں کا جائزہ لینا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے، اس کو تفصیل سے بتانا ہے۔

اسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے سارے مذہبوں کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے، چنانچہ اس عرصۂ ہستی میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے، سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے، انصاف بھلائی اور ظلم برائی ہے، خیرات نیکی اور چوری بدی ہے، لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے، خود آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ)) [1]

''میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔''

یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مؤطا کی روایت ہے، مسند احمد، بیہقی اور ابن سعد وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ)) [2]

''میں تو اسی لیے بھیجا گیا کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں۔''

چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا، ابھی آپ ﷺ مکہ ہی میں تھے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لیے مکہ بھیجا، انہوں نے واپس آ کر اس کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی، وہ یہ تھے:

رَاَيْتُهُ يَاْمُرُ بِمَكَارِمِ الْاَخْلَاقِ۔ [3]

''میں نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔''

حبشہ کی ہجرت کے زمانہ میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی، اس وقت حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

> ''اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست، زیردستوں کو کھا جاتے تھے، اس اثنا میں ایک شخص ہم میں پیدا ہو...... اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔'' [4]

---

[1] مؤطا امام مالك، كتاب حسن الخلق، باب ماجاء فى حسن الخلق: ١٦٧٧؛ كنز العمال، ج٢، ص: ٥ وزرقانى شرح مؤطا، ج٤، ص: ٩٢ مطبع كستليه مصر: ١٢٨٠ هـ۔ [2] سنن الكبرى بيهقى، ١٠/ ١٩٢؛ مسند الشهاب: ١٠٨٠؛ احمد، ٢/ ٣٨١؛ ابن سعد، ١/ ١٩٢۔ نوٹ: احمد اور ابن سعد میں "صالح الاخلاق" کے الفاظ ہیں۔ [3] صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابى ذر: ٦٣٦٢۔

[4] مسند احمد، ج١، ص: ٢٠٢؛ مستدرك حاكم، ج٢، ص: ٣١٠؛ ابن هشام ذكر واقعه هجرت، ج١، ص: ٢٠٦۔

اسی طرح قیصر روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے، آنحضرت ﷺ کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ اللہ کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ ''وہ پاک دامنی اختیار کریں، سچ بولیں اور قرابت کا حق ادا کریں۔'' [1]

قرآن مجید نے جا بجا آنحضرت ﷺ کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ

﴿ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (٦٢/ الجمعة: ٢)

''یہ پیغمبر اُن ان پڑھ جاہلوں کو پاک وصاف کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔''

اس آیت میں دو لفظ فیصلہ کے قابل ہیں، ایک پاک وصاف کرنا، جس کو قرآن پاک نے تزکیہ کہا ہے اور دوسرا حکمت۔

① تزکیہ

کے لفظی معنی پاک وصاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے، یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کر دی جائے، سورۂ والشمس میں ہے:

﴿ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ۝ ﴾ (٩١/ الشمس: ٧-١٠)

''قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا، پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی، بے شبہ جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا وہ ناکام رہا۔''

دوسری جگہ ہے:

﴿ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى ۝ ﴾ (٨٧/ الاعلی: ١٤-١٥)

''بے شبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک وصاف کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔''

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکی کے لفظ سے ادا کیا ہے:

﴿ عَبَسَ وَتَوَلَّى ۝ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى ۝ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى ۝ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرَى ۝ ﴾ (٨٠/ عبس: ١-٤)

''پیغمبر ﷺ نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا، کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنور جاتا، یا وہ سوچتا تو تیرا سمجھانا اس کے کام آتا۔''

[1] صحیح بخاری، کتاب الوحی، باب کیف کان بدء الوحی: ٧ وکتاب الجهاد، باب دعاء النبی ﷺ الی الاسلام: ٢٩٤١۔

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ قرآن پاک میں اس ''تزکیہ'' کا مفہوم کیا ہے، جس کو اس نے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی خاص خصوصیت قرار دیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوس انسانی کو جلا دیں، ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اور ان کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں، چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کئے گئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دوست اور دشمن دونوں آپ ﷺ کی اس خصوصیت کے قائل تھے۔

② حکمت

اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت کا ہے، گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ میں کی جا چکی ہے، مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا ہے کہ حکمت کا لفظ قرآن پاک میں جہاں اس علم و عرفان کے معنی میں ہے، جو نور الٰہی کی صورت میں نبی ﷺ کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے اور جس کے آثار و مظاہر رسول کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و احکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، وہیں اس کا دوسرا اطلاق اس علم و عرفان کے ان عملی آثار و نتائج پر بھی ہوتا ہے، جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے، قرآن میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کونسی باتیں داخل ہیں، سورہ بنی اسرائیل میں توحید، والدین کی اطاعت و تعظیم، قرابت داروں اور محتاجوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل، اولاد کشی، بدکاری، کسی بے گناہ کی جان لینے اور یتیموں کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے ٹھیک ناپنے اور تولنے اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہے، اس کے بعد ارشاد ہے:

﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ ﴾ (۱۷/ الاسراء:۳۹)

''یہ حکمت کی ان باتوں میں ہے جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا۔''

سورۂ لقمان میں ہے کہ

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۲)

''اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں، کہ اللہ کا شکر ادا کر۔''

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی مزید تشریح کی گئی ہے، کہ ''کسی کو اللہ کا شریک نہ بنا، والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ، نماز پڑھا کر، لوگوں کو بھلی بات کرنے کو کہہ اور بری بات سے باز رکھ، مصیبتوں میں استواری اور مضبوطی دکھا، مغرور نہ بن، زمین پر اکڑ کر نہ چل، نیچی آواز میں باتیں کر۔'' ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں ان فطری امور خیر کو بھی جن کا خیر ہونا فطرۃً تمام قوموں اور مذہبوں میں مسلم ہے اور جن کو دوسرے معنی میں اخلاق کہہ سکتے ہیں، ''حکمت'' کہا گیا ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں اخلاق کا مرتبہ اور پایہ، یہ ہے کہ ان کو ''حکمت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور

قرآن پاک کے اس اظہار حقیقت سے کہ وحی محمدی ﷺ کتاب اور حکمت دونوں پر برابر مشتمل ہے، یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے، اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں، خود قرآن پاک نے اس کی تصریح کی ہے، فرمایا:

﴿ يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾

(۲۲/ الحج :۷۷)

''اے ایمان والو! رکوع کرو، سجدہ کرو، اپنے رب کو پوجو اور نیکی کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

گویا ایمان کی روح کے بعد دعوت محمدی ﷺ کے جسم کے دو بازو ہیں، ایک عبادت اور دوسرا اخلاق، ایک خالق کا حق اور دوسرا مخلوق کا اور انہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

حقوقِ عباد کی اہمیت

ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیمِ محمدی ﷺ نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے، اخلاق حقوقِ عباد، یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے اور عبادات حقوق اللہ یعنی اللہ کے فرائض ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہے اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہیں ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے، مگر حقوقِ عباد یعنی باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی اللہ نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے، جن کے حق میں وہ ظلم اور تعدی ہوئی ہو اور ظاہر ہے کہ ان سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہو سکتی، جو اس ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو، تو اس (ظالم بھائی) کو چاہیے کہ اسی دنیا میں وہ اس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کرا لے، ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا، صرف اعمال ہوں گے، ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں، ظالم کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔'' [1] ایک اور حدیث میں ہے کہ ''قیامت میں نامہ اعمال کی تین فردیں ہوں گی، ایک وہ جس کی کوئی پروا اللہ نہ کرے گا، دوسری وہ جس میں سے اللہ ایک حرف کو بھی نہ چھوڑے گا اور تیسری وہ جس میں سے کچھ نہ معاف فرمائے گا، جس فرد کے گناہ معاف نہ ہوں گے وہ شرک ہے اور جس فرد کی کوئی پروا اس کو نہ ہوگی تو وہ ظلم ہے، جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے اللہ کے درمیان ہے، جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو، یا نماز نہ پڑھی ہو، تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس کے اس فرد کے گناہ کو معاف کر دے گا اور بخش دے گا، لیکن وہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہیں سکتا وہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصاص یوم القیامۃ: ۶۵۳۴۔

دوسرے بندہ پر کیا ہے۔'' [1] اس سے معلوم ہوا کہ معاملات انسانی میں جو تجاوز اور ظلم ہوگا، اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے؟ [2] چنانچہ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اس وقت تک بندہ پر عائد نہیں کی ہے، جب تک وہ اپنے اہل وعیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کر لے اور زکوٰۃ بندہ کے اسی مال میں فرض کی ہے، جو اس کے اور اس کے اہل وعیال کے مصارف سے زیادہ ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اس وقت تک بندہ پر واجب نہیں کیا، جب تک وہ بندوں کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہو لے۔

اسلام کے ارکان پنجگانہ اور اخلاق

بعض ان حدیثوں کی بنا پر جن میں اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے، بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاق حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہو گیا ہے، حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے، قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ نمایاں طریقہ سے واضح کر دیا گیا ہے، چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتوں سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے، کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سر تا پا انسانی ہمدری اور غمخواری کا سبق ہے اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں، مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے، اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ احکامِ الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں، وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں اور وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں، قرآن پاک اور تعلیمِ نبوی ﷺ کے جو اشارات اس باب میں ہیں، حضرات صوفیہ نے اپنی تالیفات میں ان کی پوری تشریح کر دی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

''اللہ فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لیے کھڑی کرو اور فرمایا کہ بھولنے والوں میں نہ ہو اور فرمایا کہ نشہ کی حالت میں اس وقت تک نماز نہ پڑھو، جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کتنے نمازی ہیں جنھوں نے گو شراب نہیں پی، مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی ادا کرے جن میں کسی

---

[1] مسند احمد، ج٦، ص: ٢٤٠؛ مستدرك حاكم عن عائشة، ج ٤، ص: ٥٧٥۔

[2] یہ اصول فقہ کا مسئلہ ہے، دیکھو هدایه، کتاب الحج، ص: ٢١٣ مرتبہ مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ۔

دنیاوی چیز کا دھیان نہ آئے تو اللہ اس کے گناہ کو معاف کر دے گا، پھر فرمایا کہ "نماز عاجزی، فروتنی، زاری، دردمندی اور شرمندگی کا نام ہے۔" اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ "اے میرے اللہ!" جس نے یہ بات نہیں پیدا کی، اس کی نماز ناقص ہے اور اگلی کتابوں میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک کی نماز قبول نہیں کرتا، میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں، جو میری بڑائی کے سامنے سرنگوں ہے، میرے بندوں پر اپنی بڑائی نہیں جتاتا اور بھوکے محتاج کو میرے لیے کھانا کھلاتا ہے۔" اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "نماز اسی لیے فرض کی گئی اور اسی لیے حج کے ارکان بنائے گئے، تاکہ اللہ کی یاد کی جائے۔" تو اگر دل میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو جو مقصود ہے، تو اس یادِ الٰہی کی قدر و قیمت کیا ہے؟ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو اللہ سے اور دور کر دیتی ہے۔" [1]

اس اخیر حدیث کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور دوسرے اہلِ تفسیر محدثوں نے اپنی کتابوں میں بسند ذکر کیا ہے اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر (سورۂ عنکبوت) میں ان تمام روایتوں کو یکجا کر دیا ہے، اس حدیث کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں، کہ "جس کو اس کی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھے، اس کی نماز ہی نہیں" [2] اسی قسم کے الفاظ روزوں کے متعلق آپ ﷺ نے فرمائے، ارشاد ہوا کہ "روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کو نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" [3] ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہے۔

اخلاق حسنہ اور ایمان

اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہے کہ ایمان جو کہ مذہب کا اصل الاصول ہے، لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے جس کو کوئی دوسرا جانتا نہیں اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے، اس لیے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاق حسنہ کو قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہلِ ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے، جن پر ان کی کامیابی کا مدار ہے، فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

[1] احیاء العلوم، جلد اول، باب فضیلۃ الخشوع، ص: ۹۵۔ [2] تفسیر ابن کثیر، سورۃ عنکبوت، آیت مذکورہ، ج ۳، ص: ۴۱۴۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب من لم یدع قول الزور: ۱۹۰۳؛ ابوداود، کتاب الصیام، باب الغیبۃ للصائم: ۲۳۶۲؛ جامع ترمذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی التشدید فی الغیبۃ للصائم: ۷۰۷؛ ابن ماجہ، ابواب الصیام، باب ماجاء فی الغیبۃ والرفث: ۱۶۸۹۔

الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۔۹)

''بے شبہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خضوع وخشوع کرتے ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں...... اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔''

ان آیتوں میں اہلِ ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے، ان میں وقار و تمکنت (لغویات سے اعراض) فیاضی (زکوٰۃ) پاکدامنی اور ایفائے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے۔

اخلاق حسنہ اور تقویٰ

اسلام کی اصطلاح میں انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم کی نیکیوں کی محرک ہے، تقویٰ ہے، وحی محمدی ﷺ نے تصریح کردی ہے کہ تقویٰ والے لوگ وہی ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف کرو، بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور مال کی خواہش کے باوجود (یا اللہ کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو، غریبوں کو، مسافر کو، مانگنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوٰۃ دیتا رہا اور جو وعدہ کرکے اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت، تکلیف اور لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں، وہی ہیں جو راستباز ہیں اور یہی تقویٰ والے ہیں۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ راستبازی اور تقویٰ کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے، اسی طرح ان کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف فیاضی، ایفائے عہد اور صبر وثبات وغیرہ بھی ہیں۔

اخلاقِ حسنہ اور اللہ کے نیک بندہ ہونے کا شرف

محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم میں اللہ کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیے گئے، جن کے

اخلاق بھی اچھے ہوں اور وہی باتیں اللہ کے نزدیک ان کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں، چنانچہ سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ اِنَّهَا سَاۗءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ ....

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۶۳-۶۸ و ۷۳-۷۴)

''اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں، جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب نا سمجھ لوگ ان سے بات کریں تو وہ سلام کہیں اور جو اپنے پروردگار کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات گزارتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب دور کر، کہ اس کا عذاب بڑا تاوان ہے اور جہنم برا ٹھکانا اور مقام ہے اور جو خرچ جب کرتے ہیں، تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں، بلکہ ان دونوں کے بیچ سے وہ سیدھے گزریں اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور اللہ کو نہیں پکارتے اور جو کسی جان کا بے گناہ خون نہیں کرتے، جس کو اللہ نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے ہیں، کہ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا......اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب کسی لغو بات پر سے گزرتے ہیں تو سنجیدگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں اور جب اللہ کی نشانیاں ان کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑیں اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔''

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت میں عفو و درگزر و میانہ روی اور قتل و خونریزی اور بدکاری نہ کرنا اور مکر و زور میں شریک نہ ہونا وغیرہ، اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہیں۔

اہلِ ایمان کے اخلاقی اوصاف

وہ لوگ جو اللہ کے پیارے اور مقبول بندے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانی ان کے اخلاق اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں:

﴿ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ ﴾

(٤٢/ الشوریٰ:٣٦-٤٣)

''اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور انکے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں اور ہم نے ان کو جو دیا ہے، اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں اور جب ان پر چڑھائی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، تو جو کوئی معاف کردے اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں، ملامت تو ان پر ہے جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں، ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے اور بے شبہ جو (مظلوم ہونے پر بھی) ظالم کو معاف کردے اور سہہ لے تو یہ ہمت کے کام ہیں۔''

﴿ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ (٣/ آل عمران:١٣٣-١٣٤)

''جنت ان پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے، جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں اور جو غصہ کو دباتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ۝ ﴾ (٢٨/ قصص:٥٤-٥٥)

''یہ وہ ہیں جن کو دوہرا ثواب ملے گا۔ اس لیے کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے اس سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جب کوئی

بیہودہ بات سنتے ہیں، تو اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارا عمل اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے، تم سلامت رہو، ہم ناسمجھوں کو نہیں چاہتے۔''

﴿ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ﴾ (۷٦/ الدھر:۸)

''اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے، مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔''

ان آیتوں کی اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی جو تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی، وہ احادیث میں محفوظ ہے، ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے یہاں لکھتے ہیں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ ﷺ کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے؟

اخلاق حسنہ کا درجہ اسلام میں

اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز میں جو دعا مانگتے تھے، اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا:

((واهدنی لأحسن الاخلاق لا یهدی لأحسنها الاّ انت واصرف عنی سيّئاتها لا یصرف عنی سيّئاتها الاّ انت)) [1]

''اور اے میرے اللہ! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی راہنمائی کر، تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو کوئی نہیں پھیر سکتا، لیکن تو۔''

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہِ الٰہی سے جو چیز مانگتا ہے، وہ حسن اخلاق ہے۔

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں، لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے، فرمایا:

((اکمل المؤمنين ایماناً أحسنهم خلقًا)) [2]

''مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔''

یہ حدیث ترمذی، ابن حنبل، ابوداود، حاکم اور ابن حبان میں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے وہ حسن اخلاق ہے، کہ یہی وہ پھل ہے، جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔

اسلام میں نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے، لیکن اخلاق حسنہ کو بھی ان کی قائم مقامی کا شرف

---

[1] صحیح مسلم، کتاب صلوة المسافرین، باب صلوة النبی ﷺ ودعاءه باللیل: ۱۸۱۲۔

[2] ابوداود، كتاب السنة، باب الدليل على زيادة الايمان ونقصانه: ٤٦٨٢؛ جامع ترمذی، ابواب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها: ١١٦٢؛ مسند أحمد، ج٢، ص: ٢٥٠؛ صحیح ابن حبان: ٤٧٩۔

کبھی کبھی حاصل ہو جاتا ہے، ارشاد ہوا:

((ان الرجل لیدرك بحسن خلق درجة قائم اللیل و صائم النهار))

''انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔'' [1]

یہ حدیث چند ہم معنی لفظوں کے الٹ پھیر سے ابوداؤد، ابن حنبل، حاکم، ابن حبان اور طبرانی میں ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازوں میں رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزوں میں دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہو سکتا ہے، وہی درجہ حسنِ خلق سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، حسنِ اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے۔

اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے، فرمایا:

((خیارکم احسنکم اخلاقاً)) [2]

''تم میں سب سے اچھا وہ ہے، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

((مامن شيء یوضع في المیزان اثقل من حسن الخلق فان صاحب حسن الخلق لیبلغ به درجة صاحب الصوم و الصلوٰة)) [3]

''(قیامت کی) ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی، کہ حسن اخلاق والا، اپنے حسن خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔''

یہ حدیث ترمذی میں انہی الفاظ کے ساتھ ہے، لیکن حدیث کی دوسری کتابوں (حاکم، ابن حبان، ابن حنبل، ابوداؤد) میں مختصراً صرف پہلا ٹکڑا ہے، یعنی یہ کہ ''حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو میں نہیں۔'' [4] اس حدیث نبوی ﷺ نے پوری طرح واضح کر دیا کہ اسلام کی میزان میں حسن اخلاق سے زیادہ گراں کوئی چیز نہیں، ایک اور حدیث میں ہے کہ بندہ کو اللہ کی طرف سے جو کچھ ملا ہے، اس میں حسنِ اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے:

((خیر ما اعطی الناس خلق حسن))

''لوگوں کو قدرت الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔''

---

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب فی حسن الخلق:٤٧٩٨؛ صحیح ابن حبان:٤٨٠؛ مستدرك حاكم، ١/ ٦٠۔

[2] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب صفة النبی ﷺ: ٣٥٥٩؛ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب کثرة حیائه: ٦٠٣٣؛ مسند أحمد، ج٢، ص:١٦١۔ [3] جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی حسن الخلق:٢٠٠٣۔ [4] ابو داود، کتاب الادب، باب فی حسن الخلق: ٤٧٩٩؛ مسند احمد، ٦/ ٤٤٢؛ مسند عبد بن حمید: ٢٠٤؛ صحیح ابن حبان: ٤٨١۔

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم، نسائی، ابن ماجہ، ابن حنبل، طبرانی اور ابن ابی شیبہ میں ہے۔ ❶
اس بشارت نے اخلاقِ حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتوں سے بالاتر بنا دیا، ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((احب عباداللّٰہ الی اللّٰہ احسنهم اخلاقًا)) ❷

''اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حسن خلق اللہ کی محبت کا ذریعہ ہے اور درحقیقت رسول کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے، فرمایا:

((ان احبّکم الیّ واقربکم منی فی الأخرة مجالس محاسنکم اخلاقًا وان ابغضکم الیّ وابعدکم منی فی الأخرة مساویکم اخلاقا)) ❸

''تم میں میرا سب سے پیارا اور نشست میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بداخلاق ہیں۔''

آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں ایک صحابی کی دو بیویاں تھیں، ایک رات بھر نماز پڑھتیں، دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں، مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کی ناک میں دم کیے رکھتی تھیں، دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں، مگر کسی کو تکلیف نہ دیتیں، آنحضرت ﷺ سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا، تو آپ ﷺ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ ''اس میں کوئی نیکی نہیں، وہ اپنی اس بدخلقی کی سزا بھگتے گی۔'' اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ ''وہ جنتی ہوگی۔'' ❹ ان دونوں بیویوں کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی زبانِ فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں، وہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک بدوی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھایئے جو مجھے جنت کو لے جائے، فرمایا: ''انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ، اگر تو یہ نہ کر سکے، تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا اور نیکی بتا اور برائی سے روک، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک۔'' ❺ غور کیجیے کہ یہ حدیث

❶ ابن ماجه، ابواب الطب، باب ما انزل الله ...: ٣٤٣٦؛ نسائی، الكبرى: ٧٥١٢؛ مستدرك حاكم، ٤/ ٣٩٩؛ احمد، ٤/ ٢٧٨؛ صحيح ابن حبان: ٦٠٢٩۔ ❷ معجم الكبير للطبرانی: ٤٧١۔
❸ صحيح ابن حبان: ٤٨٢؛ مسند أحمد، ج ٤، ص: ١٩٣ نیز الفاظ کے اختلاف کے ساتھ اس مفہوم کی روایت جامع ترمذی، كتاب البر والصلة: ٢٠١٨ میں بھی ہے۔نوٹ: یہ تمام حدیثیں کنز العمال، ج ٢، کتاب الاخلاق باب اوّل سے ماخوذ ہیں۔ ❹ ادب المفرد، امام بخاری، باب لا یوذی جاره: ١١٩۔
❺ مشكل الآثار امام طحاوی، ج ٤، ص: ٢، حيدر آباد دكن۔

اخلاقی عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے۔

ایمان کے اوصاف ولوازم

ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوصاف واخلاق، ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہیں، جس قدر ان لوازم اور خصوصیات میں زیادتی اور کمی ہوگی، گویا اسی قدر اس ایمان کے منشا میں زیادتی وکمی ہوگی، یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق، ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں، ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیرِ دامن ہے، جس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا:

① ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک حیا ہے۔ [1]

② ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دو، (تاکہ تمہارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو) [2]

③ جس میں تین باتیں ہوں، اس نے ایمان کا مزہ پایا، جس کو اللہ اور اس کا رسول سب سے پیارا ہو، جو دوسرے سے صرف اللہ کے لیے پیار کرے اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں پڑنے سے۔ [3]

④ جس میں یہ تین باتیں ہوں، اس نے ایمان کا مزہ پایا، حق بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا، مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ہٹ نہیں سکتا تھا۔

⑤ تین باتیں ایمان کا جزو ہیں، مفلسی میں بھی اللہ کی راہ میں دینا، دنیا میں امن اور سلامتی پھیلانا اور خود اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا۔ [4]

⑥ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا ہے، جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔ [5]

⑦ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان ومال اس کی امانت میں دے دیں۔ [6]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب امور الایمان:۹؛ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان:۱۵۲۔ [2] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان:۱۵۳۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حلاوۃ الایمان:۱۶؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال..... :۱۶۵۔ [4] کنز العمال:۸۸، ۸۹۔

[5] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیہ.....:۱۳۔

[6] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون:۱۰۔

⑧ ایک شخص آ کر پوچھتا ہے کہ یا رسول اللہ ﷺ! کونسا اسلام سب سے بہتر ہے؟ فرمایا: ”(بھوکوں کو) کھانا کھلانا اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا۔“ (سلام کرنا) ❶

⑨ ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے اللہ کے رسول! اسلام کیا ہے، فرمایا: ”اچھی بات بولنا اور کھانا کھلانا۔“ پھر پوچھا: ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ”صبر کرنا اور اخلاقی جوانمردی دکھانا“ (سماحت)

⑩ مومن وہ ہے جو دوسروں سے الفت کرتا ہے اور جو نہ دوسرے سے الفت کرتا اور نہ کوئی اس سے الفت کرتا ہے، اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

⑪ مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے، نہ کسی کو بددعا دیتا ہے، نہ گالی دیتا ہے اور نہ بدزبان ہوتا ہے۔ ❷

⑫ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر وہ ظلم کرے اور نہ اس کو گالی دے، جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہوگا، اللہ اس کی مدد میں ہوگا، جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا، تو اللہ اس کی مصیبت دور فرمائے گا۔ ❸

⑬ مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں، مسلم وہ ہیں، جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں، مہاجر وہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی اس وقت تک جنت میں نہیں جاسکتا، جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصہ سے محفوظ نہ رہا ہو۔ ❹

⑭ جو صاحب ایمان ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ ❺

⑮ بے ایمان (منافق) کی نشانیاں تین ہیں، بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف کرے، اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔ ❻

ان مذکورہ بالا حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہیے، کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے۔

اخلاق حسنہ، صفات الٰہی کا سایہ ہیں

لیکن اسلام نے اخلاقِ حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاق حسنہ درحقیقت صفات الٰہی کا سایہ اور ظل ہیں اور اسی کی صفات کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہیں، حدیث میں ہے کہ

❶ بخاری، کتاب الایمان، باب اطعام الطعام : ١٢؛ مسلم، کتاب الایمان: ١٦٠۔

❷ ادب المفرد: ٣١٢۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب لا یظلم المسلم المسلم: ٢٤٤٢۔

❹ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تحریم ایذاء الجار: ١٧٢۔ ❺ صحیح مسلم، باب الحث علی اکرام الجار و الضیف: ١٧٣۔ ❻ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ٣٣؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ٢١١ یہ تمام حدیثیں معتبر و مستند کتب حدیث کی کتاب الایمان میں موجود ہیں، ہم نے ان کو مجمع الفوائد، ص: ٢٠ تا ٢٢ وما بعد اور کنز العمال، جلد اول، کتاب الایمان، ص: ٦ تا ١١ سے لیا ہے، کنز العمال میں ہر قسم کی حدیثیں ہیں مگر ہم نے ان کے انتخاب میں مشہور و معتبر حدیثوں کو ترجیح دی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

((حسن الخلق خلق الله الاعظم)) [1]

(طبرانی) یعنی ''خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلقِ عظیم ہے۔''

ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں، جو صفات ربانی کا عکس ہیں اور انہی کو برا کہتے ہیں جو اللہ کی صفات کے منافی ہیں، البتہ یہ ظاہر ہے کہ اللہ کی بعض خاص صفتیں ایسی بھی ہیں، جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جا سکتا، جیسے اس کا واحد ہونا، خالق ہونا، نیز بعض ایسی پر جلال صفتیں بھی ہیں جو صرف اللہ ہی کو زیبا ہیں، جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ، اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے، کہ ان کی مقابل کی صفتیں اس میں پیدا ہوں، اللہ کی کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں خاکساری اور تواضع ہو اور اللہ کی بلندی کے مقابلہ میں بندہ میں پستی اور فروتنی ہو، الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لیے قرار دیا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہی کے انوار کے کسب وفیض کا سبب ہے، ہم جس حد تک اس کسب وفیض میں ترقی کریں گے، ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے، [2] اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں۔

---

[1] طبرانی فی الاوسط: ۸۳٤٤۔ [2] ہم نے اسمائے الٰہی کی بحث میں اس اجمال کی پوری تفصیل بیان کر دی ہے۔ دیکھو سیرت جلد چہارم طبع اول صفحات ۳۸۴، ۴۰۵۔ [وطبع ہذا ۲۰۱۲ء ج ۴، ص: ۳۳۴ تا ۳۵۱]

اخلاقی مُعلّموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز

دنیا میں اخلاق کے بڑے بڑے معلم پیدا ہوئے، جن کے مکتب میں آ کر بڑی بڑی قوموں نے ادب کا زانو تہ کیا اور آداب واخلاق کے وہ سبق اس سے حاصل کئے جو سینکڑوں اور ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی اب تک ان کو یاد ہیں اور سچ یہ ہے کہ آج جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کا کوئی نمونہ ہے، وہ انہی کے صحیفۂ تعلیم کا ایک ورق ہے، مگر ایک تنقیدی نظریہ بتا دے گی کہ ان اخلاقی استادوں میں باہمی نسبت کیا ہے؟ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولوں پر مبنی ہے اور ان میں درسگاہ عالم کے سب سے آخری معلم ﷺ کو کیا امتیاز حاصل ہے۔ آنحضرت ﷺ سے پہلے نوعِ انسانی کے اخلاقی معلّمین کی دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی اخروی مذہب پر رکھی، جیسے عام انبیا علیہم السلام بعض مذہبوں کے بانی، دوسری وہ ہے، جس نے اپنے فلسفہ وحکمت اور عقل و دانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی، ہم ان میں سے اول کو انبیا اور مصلحینِ دین اور دوسری کو حکما کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں، ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس وتعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کیے، پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیمات کا ماخذ ''حکم خداوندی'' کو قرار دیا، اس حکم وفرمان الٰہی کے سوا ان کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہیں، نہ ان کی تعلیمات میں علت و معلول کا سلسلہ ہے، نہ اخلاق کے دقیق نکتوں کی گرہ کشائی ہے اور نہ ان احکام وتعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں اور عقلی حکمتوں کی تصریح ہے، دوسرے فریق کی تعلیمات میں علت ومعلول کی تحقیق، نفسیاتی خواص کی بحث، اخلاق کی غرض وغایت کی تعیین، قوائے عملی کی تحدید، یہ سب کچھ ہے، مگر بحث ونظر سے آگے عمل کا درجہ صفر محض ہے، اگر ہے تو بے کیف اور بے لذت مگر

ع یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکم خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمان الٰہی اور اخلاقی نکتہ وری، امر ربانی اور حکمِ فطرت، کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔ انبیا اور حکما میں جو اصلی فرق اور امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیا کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کی معصوم زندگی اور ان کے مقدس کارنامے اور ان کے پاک اثرات ہوتے ہیں، جن کا فیض ان کے ہر بن مو سے خیر وبرکت کی سلسبیل بن کر نکلتا ہے اور پیاسوں کو سیراب کرتا ہے، لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز فلسفی جس کی اخلاقی سخن طرازی اور نکتہ پروری سے دنیا محوِ حیرت ہے اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ، باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا ہے، عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک انچ بلند نہ ہوگی، وہ گو دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے، مگر خود تاریکی سے باہر نہیں آتا، وہ دوسروں کی راہنمائی کا مدعی بنتا ہے، مگر خود عمل کی ہر راہ میں بھٹکتا پھرتا ہے، وہ رحم و محبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے، مگر غریبوں پر رحم کھانا اور دشمنوں سے محبت کرنا وہ نہیں

جانتا، وہ سچائی اور راستبازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے، مگر وہ خود سچا اور راستباز نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے، دل اور ہاتھ نہیں، اس لیے اس کے منہ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہیں بناتی، بلکہ ہوا کے تموج میں مل کر بے نشان ہو جاتی ہے اور انبیا علیہم السلام چونکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں، جوان کی تعلیم ہے، وہی ان کا عمل ہے، جوان کے منہ پر ہے وہی دل میں ہے، اس لیے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اڑتا اور ہم نشینوں کو معطر بنا دیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیا اور حکما، یعنی موسیٰ، عیسیٰ، محمد رسول اللہ علیہم السلام، سقراط، افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہے، سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا، مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں، جو موسیٰ، عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر پہنچیں اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کی کوئی کرن ہے، وہ نبوت ہی کے کسی مطلع انوار سے چھن کر نکل رہی ہے۔ مگر اس وصف میں سارے انبیا علیہم السلام یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان کے مختلف مدارج ہیں، ان کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے کہ ان کے اس درجہ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہو، تاکہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق اور اہلِ صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں اور پھر وہ روایتوں کے اوراق میں محفوظ رہیں، تاکہ بعد کے آنے والے بھی اس نشان قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں، الغرض ایک کامل و مکمل اور آخری معلم کے لیے حسب ذیل معیاروں پر پورا اترنا نہایت ضروری ہے۔

① اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔

② اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔

③ اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کار آمد گروہ کے لیے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

بے پردہ زندگی

تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیا اور مذہبوں کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات پاک کے برابر جامع کمالات نہیں، دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانی مذہب ایسا نہیں ہے، جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے، توراۃ کے پیغمبروں میں سے کون سا پیغمبر ہے، جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم میں ہیں، ان غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے، جن کو توراۃ کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے اور قرآن نے ہر جگہ ان کو ان بیہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے، حضرت نوح علیہ السلام

سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک توراۃ کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ، ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں تمہارے سامنے ہیں اور کیا ان کی اخلاقی شکل وصورت کی پوری شبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تینتیس (۳۳) برس کی زندگی میں سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسوں کے حالات میں سے بھی معجزات وخوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے، ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں؟

ان انبیا علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان، ایران اور چین کے بانیانِ مذاہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لیے دنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں، کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے، صرف اسلام ہی کے ایک معلم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کہ ''یہاں (سیرت محمدی) پورے دن کی روشنی ہے، جس میں محمد ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو روز روشن کی طرح نمایاں ہے'' [1] آنحضرت ﷺ کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ، محرمان راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو، اس کو جلوت میں برملا بیان کرو، جو حجرہ میں کہتے سنو اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکارو، ((الا فلیبلغ الشاهد الغائب)) [2]

قول کے ساتھ عمل

اب دوسری حیثیت سے غور کیجیے ان مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی، اخلاقی احکام کی خوبی اور مواعظ ونصائح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں، لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہ زیتون کے پرتاثیر واعظ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی معصومانہ باتیں، سچائی اور راستبازی کی نصیحتیں اور لفظی صنائع وبدائع اور دلکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں دنیا نے سنیں اور ان کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام ودہن میں ہے، مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''سب کچھ جو تمہارے پاس ہے، جب تک اس کو اللہ کی راہ میں لٹا نہ دو، آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگے۔'' [3] کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''شریروں کا مقابلہ نہ کرو'' کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''دشمنوں کو بھی پیار کرو۔'' [4] کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان ومال سے پیار کر۔'' کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کردو۔'' [5] کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''تم سے اگر کوئی تمہارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کردو۔'' [6]

---

[1] باسورتھ اسمتھ کی کتاب سیرت محمد ﷺ ص:۱۰۸۔ [2] صحیح بخاری، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ رب مبلغ: ٦٧۔ [3] انجیل، متی باب، ۱۹، ۲۳۔ [4] انجیل متی باب: ٥ـ٤٤ ولوقا باب٦، ٢٧۔
[5] متی باب، ٥۔ ٣٩۔ [6] ایضاً ٤١۔

کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیح علیہ السلام میں یہ صفتیں موجود نہ تھیں، بلکہ یہ کہنا ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا، اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا، اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا، کہ ﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ: ٤٤) ''کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔'' اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ ﴿ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ ﴾ (٦١/ الصف: ٢-٣) ''تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو۔''

ایک شخص نے آ کرام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا: ''کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ کان خُلُقُهُ القران۔''[1] جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے، وہی حامل قرآن کی سیرت میں بصورت عمل تھا، اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد واعانت کا حکم دیا، تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا، اگر آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا، کھانے میں زہر دینے والوں سے درگزر کیا، اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا، جنہوں نے آپ ﷺ پر تیر برسائے اور تلواریں چلائیں، مسلح ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا، کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت میں بھی جس نے آپ سے کپڑا مانگا، خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی، سیرت کی دوسری جلد میں یہ واقعات پوری شرح وتفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں، الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور راہنماؤں کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال ونصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، دنیا کے کسی پیغمبر اور بانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہمعصروں کے سامنے پیش نہیں کیا، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف وخطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد وتبصرہ کے لیے پیش کیا۔ فرمایا:

﴿ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝ ﴾ (۱۰/ یونس: ١٦)

''(اے منکرو!) میں تو تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہوں، کیا تم نہیں سمجھتے۔''

[1] ابوداود، كتاب التطوع، باب فى صلوة الليل: ١٣٤٢؛ صحيح ابن حبان، كتاب الصلاة، باب فى قيام الليل: ٢٥٤٢۔

پھر آپ ﷺ کو خطاب کر کے خود آپ سے فرمایا:

﴿ وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝ ﴾ (٦٨/ القلم:٤)

''(اے محمد ﷺ!) بیشک آپ تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو۔''

کامل و مکمل

اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے، یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک وصاف کر دیتا ہو، اخلاق کے سارے معلّموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے، کیا اس میں جن کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے، یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا:

﴿ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (٦٢/ الجمعة:٢)

''وہ ان کو اللہ کی باتیں سناتا اور ان کو پاک وصاف بناتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔''

اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے، کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا اور اللہ کے احکام سناتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض واثر سے پاک وصاف ومصفا بنا بھی دیتا ہے، وہ ناقصوں کو کامل، گناہگاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے، چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا، تیئس برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوج کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

تعلیمِ اخلاق کا تنوع

اگر کسی معلّم میں تکمیل کی یہ تاثیر ہو، پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم ونسق کے لیے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں، بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے، اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب میں عفو ودرگزر کے سوا کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے وہار اور خانقاہ میں دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی درسگاہِ اعظم میں آ کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے، جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشو ونما پا رہی ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے، جس

کے اندر علم وفن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسبِ کمال کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد و عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آ کر زانوئے ادب تہ کرتے ہیں اور اپنے اپنے پیشہ وفن کے مطابق آپ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں، مدینۃ النبی ﷺ کی اس درسگاہ اعظم کو غور سے دیکھو، جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے اور جس کا نام مسجد نبوی ﷺ تھا، اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں، کہیں ابوبکر و عمر عثمان و علی رضی اللہ عنہم جیسے فرمانروا زیر تعلیم ہیں، کہیں طلحہ و زبیر و معاویہ و سعد بن معاذ و سعد بن زبیر رضی اللہ عنہم جیسے ارباب رائے و تدبیر ہیں، کہیں خالد ابوعبیدہ، سعد بن وقاص اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم جیسے سپہ سالار ہیں، کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے، کہیں ان زہاد و عباد کا مجمع ہے، جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں، کہیں ابوذر وسلمان و ابودرداء رضی اللہ عنہم جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو ''مسیح اسلام'' کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لا کر بیچتے اور گزارہ کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم جیسے فقیہ و محدث تھے، جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے، تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے، کہیں غریبوں کی نشست ہے اور کہیں دولتمندوں کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا ہے اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینہ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔ [1]

[1] اس موقع پر مدراس والے میرے چھ خطبوں پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

اسلام کا فلسفہ اخلاق

ان اصولوں کی تفصیل وتشریح کے لیے ہم کو تھوڑی دیر کے لیے فلسفہ اخلاق کے کانٹوں میں الجھنا ہوگا، اخلاق کا وجود تو یقیناً اس وقت سے ہے، جب سے انسان کی زندگی اور اس کے ذہنی و جسمانی اعمال کا وجود ہے، مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث، ان کے اسباب وعلل کی تلاش، ان کے اصول وقوانین کی تحقیق اور ان کی غرض و غایت کی تعیین، یونانیوں کے عہد میں شروع ہوئی اور موجودہ عہد میں علم نفسیات کے زیر سایہ پرانے نظریوں پر نظر ثانی کی گئی، ان اسباب وعلل، اصول وقوانین اور غرض وغایت کی تحقیق میں شروع سے آج تک فلسفیوں میں قدم قدم پر اختلافات رونما ہوئے، ہر سوال کے جواب میں متعدد نظریے بنتے اور بگڑتے رہے اور نئے نئے فرقے اور اسکول پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے، تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہیں تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب انہی دو قدیم مسلکوں کی تشریح ہیں، جنھیں یونانی اصطلاح میں ''رواقیہ'' اور ''لذتیہ'' کہا گیا ہے، موجودہ اصطلاح میں پہلے کو ''ضمیریہ'' اور دوسرے کو ''افادیہ'' کہہ لیجئے، یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے یوں کہیے، پہلا فریق اخلاق کی بنا ''جذبات'' پر قرار دیتا ہے اور دوسرا ''عقل'' پر، پھر اس منشائے اختلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہو گئے، ارسطو اور اس کے متبعین نے اخلاق کا مبنیٰ نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے۔

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل مآخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہیں، علمائے اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون، اللہ کا قانون، فطرت کا قانون، حاسۂ اخلاق کی آواز، ضمیر کا قانون، وجدانیت اور پھر بالآخر عقل کا قانون، کہہ کر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے، لیکن درحقیقت ان کی بھی دو ہی اصلی تقسیمیں ہیں، یعنی یہ کہ یہ قوانینِ اخلاق کسی وحی والہام سے ماخوذ ہیں، یا کسی بیرونی ماخذ سے، جو لوگ وحی و الہام پر ایمان نہ لا سکے، انھوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی ماخذ قرار دینا چاہا، پھر کسی نے اس بیرونی ماخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا اور کسی نے اس سے باہر، جنھوں نے خود انسان کے اندر تلاش کیا، انھوں نے بہ اختلاف مذاق انسان کی اصل فطرت کو انسان میں ایک خاص حاسۂ اخلاقی کو، انسان کے وجدان کو، انسان میں ضمیر کو اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا ماخذ قرار دیا، جنہوں نے انسان سے باہر ڈھونڈا، انھوں نے قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کے حکم اور سوسائٹی کے رسم ورواج کو ان کا ماخذ قرار دیا، مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کا حکم، یا بادشاہ کا حکم، یا سوسائٹی کے رسم ورواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی؟ اس لیے لامحالہ اس بیرونی ماخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی ماخذ کو اصل مبنیٰ قرار دینا ہوگا، ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے، مصنوعی اور ساختہ وپرداختہ بتانا پڑے گا، جو اخلاق کے امہاتِ مسائل میں کبھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو اخلاق کا ماخذ اللہ کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو، لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا

ہے کہ اللہ نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان بھی کیا ہے اور اپنے بندوں کی فطرت میں ودیعت بھی رکھا ہے، تاکہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکامِ الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کر دے، فلسفیانہ کاوشوں اور موشگافیوں کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہیں کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہوسکیں، ہوسکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا ماخذ اللہ کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی ماخذ اور محرکات، ضمیر، فطرت، وجدان اور عقل سب ہوں، اسی طرح معیار اخلاق کے اختلافات میں بھی توافق ممکن ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض وغایت کو خیال میں لائے ہوئے، محض اپنی فطرت کے اصرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے، یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے، یا اس کے ساتھ کسی مصلحت عامہ کی افادی حیثیت بھی اس میں ملحوظ ہو اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو، اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب جہتیں ایک کام میں مجتمع ہوسکتی ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد، اللہ کا حکم بھی ہے اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے، ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے، جس طرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے، ساتھ ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے ایسے مواقع بھی ہو سکتے ہیں، جہاں خدا، ضمیر، فطرت، جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جارہی ہو، اسی لیے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قویٰ کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے، اصلاح کے لائق ہے۔

الغرض اللہ کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے، اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہیے، وجدان کہیے، حاسۂ اخلاقی کہیے، ضمیر کہیے، اس فلسفیانہ تشقیق سے اس کو بحث نہیں اور باوجود اس کے وہ ان کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر بھی مبنی سمجھتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے، کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں، جن کی اچھائی یا برائی پر آب وہوا، خصوصیاتِ اقلیم، زبان، مذہب، رسم ورواج، طرزِ حکومت وغیرہ، صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومیں بلا دلیل متفق اور متحد ہیں، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرۃً ودیعت ہے، جس طرح دوسرے قویٰ اور حواس ودیعت ہیں، اب یہ کاوش کہ جس طرح مرئیات، مسموعات اور ملموسات وغیرہ کے لیے ہمارے اندر باصرہ، سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ حاسے ہیں، اسی طرح اخلاقی تمیز کے لیے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے، جس سے ہم اخلاق کی اچھائی اور برائی کا احساس اور تمیز کرتے ہیں، یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے، جس کے ذریعہ سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہیں، جس طرح

ہم دوسرے وجدانیات جیسے حسن و قبح، خوبصورتی اور بدصورتی کا، یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے جو ہم کو بروقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا برا، عملی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ تعلیم محمدی ﷺ نے گو اخلاق کے ان اصول و مبانی کی طرف کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی اشارات کیے ہیں، مگر اس نے اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے کہ اخلاق کی خوبی ان کے علم و فلسفہ میں نہیں، بلکہ ان کے عمل میں ہے، اس لیے ''علم بلا عمل'' کی کوئی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں نہیں، لیکن اسی کے ساتھ ''عمل بلا علم'' کو بھی اس نے پسندیدہ نہیں سمجھا ہے، اسی بنا پر اس نے ان اصولوں کی طرف اشارے تو کیے ہیں، مگر اخلاق کے باب میں ان کی عالمانہ تحقیق و تلاش کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کیے جائیں کہ یہ اللہ کے احکام ہیں، وہ اللہ کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہیں، انہی احکام الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر، وجدان، اخلاقی حاسہ اور عقل میں سے جس ایک کو یا سب کو اصل کہیے ہونا چاہیے، ان میں باہم جس حد تک باہمی مطابقت و موافقت زیادہ ہوگی، اسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس حد تک ان میں کمی ہوگی اسی حد تک اس کے کمال میں نقص ہوگا۔ ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ اللہ کا حکم ہے، پھر کرنے والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہیے، اس کا وجدان بھی یہی ہو، اس کو وہ اپنا فرض بھی جانے، اس کے کرنے میں وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرے اور اسی کی پیروی میں نوع انسان کی کثیر جماعت کا فائدہ بھی سمجھے، الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قویٰ میں اس بارہ میں باہم موافقت اور یکسانی ہو گی، اتنا ہی اس کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس قدر اس توفیق میں کمی ہوگی کہ اللہ کا حکم سمجھ کر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو، یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے، یا اس سے اس کو روحانی مسرت اور انبساط پیدا نہ ہو، اسی قدر اس کے روحانی و ایمانی کمال میں نقص پیدا ہے، کتنا ہی نیک کام ہم اللہ کا حکم سمجھ کر انجام دیں، لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہیں سمجھتا اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم کو راہ سمجھاتی ہے، تو اس کے یہ صاف معنی ہیں کہ ابھی تک اس کے اللہ کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہیں ہوا ہے، جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل کا نقص ہے، اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجدان یا حصولِ مسرت یا افادہ عام کی غرض سے انجام دے، مگر اللہ کے حکم کی حیثیت اس میں ملحوظ نہ رکھے، تو وہ کام بھی اسلام کی نظر میں ثواب اور تزکیہ روح کا ذریعہ نہیں۔

بے غرضی

چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے، اس لیے اس کی غرض و غایت بھی ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیے، اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی

نیکی اور ثواب نہیں اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی، مذہبی کاموں کو چھوڑ کر، دنیاوی کاموں پر بھی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے کام میں جس قدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے، اسی قدر وہ قابل قدر رہتا ہے، ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کریں اور اس کے سامنے کتنے ہی الوان نعمت چن دیں، لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطر داری کی تہ میں ذاتی نفع، یا ریاکاری یا نمائش یا خوشامد یا کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے، تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم وتکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتی ہے، لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نان ونمک ہی رکھ دیں، تو اس کی وقعت اور قدر و قیمت کی کوئی انتہا نہ رہے گی، تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدم اخلاص کے یہ اثرات ہیں، تو روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہوں گے۔

نیت

اسی لیے آنحضرت نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض و غایت کو ہر اچھے اور برے کام کی بنیاد قرار دیا ہے، بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا برا نہیں ہوتا، جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے، ایک دو مثالوں سے یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی، ایک شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی میں اپنے گھر اس لیے بلایا کہ اس کو یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اس کو مار ڈالیں گے، یا سخت تکلیف پہنچائیں گے، اتفاق یہ کہ وہ اندھیرے میں بھٹک کر دوسرے راستہ پر جا پڑا اور وہاں اس کو اشرفیوں کی تھیلی راستہ میں پڑی ملی، تو گو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو، مگر اس بلانے والے کی نیت کی برائی میں اب بھی کوئی شک نہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رات کو اندھیرے میں بلوا کر اس پر احسان کیا، لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے میں درحقیقت اس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے اس کو بلوایا، لیکن اتفاق سے وہ راستہ میں کسی گڑھے یا کنویں میں گر کر مر گیا، تو وہ بلانے والا بدی کے گناہ کا مرتکب نہ ہوگا، کہ گو جانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا، مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بری نہ تھی۔

ایک دوسری مثال فرض کیجئے، میری جیب میں روپیوں کا ایک بٹوا تھا، اتفاق سے وہ راستہ میں گر گیا جب میں راستہ سے واپس پلٹا، تو ایک بٹوا پڑا دیکھا اور دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے، چپکے سے اٹھا لیا، تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے میں کسی برائی کا مرتکب نہیں ہوا، مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے برائی کر چکا، لیکن فرض کیجئے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوا مجھ کو سڑک پر پڑا ملا اور میں نے اس کو اپنا سمجھ کر اٹھا لیا، تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو، پھر بھی میرا دامن گناہ کی برائی سے پاک ہے، راستہ میں کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے، اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی بری نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا،

مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی، یا اس نے کسی غیرعورت کی طرف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا، تو پہلی صورت میں اس کا دل گناہگار ہو چکا اور دوسری صورت میں اس کی بے گناہی بالکل ظاہر ہے، نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے، لیکن اگر وہ بھی فخر، نمائش، ریا اور دکھاوے کی خاطر کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا، اسی طرح آپ اگر کسی معذور کی امداد اس لیے کریں کہ لوگ آپ کی تعریف کریں گے، تو اسلام کی نگاہ میں یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا، سورۂ آل عمران میں ہے:

﴿ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ﴾

(۳/ آل عمران:۱٤٥)

''اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے، جو آخرت کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے۔''

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جس کام کا مقصد صرف نمائش اور دکھاوا ہو اسکی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں، فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ﴾ (۲/ البقرۃ:۲٦٤)

''اے ایمان والو! تم اپنی خیراتوں کو احسان دھر کر اور ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔''

اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، جن کی تفسیر میں آنحضرت نے یہ مختصر لیکن جامع و مانع الفاظ فرمائے ہیں:

((انما الاعمال بالنیات)) ❶

''انسان کے اعمال اس کی نیت پر موقوف ہیں۔''

اور اس کی مزید تصریح کے لیے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

((ولکل امری مانوی فمن کانت ھجرته الی اللّٰہ ورسوله فھجرته الی اللّٰہ ورسوله و من کانت ھجرته الٰی دنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا فھجرته الٰی ما ھاجر الیه)) ❷

''ہر شخص کے لیے وہی ہے، جس کی وہ نیت کرے، تو جس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہے، تو اس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہے اور جس کی ہجرت کی غرض دنیا کمانا ہو، یا کسی عورت کو پانا ہو کہ اس سے نکاح کرے، تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے، جس کی غرض سے اس نے ہجرت کی۔''

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمام تر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے اور اسی لیے اخلاق کی بحث میں اس کو

---

❶ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی:۱ وکتاب الایمان، باب ان الاعمال بالنیة والحسبة:٥٤۔ ❷ ایضا۔

خاص اہمیت حاصل ہے، حسن نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑے سے بڑا کام بھی حسنِ خلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف وستائش کے حدود سے باہر اور روحانی خیر وبرکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔

فلسفہ اخلاق کی تائید

آنحضرت کی اخلاقی تعلیم کا یہ وہ اصول ہے، جس کی حرف بحرف تائید جدید فلسفہ اخلاق سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ جان ایس میکنزی، اپنی تصنیف ''مینول آف ایتھکس'' کی پہلی کتاب کے چھٹے باب میں لکھتا ہے:

جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے، وہ صاف ہے، یعنی فعل ارادی، جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے، یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات میں شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے، اس کا کام تمام تر ارادہ کی صحیح جہت ہی کا بتلانا ہے، جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہیں، ان کا تعلق بھی ارادہ ہی سے ہوتا ہے، جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اس کی اخلاقی حیثیت نہیں۔

اس مسئلہ کی ایک دو مثالیں دے کر کینٹ کی رائے نقل کی ہیں:

> ''اسی لیے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کو جس مشہور ومعروف دعویٰ کے ساتھ شروع کیا ہے، اس کی ہم کو تصدیق کرنی پڑتی ہے، وہ کہتا ہے کہ ''بجز اچھے ارادہ کے دنیا بھر میں بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شئے نہیں ہے، جس کو علی الاطلاق بلا کسی قید وشرط کے اچھا کہا جاسکے۔'' [1]

اخلاق کے لیے ایمان کی شرط

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمام تر بنا، ارادہ ونیت، یعنی قلب کے عمل پر ہے، تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے، جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے، ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں، اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں، تاہم کوئی ہے، جس کی آنکھیں اس کے دل کی تہ کو ہزار پردوں میں بھی دیکھ رہی ہیں، دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں، مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے، پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے اور ایک دن آئے گا، جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی، جب تک یہ دو خیال دل ودماغ میں جاگزیں نہ ہوں گے، اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے وجود قطعی محال ہے، اسی لیے وحی محمدی نے اللہ اور قیامت پر ایمان لانا، ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دی ہے، کہ بے اس کے ہر کام محض ریا اور نمائش بن جاتا ہے، فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ﴾ (٢/ البقرۃ:٢٦٤)

---

[1] علم اخلاق، کتاب اول باب ششم ص:١١٠ مترجم پروفیسر عبدالباری ندوی، شائع کردہ جامعہ عثمانیہ: ١٣٤١ھ۔

''اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتا کر یا ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ برباد کرتا ہے، جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخری دن پر یقین نہیں رکھتا۔''

یہی ایمانِ صحیح جس سے حسنِ نیت پیدا ہوتا ہے، آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے، جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــــًٔا ﴾ (۲٤/ النور:۳۹)

''اور جو اللہ اور قیامت کو نہیں مانتے، ان کے کام ایسے ہیں، جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے، جب وہاں جائے تو اس کو کچھ نہ پائے۔''

یہی وہ مشعل ہے، جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے، یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو:

﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾

(۲٤/ النور:٤٠)

''یا (اللہ اور قیامت کے) نہ ماننے والوں کے کاموں کی مثال ایسی ہے کہ اندھیرے میں گہرے دریا میں اس کو لہر ڈھانکے ہے، اس لہر پر دوسری لہر ہے، اس پر گھٹا چھائی ہے، تاریکیاں ہیں ایک پر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھتا نہیں اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی اس کو کہیں روشنی نہیں۔''

جب تک کسی واقفِ اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ، باز پرس اور جواب دہی کا یقین نہ ہوگا، دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہوسکتی اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہوسکتا ہے۔

غرض و غایت

اسی لیے آنحضرت ﷺ کی شریعتِ کاملہ میں نفسِ عمل مطلوب نہیں، بلکہ وہ عمل مطلوب ہے، جس کی غرض و غایت صحیح ہو، عمل قالب ہے، تو صحیح غرض و غایت اس کی روح ہے، روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے، حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل غرض و غایت سے خالی نہیں ہوتا، لیکن یہ غرض و غایت ہے کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہیں ہوسکے، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے لے کر آج تک بیسیوں نظریے قائم ہو چکے ہیں، لیکن حقیقت کا راز اب تک آشکارا نہیں۔

اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے، بلکہ اس سے بحث ہے کہ اخلاص کی غرض و غایت کیا ہونی چاہیے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنیٰ اور اعلیٰ، پست اور بلند متعدد غرضیں اور رعایتیں ہوسکتی ہیں، ہم راہ میں ایک بوڑھے کی گردن سے بوجھ اتار کر خود اٹھا لیتے ہیں اور اس کو اس کے گھر تک با آرام پہنچا دیتے ہیں، ہمارے اس کام کی غرض یہ ہوسکتی ہے کہ گھر پہنچ کے بڈھا خوش ہو کر ہم کو مزدوری اور انعام دے گا، یہ بھی مقصد ہوسکتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ کر ہماری تعریف کریں گے اور کسی پبلک منصب اور عہدہ کے انتخاب میں وہ ہم کو اپنی رائے دیں گے، یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ راستہ چلتے لوگ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر ہمیں بڑا نیک اور دیندار سمجھیں گے، یہ بھی غرض ہوسکتی ہے کہ آج اگر ہم جوانی میں اس بوڑھے کی مدد کریں گے، تو کل ہمارے بڑھاپے میں کل کے نوجوان ہماری مدد کریں گے، بعض نیک لوگوں کو ایسے کاموں کے کرنے سے طبعاً خوشی ہوتی ہے، وہ اپنی اس خوشی کے لیے اس قسم کے کاموں کو کرتے ہیں، بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک بوڑھے کو اس حال میں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں اور اس سے متاثر ہو کر یہ کام کرتے ہیں، غرض ایک ہی قسم کے کام کے یہ تمام مختلف اغراض، مختلف اشخاص کے کاموں کی غایت اور محرک ہوسکتے ہیں، لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالیے، تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اغراض بتدریج پستی سے بلندی کی طرف جارہے ہیں اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی ونفسانی غرض و غایت سے پاک ہے، اسی قدر وہ بلند اور قابل قدر ہے، کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے، اس کے بعد عزت وشہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لیے کرنا بھی گو پست مقصد ہے، مگر پہلے سے بلند ہے، پھر روحانی خوشی اور ضمیر کی فطری خواہش کی تسلی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے، مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے، یہ بالکل فطری بات ہے، کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے، مگر جب اس کو معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کی تہ میں اس کی فلاں ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں سے گر جاتی ہے اور یہ سارا جادو بے اثر ہوجاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کاموں کی غرض و غایت جنت کی طلب قرار دے سکتے ہیں، لیکن درحقیقت اس میں بھی گو اس دنیا کی نہیں، لیکن اس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے، اس لیے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے، اس لیے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعلیم محمدی ﷺ میں بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے، مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہیں دیا گیا ہے، یہاں تک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہیں:

؎ طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ دوزخ میں لے کے ڈال دے کوئی بہشت کو

ضمیر کی آواز

یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کر لیتا

ہے اور جس کے سبب سے اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے، غریب ولاچار آدمی کو دیکھ کر ہر شخص پر فطرۃً رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے، قاتل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے، یہ قلب کی فطری صلاحیت ہر انسان کے ضمیر میں ہے، ہر اچھے یا برے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے، لیکن بری صحبت، بری تربیت، یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے میں انسان خوف کھاتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں، وہ اپنی گناہگاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے، وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس میں غرق ہو جاتا ہے، اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے، لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دباتا رہتا ہے تو وہ دب کر رہ جاتی ہے اور اس کی پشیمانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہو جاتا ہے۔ یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصول اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نیکی و بدی کے جو فطری الہامات ودیعت رکھے ہیں، یہ اس کے نتائج ہیں، قرآن کہتا ہے:

﴿ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝ ﴾ (۹۱/ الشمس :۸)

''ہر نفس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی ہے۔''

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے اور جو ہم کو ہمارے ہر برے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے، وحی محمدی کی اصطلاح میں اس کا نام ''نفس لوامہ'' (ملامت کرنے والا نفس) ہے اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے، سورۂ قیامہ میں ہے:

﴿ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۲)

''اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان کو اس کی برائیوں پر ملامت کرتا ہے۔''

آگے چل کر فرمایا:

﴿ بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۱۴۔۱۵)

''بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے، اگرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال لیتا ہے۔''

نواس بن سمعان انصاری رضی اللہ عنہ ایک سال تک اس انتظار میں مدینہ میں ٹھہرے رہے کہ آنحضرت سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھیں، آخر ایک دن ان کو موقع مل گیا اور انھوں نے دریافت کیا، فرمایا: ''نیکی حسن اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹک جائے اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں۔'' [1] اسی طرح وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ نام ایک صاحب خدمت نبوی میں نیکی اور گناہ کی حقیقت

[1] مسلم، کتاب البر والصلة، باب تفسیر البر والاثم: ۶۵۱۶، ۶۵۱۷؛ مسند احمد، ج ٤، ص: ۱۸۲۔

دریافت کرنے کی غرض سے آئے چاروں طرف جان نثاروں کا ہجوم تھا اور وہ شوق و ذوق میں سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے، لوگ ان کو روک رہے تھے، مگر وہ آگے بڑھتے ہی گئے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: ''وابصہ قریب آ جاؤ۔'' جب وہ قریب جا کر بیٹھے تو فرمایا: ''اے وابصہ! میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو، یا تم بتاؤ گے''؟ عرض کی، حضور ہی ارشاد فرمائیں، فرمایا: ''وابصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو۔'' عرض کی سچ ہے یا رسول اللہ ﷺ فرمایا:

((یاوابصة! استفت قلبك واستفت نفسك البر مااطمأن اليه القلب واطمأنت اليه النفس والاثم ماحاك في القلب و تردد في النفس و ان افتاك الناس)) ❶

''اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کر، اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر، نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو ادھیڑ بن میں ڈالے، اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں۔''

یہی وہ حاسۂ اخلاق ہے، جس کا نام لوگوں نے ضمیر کی آواز رکھا ہے۔

پہلے پہل جب انسان اپنی ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے دل کی صاف و سادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگرچہ ہوش میں آ کر جب توبہ و استغفار کرتا ہے اور پشیمان و نادم ہوتا ہے، تو وہ داغ مٹ جاتا ہے، لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا رہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کر کے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اس کو محروم کر دیتا ہے، اسی مفہوم کو آنحضرت نے ان الفاظ میں ادا فرمایا:

((ان العبد اذا اخطأ خطيئة نكتت في قلبه نكتة سوداء فاذاهو نزع واستغفر وتاب صقل قلبه وان عادزيد فيها حتىٰ تعلو قلبه))

''بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، تو اگر اس نے پھر اپنے کو علیحدہ کر لیا اور اللہ سے مغفرت مانگی اور توبہ کی، تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔''

اس کے بعد فرمایا: ''یہی وہ دل کا زنگ ہے، جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ ❷ (۸۳/ المطففین: ۱٤)

''کبھی نہیں، بلکہ ان کے (برے) کاموں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چھا گیا تھا۔''

آنحضرت ﷺ نے ایک تمثیل میں فرمایا: ''منزل مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے، راستہ

❶ مسند احمد، ج ٤، ص: ۲۲۸۔ الفاظ قدرے مختلف ہیں۔

❷ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر آیت مذکور: ۳۳۳٤۔

کے ادھر ادھر دونوں طرف دو دیواریں کھنچی ہیں اور ان دونوں میں کچھ دروازے کھلے ہیں، لیکن ان پر پردے پڑے ہیں، راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو اور ادھر ادھر مڑو نہیں جب کوئی راہ گیر اللہ کا بندہ چاہتا ہے، کہ ان دائیں بائیں کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کا پردہ اٹھائے تو اوپر سے ایک منادی والا پکار کر کہتا ہے: ''خبردار پردہ نہ اٹھانا، اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے۔'' پھر فرمایا: ''یہ راستہ اسلام ہے اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کے ممنوعات ہیں اور یہ پردے اس کے حدود ہیں اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا القرآن ہے اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے............۔''

((ھو واعظ اللّٰه فی قلب کل مؤمن)) [1]

''وہ اللہ کا وہ واعظ ہے جو ہر مومن کے قلب میں ہے۔''

کیا کسی بڑے سے بڑے ضمیری نے بھی اخلاقی ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہے۔

مسرت وانبساط

یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے کرنے والے کو جو خوشی اور برائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے، وہی اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب دیتا اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے، گو تمام تر صحیح نہیں ہے، تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقتاً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور برائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے، لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرک نہیں اور نہ ان کو ہمارے کاموں کی غرض و غایت ہونی چاہیے کہ یہ بھی مادی خود غرضی ہے، بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں، ایک غریب و لاچار کی امداد سے بے شبہ ہم کو خوشی ہوتی ہے، لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے، لیکن وہ اس کی محرک، علت اور غرض و غایت نہیں، اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض و غایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ اللہ اور اس کی رضا مندی کا حصول۔ اس تشریح کے بعد معلوم ہوگا کہ سرور کائنات ﷺ کی تعلیم نے حکمائے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ میں جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت والم کے اصول پر قائم کرتی ہے، تھوڑی سی ترمیم کر دی ہے اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا، نیکی کی غرض و غایت نہیں، بلکہ اس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے، علمائے اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہیں، اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفۂ الٰہی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ﴾ (۴۹/ الحجرات:۷)

''لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں اچھا کر کے دکھایا اور کفر

[1] مشکوۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ:۱۹۱ بحوالہ احمد، ۴ ص:۱۸۲ وبیہقی فی شعب الایمان: ۶۸۲۱؛ ترمذی: ۲۸۵۹ مختصراً۔

اور گناہ اور نافرمانی سے گھن لگادی، یہی لوگ نیک چلن ہیں۔“

اسی آیت پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے الفاظ میں اس طرح فرمائی:

((اذا سرتك حسنتك وساء تك سيئتك فانت مؤمن)) [1]

”جب تمہاری نیکی تم کو خوشی بخشے اور تمہاری بدی تم کو غمگین کردے تو تم مومن ہو۔“

((من سرّته حسنة وساء ته سيئة فهو مؤمن)) [2]

”جس کو نیکی خوش اور برائی غمزدہ بنادے وہ مومن ہے۔“

((من عمل سيئة فكرهها حين يعمل، وعمل حسنة فسّر فهو مؤمن)) [3]

”جس نے جب کوئی برائی کی، تو اس کو اس سے سخت نفرت آئی اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اس کو مسرت ہوئی وہ مومن ہے۔“

غرض نیکی پر مسرت وانبساط اور انشراحِ خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصول اخلاق میں سابق الذکر ترمیم کے ساتھ فرقہ، لذتیہ کے لیے بھی قدم رکھنے کی گنجائش باقی رکھی ہے اور پیغمبر اسلام کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے، بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی، اس کی تصحیح فرمادی ہے۔

رضائے الٰہی

اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض وغایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے، ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہیے اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے، یہیں آ کر فلسفہ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایاں ہوتا ہے، حکمائے اخلاق یہ ڈھونڈتے ہیں کہ انسانی اخلاق کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے اور معلمِ حکمت علیہ السلام یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض وغایت کیا قرار دینی چاہیے، انسان کے پاس دو ہی دولتیں ہیں، جان اور مال اور انہی دونوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، ایثار اور حسن عمل ہے، پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۝ ﴾

(٢/ البقرة:٢٠٧)

”بعض ایسے ہیں، جو اپنی جان کو اللہ کی خوشنودی چاہنے کے لیے بیچتے ہیں اور اللہ بندوں پر

---

[1] مسند احمد بن حنبل، ج٥، ص: ٢٥١، ٢٥٢ ومستدرك حاكم، كتاب الايمان، ج١، ص: ١٤ ومختصر شعب الايمان بيهقى، ص: ٥٢ مطبع سعادت مصر، وابن حبان: ٧٢٥٤؛ ترمذى: ٢١٦٥ وابو داود، وعن عمر بن الخطاب۔ [2] طبرانى فى الكبير عن ابى موسى، كنز العمال، ج١، ص: ٣٧۔

[3] مستدرك حاكم، كتاب الايمان، ج ١، ص: ١٣۔

مہربان ہے۔''

پھر مال کے متعلق فرمایا:

﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۵)

''اوران کی مثال جو اپنی دولت اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں۔''

﴿ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۲)

''اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔''

﴿ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۝ ﴾

(٤/ النسآ:١١٤)

''اور جو یہ تمام کام اللہ کی خوشنودی کے لیے کرے گا، تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے۔''

﴿ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۝ ﴾ (۱۳/ الرعد:۲۲)

''اور جنہوں نے اللہ کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو ان کو دیا ہے، اس میں کچھ چھپے اور کھلے طریقہ سے خرچ کیا۔ اور برائی کو نیکی سے دور کرتے ہیں، انہی کے لیے ہے پچھلا گھر۔''

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورۂ لیل میں کھولی گئی ہے:

﴿ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى۝ ﴾

(۹۲/ الیل:۱۸۔۲۰)

''جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے ہوئے دیتا ہے، کسی کا اس پر احسان نہیں ہے، جس کو ادا کرنے کے لیے دیتا ہو، بلکہ وہ اللہ کی ذات کی طلب کے لیے دیتا ہے۔''

ان آیات کی تفسیر وتوضیح آنحضرت ﷺ نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے، ایک صحابی پوچھتے ہیں: یارسول اللہ ﷺ! کوئی اس لیے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے، کوئی اس لیے کہ وہ بہادر کہلائے، کوئی اس لیے کہ اس کو شہرت حاصل ہو، تو ان میں سے راہ خدا میں لڑنا کس کو کہیں گے، فرمایا: ''اس کو جو اس لیے لڑتا ہو کہ اللہ کی بات بلند ہو۔'' [1] ایک دفعہ ارشاد فرمایا: ''گھوڑا باندھنا کسی کے لیے اجر کا موجب، کسی کے لیے پردہ پوش اور کسی کے لیے گناہ ہے، اجر کا موجب اس کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں اس کو باندھتا ہے، تو اس کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے، پردہ پوش اس کے لیے ہے جو ضرورۃً اس لیے باندھتا ہے کہ اللہ نے اس کو دولت دی ہے تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگنی نہ پڑے، تو وہ رحم وشفقت کے ساتھ

[1] صحيح بخاري، كتاب الجهاد، باب من قاتل لتكون كلمة الله هى العليا: ۲۸۱۰۔

اس سے کام لیتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے اور گناہ اس کے لیے ہے جو فخر اور نمائش کے لیے باندھتا ہے۔'' ❶

اس تعلیم کا سب سے مؤثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تین دفعہ غش کھا کر گرے اور جس کو سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ زار زار روئے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لیے اترے گا اور ہر امت اپنی جگہ پر گھٹنے ٹیکے ہوگی، اس وقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہوگا جو قرآن کے عالم تھے اور جو جہاد میں مارے گئے تھے اور جو دولت والے تھے، پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا، کیا میں نے تجھ کو وہ سب نہیں سکھایا جو اپنے پیغمبر پر اتارا تھا تو تم نے اس پر کیا عمل کیا؟ وہ عرض کرے گا ''بارالٰہا! میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا، اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے، فرشتے کہیں گے: یہ جھوٹا ہے، پھر اللہ فرمائے گا تو تو اس لیے یہ کرتا تھا، تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا عالم اور قرآن خواں ہے، تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا، (یعنی تو اپنا بدلہ پا چکا) پھر دولتمند سے اللہ فرمائے گا: کیا میں نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہیں کیا، یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا؟ عرض کرے گا کیوں نہیں اے میرے رب! دریافت کرے گا، تو میں نے جو کچھ تجھ کو دیا اس میں تو نے کیا کیا؟ جواب دے گا میں اہل استحقاق کا حق ادا کرتا تھا اور خیرات دیتا تھا، ارشاد ہوگا، تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے: یہ جھوٹا ہے، پھر اللہ فرمائے گا تو تو اس لیے یہ کرتا تھا، تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا سخی ہے، تو یہ تجھ کو دنیا میں کہا جا چکا، (تو اپنا بدلہ پا چکا) اس کے بعد وہ لایا جائے گا جو جہاد میں مارا گیا، تو اللہ اس سے دریافت کرے گا، تو کس بات کے لیے مارا گیا؟ کہے گا اے اللہ! تو نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا تھا تو میں لڑا، یہاں تک کہ مارا گیا، اللہ فرمائے گا: تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے: یہ جھوٹا ہے، اللہ کہے گا تو تو اس لیے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہیں، تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا۔'' پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔'' ❷ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کو سن کر بہت روئے، پھر بولے اللہ اور اس کا رسول سچا ہے اور اس حدیث کی تائید میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ ﴾ (١١/ هود:١٥-١٦)

''جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہو تو ہم اس کا عمل اسی دنیا میں پورا کر دیں گے،

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الخیل ثلاثة: ٢٨٦٠ وکتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الاسلام: ٣٦٤٦ وکتاب الاعتصام بالکتاب والسنة باب الاحکام التی تعرف بالدلائل ٧٣٥٦؛ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰة، باب اثم مانع الزکاة: ٢٢٩٠، ٢٢٩٢۔

❷ جامع ترمذی، ابواب الزهد باب ماجاء فی الریاء والسمعة: ٢٣٨٢۔

بے کم و کاست، ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، مگر دوزخ، اس دنیا میں انھوں نے جو بنایا وہ مٹ گیا اور جو کیا وہ برباد گیا۔''

غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت، خودغرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے، بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے جہاں اس کی منزل رضائے الٰہی کی طلب نہیں، بلکہ خود ذات الٰہی ہو جاتی ہے:

﴿ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۲)

''اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔''

﴿ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ ﴾ (۱۳/ الرعد:۲۲)

''اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لیے صبر کیا۔''

﴿ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۙ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ ﴾

(۹۲/ الیل:۱۹۔۲۰)

''اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے نہیں، بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لیے کرتا ہے۔''

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:

﴿ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ (۳۰/ الروم:۳۸)

''تو رشتہ دار کا حق ادا کر اور غریب کا اور مسافر کا، ایسا کرنا ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کی ذات کو چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔''

مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول

آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اصولِ اخلاق کی جو تکمیل ہوئی اس کا پتہ اخلاق کے بنیادی اصول سے چلتا ہے، توراۃ نے اپنی اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھی ہے، جس میں کسی اصول اور غرض و غایت اور علت و مصلحت کی کوئی تشریح نہیں کی جاتی، انجیل میں لفظی صناعیوں کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیاد ہی قائم نہیں کی گئی ہے، تاہم عیسائی مذہب میں کچھ اصول ضرور موجود ہیں، مگر ان کی بنیاد حد درجہ کمزور ہے، ان میں سے پہلا مسئلہ خود اصل خلقتِ انسانی کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت میں سادہ ہے، یا گناہوں سے داغدار ہے، عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل میں گناہگار پیدا ہوتا ہے، گناہ اس کا مایۂ خمیر ہے، کیونکہ اس کے باپ

اور ماں حضرت آدم اور حوا گناہگار تھے اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے، جس سے بچنا انسان کے لیے ممکن نہیں، اس مسئلہ میں مسیحی تعلیم کا غلو اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ جب تک بپتسمہ نہ پالے پاک نہیں ہوتا، اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مرجائے تو وہ گناہگار مرا اور آسمانی بادشاہی کے حدود میں وہ داخل نہ ہوگا، بلکہ وہ جہنم میں جھونکا جائے گا، کیونکہ مسیح علیہ السلام کے نام سے اس نے نجات نہیں پائی تھی۔ لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جداگانہ ہے، اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے: ﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ ﴾ (۳۰/ الروم: ۳۰) ''اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔'' پھر اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے ازلی سوال کے جواب میں بَلٰی یعنی اللہ کا اعتراف، ہر انسان روز ازل کر چکا ہے، اس لیے اس دنیا میں آ کر جس نے اپنے فطری اور ازلی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہیں کیا، اس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کے لیے کافی ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی لوحِ فطرت پر جو زریں حروف لکھے ہیں، وہ اپنے ہوش و تمیز کے بعد یا اس کو ابھار کر چمکا دیتا ہے، یا مٹا ڈالتا ہے، فرمایا:

﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ؗ ﴾ (۹۵/ التین: ٤)

''ہم نے انسان کو اچھی سے اچھی راستی پر پیدا کیا۔''

یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے، دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ؕ ﴾ (۸۲/ الانفطار: ۷۔۸)

''جس اللہ نے تجھ کو بنایا، پھر تجھ کو برابر کیا، پھر تجھ کو ٹھیک کیا، پھر جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۔''

یہ آیت سورۂ انفطار کی ہے، اس میں قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا و سزا کے مقررہ دن کا بیان ہے، اس کے بعد یہ آیت ہے، جس لفظ کا ترجمہ ہم نے ''ٹھیک کیا'' کیا ہے، اس کے لفظی معنی ''معتدل کیا'' کے ہیں، یعنی اس کو قویٰ کا ہر قسم کا اعتدال بخشا، نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس میں کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی، اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم میں اس کے جسمانی اور روحانی دونوں قویٰ کا اعتدال داخل ہے، دوسری آیتوں میں یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے، سورۂ اعلیٰ میں ہے:

﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۙ ﴾

(۸۷/ الاعلیٰ: ۱۔۳)

''اپنے بلند و برتر پروردگار کی پاکی بیان کر، جس نے پیدا کیا، پھر برابر کیا اور جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا پھر راہ دکھائی۔''

راہ دیکھنا، یعنی ہدایت، انسان کی فطرت میں اس نے اسی طرح ودیعت رکھا ہے، جس طرح اس میں دوسرے بیسیوں قویٰ اس نے ودیعت رکھے ہیں، سورۂ دہر میں اس سے بھی زیادہ صاف ہے:

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدھر:۲۔۳)

''ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا، پلٹتے رہے اس کو، پھر کر دیا اس کو سنتا دیکھتا، ہم نے اس کو راہ سوجھا دی تو وہ یا شکر گزار (نیکوکار) ہوتا ہے، یا ناشکرا (بدکردار)۔''

غرض اس کو یہ راہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی، اب عقل و تمیز آنے کے بعد اللہ کا شکر گزار یا ناشکرا، نیکوکار یا بدکردار، اچھا یا برا ہو جانا خود اس کا کام ہے، سورۂ شمس میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے:

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ ﴾ (۹۱/ الشمس:۷۔۱۰)

''قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے کی، پھر ہم نے اس کو الہام کر دیا (یا سوجھا دیا) اس کی نیکی اور بدی، تو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف رکھا اور ناکام ہوا، وہ جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا، (گندا کر دیا)۔''

الغرض محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کی رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کے ساتھ ہی گناہگار اور عصیان کار نہیں ٹھہرایا گیا ہے، بلکہ اس کی اصل فطرت میں ہدایت اور صحیح الہام ودیعت ہے، اس لیے یہ کہا گیا:

﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (۳۰/ الروم:۳۰)

''سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کے بنانے میں بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے، لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔''

یہ دین فطرت، اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں، جن کی بنیادی چیز توحید ہے، آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ''ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل میں صحیح و سالم پیدا ہوتا ہے، وہ کن کٹا نہیں پیدا ہوتا۔'' [1]

اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے۔ وحی محمدی ﷺ نے اسی مسئلہ کو ایک اور ازلی مکالمہ کی صورت میں بیان کیا ہے، انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی: ۱۳۵۸، ۱۳۵۹؛ مسلم، کتاب القدر، باب معنی کل مولود یولد علی الفطرۃ: ۶۷۵۵۔

انسانی ارواح سے دریافت فرمایا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ''کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟'' انھوں نے اپنی زبان حال یا قال سے بالاتفاق جواب دیا، ﴿بَلٰى﴾ ''ہاں بیشک تو ہمارا پروردگار ہے۔'' یہی ازلی اور فطری اعتراف انسان کا وہ عہد ہے، جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے اور کہا ہے کہ ''دیکھو شیطان نے تمہارے باپ آدم کو بہکایا تھا، تو تم اس کے بہکانے میں نہ آؤ۔''

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت سے معصوم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے، وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لاد کر نہیں آتا، قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ﴾ (۳۵/ فاطر:۱۸)

''اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔''

﴿كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ۝﴾ (۵۲/ الطور:۲۱)

''ہر نفس اپنے ہی عمل میں گروی ہے۔''

اور اسی کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((الا لایجنی جان علی ولده ولا مولود علی والده)) [1]

''ہاں! باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ۔''

اسی طرح ان مذہبوں نے بھی جنھوں نے انسانوں کو آواگون اور تناسخ کے چکر میں پھنسا رکھا ہے، انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گناہ گار اور داغدار ہی ٹھہرایا ہے، انھوں نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے، اس کی ہر پیدائش کو دوسری پیدائش کا، ہر زندگی کو دوسری زندگی کا اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتا کر اس کو اپنے پچھلے کرموں کے ہاتھوں میں مقید کر رکھا ہے، یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہو اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے۔ اب غور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت میں بے گناہ اور بے داغ ہے، غمگین دنیا کے لیے کتنی بڑی عظیم الشان خوشخبری ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے کہ معصوم اور ناکردہ گناہ بچہ بھی گناہگار اور جہنم کا ایندھن ہے، آپ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش وحواس اور عقل وتمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گناہ ہے، فرمایا کہ ''اللہ کا قلم بچہ سے اس وقت تک کے لیے اٹھا دیا گیا جب تک وہ عقل وتمیز کو نہ پہنچے۔'' [2]

باغ ہستی کی یہ انسانی کلیاں جو بن کھلے مرجھا گئیں، اسلام کی نگاہ میں جنت کے پھول ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس مسلمان کے تین بچے بچپن میں مر گئے، وہ اللہ کے دربار میں اپنے ماں باپ کے شفیع ہوں گے اور

[1] سنن ابن ماجه، ابواب المناسك، باب الخطبة يوم النحر:۳۰۵۵۔

[2] صحيح بخاري، كتاب الطلاق، باب الطلاق في الاغلاق والكره، رقم الباب:۱۱؛ كتاب الحدود، رقم الباب:۲۲ وترمذي، ابواب الحدود ما جاء في من لايجب عليه الحد:۱۴۲۳۔

ان کو جنت میں لے جائیں گے۔'' ❶ آنحضرت ﷺ کے شیر خوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی، تو فرمایا: ''یہ جنت میں جا کر جنتی دایوں کا دودھ پیئے گا۔'' ❷ اس سے زیادہ یہ کہ مشرکین کے کم سن بچوں کی نسبت آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہاں رہیں گے؟ فرمایا: ''اللہ کو علم ہے کہ یہ کیا ہوتے۔'' ❸ لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرما دی، ایک دفعہ رؤیا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ جنت میں بیٹھے ہیں اور ان کے چاروں طرف کمسن بچوں کا ہجوم تھا، فرمایا: ''یہ وہ کمسن بچے تھے جو دین فطرت پر مر گئے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! اور مشرکوں کے بچے؟ فرمایا: ''اور مشرکوں کے بچے بھی۔'' ❹ ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ کمسنی میں مر جانے والے بچہ کو بہ تخصیص جنتی کہہ اٹھتے تھے، لیکن چونکہ غیب پر حکم لگانا صرف اللہ کا کام ہے، اس لیے تصریحاً کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا کہہ دینا آپ نے مناسب نہیں سمجھا، ایک دفعہ ایک صحابی کا بچہ مر گیا تھا، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس سانحہ کو سن کر آنحضرت ﷺ سے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! اس کو مبارک ہو یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی، نہ گناہ کیا نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا۔ فرمایا: ''اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے کچھ لوگ پیدا کیے ہیں اور جہنم کے لیے کچھ لوگ۔'' ❺ ایک طرف عیسائیت ہے جو بپتسمہ پانے سے پہلے مر جانے والے کمسن بچوں کو جہنم میں جھونکتی ہے، دوسری طرف اسلام ہے جو ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے اور ان کے جنازہ کی نماز میں یہ دعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے، ''اے اللہ! اس کو میرے لیے پیشگی کا ذخیرہ بنانا، اس کو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ میں مقبول ہو۔'' احادیث میں ایسے موقعوں پر جب کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہوں کے معاف ہو جانے کا ذکر آتا ہے، اکثر آنحضرت ﷺ نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ ''وہ پھر ایسا معصوم ہو جاتا ہے کہ گویا اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنا ہے۔'' ❻

خوف ورجا

اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے، یونان کے فلسفیوں میں دو گروہ گزرے ہیں، ایک کو رونے والے فلسفی، دوسرے کو ہنسنے والے فلسفی کہتے ہیں، پہلا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے ناامیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اس کو دنیا تمام تر تاریک اور خارزار نظر آتی ہے، دوسرا گروہ وہ ہے، جس کو دنیا میں چہل پہل،

---

❶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل من یموت له ولد: ٦٦٩٦۔ ❷ ابن ماجه، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی الصلاة علی ابن رسول الله ﷺ: ١٥١١۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب القدر: ٦٧٦٢۔
❹ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا بعد صلوة الصبح: ٧٠٤٧۔ ❺ یہ حدیثیں صحیح مسلم، کتاب القدر: ٦٧٦٨ میں ہیں، نیز امام نووی کی شرح مسلم میں بھی یہ باب دیکھو اور باب فضل من یموت له ولد (ج ٢، ص: ٤٠٢، ٤٠٣) ❻ صحیح مسلم، کتاب صلوة المسافرین، باب اسلام عمرو بن عبسه: ١٩٣٠؛ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب فضل حج المبرور: ١٥٢١؛ ترمذی ابواب الحج، باب ماجاء فی فضل الطواف: ٨٦٦۔

عیش و آرام اور بہار و رونق کے سوا کچھ سوجھائی نہیں دیتا، پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو اور زندگی میں موت کی صورت بنا لو، کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے، دوسرے کا نظریہ یہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو اور کل کے غم کی فکر نہ کرو، اخلاقی لحاظ سے یہ دونوں رائیں ترمیم کے قابل ہیں، پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قویٰ سرد ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ دنیا میں کسی کام کے سرانجام دینے کا اہل نہیں باقی رہتا اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ بادۂ غفلت میں مست و سرشار ہوتا ہے اور اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی، اسلام کی تعلیم کی شاہراہ ان دونوں گلیوں کے بیچ سے نکلی ہے، وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سناتا ہے، کہ دل بادۂ غفلت میں سرشار نہ ہو اور دوسری طرف وہ اس کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا، وہ اخیر اخیر وقت تک اللہ کے سہارے جینے کی تعلیم کرتا، اس کی شریعت میں اللہ سے ناامیدی اور کفر ایک ہے، وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی ناامید بنا کر بے سہارا نہیں ہونے دیتا، قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا:

﴿ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر:۵۵)

''(ابراہیم) ناامیدوں میں سے نہ بن۔''

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی تعلیم ملی:

﴿ وَلَا تَايْـــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ ﴾

(۱۲/ یوسف:۸۷)

''اور اللہ کے فیض سے ناامید مت ہو، اللہ کے فیض سے ناامید وہی ہیں جو اللہ کے منکر ہیں۔''

اس امت کے گناہگاروں کو کس پیار سے خطاب ہوتا ہے:

﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ ﴾ (۳۹/ الزمر:۵۳)

''اے میرے وہ بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر آپ ظلم کیا، تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت بنو۔''

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پُر امید رہنے کی تاکید کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس رہتا ہوں۔'' [1] یعنی جیسا وہ میری نسبت گمان کرتا ہے، وہی اس کے لیے ہو جاتا ہے، اس بارہ میں اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیت کریمہ ہے:

﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآىِٕمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ ﴾

(۳۹/ الزمر:۹)

[1] جامع ترمذی، کتاب الزھد، باب ما جاء فی حسن الظن باللّٰہ تعالی: ۲۳۸۸۔

’’بھلا ایک وہ جو بندگی میں لگا ہے، رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے۔‘‘

یعنی اس کے دل میں یہ دونوں کیفیتیں یکجا ہیں، گناہوں اور تقصیروں کے مواخذہ اور باز پرس کا ڈر بھی ہے اور اللہ کی رحمت کی امید کا سہارا بھی ہے، اللہ کے غضب سے ڈرنا اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے، یہ ڈر اس کو غافل، بیباک اور گستاخ نہیں ہونے دیتا اور یہ امید اس کو مایوس، غمزدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہونے دیتی، اسی لیے ایک مسلمان کا دل ہمیشہ سوئے انجام سے خائف لیکن توقعات سے لبریز رہتا ہے، اسی کی طرف اشارہ کر کے قرآن اہل ایمان سے کہتا ہے:

﴿ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ﴾ (٤/ النسآء: ١٠٤)

’’اور تم کو اللہ سے وہ امید ہے جو کافروں کو نہیں۔‘‘

یہی وہ ذہنی فرق ہے جو مشکلات کے عالم میں ایک مومن اور ایک کافر کے دل میں پیدا ہوتا ہے، کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہاں ہے اور جب وہ اس کو نہیں پاتا، تو دل شکستہ ہو جاتا ہے، وہ کامیابی صرف مادی ہی کامیابی کو سمجھتا ہے اور جب وہ نہیں ملتی تو افسردہ ہو جاتا ہے، لیکن مومن اگر ظاہری اور دنیا کی مادی کامیابی سے ہم آغوش نہیں بھی ہوتا، تب بھی اس کا دل شاداں اور فرحاں رہتا ہے کہ اس نے نیکی کا کام کیا اور بہر حال اس نیکی کا یہاں نہیں تو وہاں معاوضہ ضرور ملے گا، اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو نہ ہو، اللہ کی خوشنودی اور ثواب تو بہر حال ملے گا، اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو ہر نیک کام میں جری اور بہادر بنا دیا ہے اور ان کو بغیر کسی مادی غرض کے اخلاص کے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے، اسی کا اثر ہے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قوموں میں ناکامی اور ناامیدی کی خودکشیوں کا عام طور سے رواج ہے، ہندوستان میں ہندو عورتوں کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں، یورپ اور امریکہ کے متمدن ملکوں میں ذرا ذرا سی ناامیدی پر خودکشی کر لینا ایک معمولی واقعہ بن گیا ہے، جس وقت یہ سطریں لکھ رہا ہوں وارسا (پولینڈ) میں ناکام نوجوان لڑکیوں کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک مجلس کے قیام کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں، مگر کسی مسلمان میں اخیر سے اخیر لمحہ میں بھی ناامیدی کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور اللہ کے فضل وکرم سے اس کی آس نہیں ٹوٹتی، امیر ہو کہ غریب، تندرست ہو کہ بیمار، اولاد والا ہو کہ بے اولاد، کامیاب ہو یا ناکام، دولتمند ہو یا دیوالیہ، ہر حالت میں وہ پر امید رہتا ہے، مشکلات میں، بیماریوں میں، محتاجیوں میں، ناکامیوں میں، ہر وقت وہ ہمت کے ساتھ اللہ کی رحمت کا امیدوار ہے اور یقین رکھتا ہے کہ ناامیدی اور کفر دونوں اس کے مذہب میں ایک ہیں اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہاں نہیں، تو وہاں ضرور ہے کہ اس کے اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ

﴿ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ ﴾ (٣/ آل عمران: ١٩٥)

''میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔''

اخلاق اور رہبانیت

اخلاق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش نیتی اور اچھائی برتنے کا نام ہے، یا یوں کہیے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں، ان کو ادا کرنے کو کہتے ہیں، اخلاق کی اس حقیقت ہی سے یہ واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لیے باہم انسانوں میں تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے، جو رہبانیت، تجرد اور جوگی پن میں نہیں پائی جاتی ہے، اسی لیے گوشہ نشینی، عزلت گزینی، خلق سے کم آمیزی، جماعت سے علیحدگی، اہل وعیال، عزیز واقارب اور دوست واحباب کے تعلقات سے آزادی، اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھودیتی ہے، یا کم کردیتی ہے۔

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لیے ہے کہ خلق سے قطع تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب میں اکثر نیکی اور دین داری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کر لی ہے، اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے اور وہ خود اور ان کے عقیدت مند بھی اس کو ان کی انتہائی نیکوکاری اور دین داری قرار دیتے تھے، لیکن حقیقتاً ان مذہبی افراد اور جماعتوں نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لیے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظروں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب واثر کو نمایاں کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصور کرانے میں مدد ملے اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیر پردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دین داری کا ڈھونگ کھڑا کرسکیں اور تیسری طرف اپنی اس عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل وعیال، اعزہ واقارب، دوست واحباب اور قوم وملک وملت کے فرائض وحقوق بجالانے کی تکلیف سے بچ جائیں، اسی لیے اسلام نے اپنے اصولِ اخلاق میں راہبانہ، جوگیانہ اور مجردانہ زندگی کی ہمت افزائی نہیں کی ہے، نبوت کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مجمعِ انسانی میں رہ کر اور تمام تر انسانی جدو جہد میں شریک ہوکر گزاری ہے، یہی طرز عمل خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کا تھا اور پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد اور انسانی مجمع کے ساتھ عمل صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے، تجرد، علیحدگی، خلوت نشینی، ترکِ عمل اور ترک جماعت کے لیے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہیں، ان سے ہٹ کر نہیں، وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشین ہوکر زندگی بسر کرتے ہیں، کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہیں؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں؟ کیا وہ یتیموں کے سرپرست ہیں؟ کیا وہ خلق الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہیں؟ کیا اپنے دست وبازو سے اپنی روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ ودعوت، تعلیم وموعظت، امر بالمعروف، نہی

عن المنکر اور جہاد جیسے فریضوں سے عہدہ برآ ہیں؟ حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں، اسی لیے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عموماً یہ مستحسن طریقہ نہیں، قرآن پاک میں ہے:

﴿ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ﴾ (٦٦/ التحریم:٦)

''تم اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔''

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں، بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے، آنحضرت ﷺ نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا: ((کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته)) ''تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور نگران ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا، امیر اپنی رعیت کا چرواہا، مرد اپنے اہل وعیال کا رکھوالا اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔'' [1]

جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں، یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، اس لیے وحی محمدی ﷺ نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا اور کہا:

﴿ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ﴾ (٨/ الانفال:٢٥)

''اور اس فساد سے بچو جو چن کر صرف گناہگاروں ہی پر نہیں پڑے گا۔''

بلکہ اس کی لپیٹ گناہگار و بے گناہ سب تک پہنچے گی، کہ اگر جماعت اپنے تمرد کی مجرم ہوئی ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے، چنانچہ قرآن پاک میں اصحاب سبت کے قصہ میں ان کنارہ گیر اور فرض تبلیغ سے بے پروا رہنے والے اشخاص کو بھی گناہگاروں ہی میں شامل کیا ہے۔ دنیا درحقیقت جدوجہد اور دار و گیر کا ایک میدان ہے، جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں، راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں، ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا خیال ولحاظ کرنا پڑتا ہے، اسی لیے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے، دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے، بیہقی نے شعب الایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے:

((ان المسلم الذی یخالط الناس ویصبر علی أذا هم خیر من المسلم الذی لا یخالط الناس ولا یصبر علی أذا هم)) [2]

''وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا ہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب المرأة راعیة فی بیت زوجها: ٥٢٠٠۔ [2] شعب الایمان بیهقی، ٦/ ٢٦٦/ ٨١٠٢ وجامع ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب فی فضل المخالطة مع الصبر علی أذی الناس: ٢٥٠٧؛ ادب المفرد، باب الذی یصبر علی اذی الناس: ٣٨٨؛ ابن ماجه، کتاب الفتن: ٤٠٣٢؛ احمد، ٢/ ٤٣۔

گوشہ گیری اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے اور فتنہ وفساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے، تو ایسے وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں وہ مجمع سے الگ ہو جائیں، فتنہ میں عزلت نشینی کی حدیثیں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں، ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت میں تبلیغ اور امر بالمعروف کے فرض کو ادا کر کے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کر دے یہی وہ نمونہ ہے، جس کو آنحضرت ﷺ نے دنیا میں پیش کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ نے اپنے اپنے دائرہ میں اسی کی پیروی کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے، اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے برا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔'' [1]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اسلام کے اس اصولِ اخلاق کو پیش نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آ جاتا ہے کہ تعلیم محمدی میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے، اسی اخلاقی فرض کا دوسرا شرعی نام ''امر بالمعروف و نهی عن المنکر'' (یعنی اچھی باتوں کے لیے کہنا اور بری باتوں سے روکنا) ہے، قرآن پاک نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۱۰)

''تم سب سے بہتر امت ہو، جو لوگوں کے لیے باہر لائی گئی ہو، اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو۔''

﴿ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (۹/ التوبة: ۷۱)

''وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے باز رکھتے ہیں۔''

پھر خاص طور سے حکم ہوا:

﴿ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (۳۱/ لقمان: ۱۷)

''اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے روک۔''

مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ

﴿ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴾ (۱۰۳/ العصر: ۳)

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان: ۱۷۷۔

''اور وہ آپس میں سچائی اور ثابت قدمی کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔''

﴿ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝﴾ (۹۰/ البلد:۱۷)

''اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔''

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے اور قوی دل اور قوی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔

توراۃ میں قابیل کا یہ فقرہ کہ ''کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟'' [1] عیسائی مذہب کے اخلاق کا ایک اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام ''شخصی آزادی کی بحالی'' ہے۔ لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے، آنحضرت ﷺ نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گزرا کہ ((کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ)) ''تم میں ہر شخص سے اس کے زیر ذمہ داری لوگوں کی نسبت باز پرس ہوگی'' [2] قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے، تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف، لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا۔ بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارے آباد تھی۔ وہ حیلہ کر کے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی۔ اس موقع پر اس آبادی میں تین گروہ ہو گئے۔ ایک وہ جو اس گناہ کا اعلانیہ مرتکب ہوتا تھا، دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کو سمجھاتا تھا، تیسرا وہ جو گو اس فعل میں شریک نہ تھا لیکن ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا بلکہ خود سمجھانے والوں سے کہتا تھا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جن کو اللہ تعالیٰ ان کے اس جرم کی پاداش میں ہلاک کرنیوالا ہے؟ لیکن ان پر جب عذاب الٰہی آیا تو صرف دوسرا گروہ بچ گیا جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا۔ بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہو گیا، پہلا تو اپنے گناہ کی بدولت اور دوسرا اپنے فرضِ تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے، سورۂ اعراف کے بیسویں رکوع میں یہ پورا قصہ مذکور ہے، آخر میں ہے:

﴿ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ

---

[1] سفر تکوین: ٤-٩۔ [2] بخاری، کتاب النکاح، باب المراۃ راعیہ فی بیت زوجھا: ٥٢٠٠۔

﴿ وَاَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِیْسٍ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴾

(۷/ الاعراف: ۱۶۴۔۱۶۵)

''اور جب ان میں سے ایک فرقہ بولا کہ تم کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جن کو خدا برباد کرنیوالا یا سزا دینے والا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تمہارے رب کے آگے اپنے سے الزام اتارنے کے لیے ان کو نصیحت کرتے ہیں اور شاید کہ یہ نیک بن جائیں تو جب وہ بھول گئے جو ان کو سمجھایا گیا تھا تو ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے بچالیا اور گناہگاروں کو ان کی بے حکمی کے سبب بڑے عذاب میں پکڑا۔''

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گناہگار ہے جیسا وہ جو اس فعل کا مرتکب ہوا، البتہ بھائی کا فرض اس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے، زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہیں اور اس کا کیا بلکہ رسول کا بھی یہ فرض نہیں۔ فرمایا:

﴿ مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۹۹، ۲۴/ النور: ۵۴)

''رسول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے۔''

اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی، اسی لیے سورۂ مائدہ میں فرمایا:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ ۚ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ ﴾

(۵/ المائدۃ: ۱۰۵)

''اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے۔ تم اگر سیدھے راستے پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو پڑھ کر لوگوں سے کہا کہ ''لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی دھوکے میں نہ ڈالیں، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ نہ لیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں''۔ [1] ایک دوسرے صحابی ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے تو جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت ﷺ سے اس کے معنی دریافت کیے تو فرمایا کہ ''نہیں بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جارہی ہے اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے تو اس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے

[1] جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ المائدۃ: ۳۰۵۷۔

جس میں ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے پکڑنا ہے''۔ ❶

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ ''کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟'' ❷ منسوخ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے گی، ان کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ قوموں کے رسوم و آداب اور ایٹی کیٹس اسی اصول پر قائم ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور سے ہر شخص کے پرائیویٹ اور نج کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جن کا نفع ونقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے مگر ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان برائیوں کی برائی نہایت ہلکی ہو کر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان برائیوں کا برا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر جاتی ہے۔ ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا کہ ''بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا کہ جب ان میں برائی پھیلنے لگی تو پہلے تو ان کے علما نے منع کیا لیکن جب وہ نہ رکے تو وہ ان کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے۔ صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے داؤد اور عیسیٰ علیہما السلام کی معرفت ان پر لعنت کی''۔ اس کے بعد آپ ﷺ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا: ''نہیں جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو اور اس کو حق پر نہ جھکا دو''۔ ❸

یہ ہے اس باب میں محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم۔

اس کے چند شرائط

لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل و عامی کا فرض نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ وفساد پیدا کر دے گا۔ یہ حق سب سے اول اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیوں سے بچا ہے۔ قرآن نے کہا:

﴿ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:٤٤)

''کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔''

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمائش، خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کیساتھ کی جائے، خود آنحضرت ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿ ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾ (١٦/ النحل:١٢٥)

❶ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ المائدۃ: ٣٠٥٨۔ ❷ سفر تکوین، ٤۔٩۔

❸ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ المائدۃ: ٣٠٤٨۔

''تو اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بلا۔''

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہہ دیا گیا:

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۴۴)

''تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا۔''

ایک اور جگہ تعلیم دی گئی:

﴿وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا﴾ (۴/ النسآء: ۶۳)

''اور تو ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے دل تک پہنچ جانیوالی بات۔''

یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کی بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

امن وامان کا قائم رکھنا، امام کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوج دارانہ اور زبردستی کے تحکمانہ انتظامات جن کے لیے تنفیذی قوت درکار ہے، صرف حکومت کا فرض ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لیے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے۔

تجسس اور غیبت کی ممانعت

یہ بات کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معائب کی تحقیق وتفتیش کی جس کا نام تجسس اور ٹوہ لگانا ہے، ممانعت کی ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھس کر اس کی حالت وکیفیت کی جستجو کرے، یہاں تک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بن گیا ہے کہ ''محتسب را درون خانہ چہ کار؟''

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقہ اصلاح سے فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جاتا اور کوئی شخص اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ رہتا۔ لیکن اس کی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر میں چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے، جماعت تک اس کا اثر نہیں پہنچتا، اس لیے جماعت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں اور اسی کے ساتھ اور ایک نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شرم وحیا کا جوہر ابھی موجود ہے۔ جو ممکن ہے کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے لیکن اگر لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھتے پھریں تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی بادتند سے اس کے دل کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے۔ اسلام میں کسی گھر یا کمرہ میں بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت ہے اس کی علت بھی یہی

ہے جیسا کہ خود آنحضرت ﷺ نے اس کو ظاہر فرما دیا ہے کہ ((انما الاذن لاجل الرؤیة)) [1] یعنی ''کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لیے ہے کہ وہ اس کو نہ دیکھے۔'' اس سلسلہ میں ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کی جائے یعنی اس کی برائی اس کے پیچھے دوسروں سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس کو جب یہ معلوم ہو تو واعظ و ناصح کی طرف سے اس کو ملال ہو اور اس میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے اور پھر اس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے چنانچہ وحی محمدی ﷺ نے اسی لیے تجسس اور غیبت ان دونوں چیزوں کی قطعی طور پر ممانعت کی، فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۲)

''اے ایمان والو! بہت سارے گمانوں سے بچتے رہو، کہ بے شک بعض گمان گناہ ہے اور نہ کسی کا اندر کا ٹٹولا کرو اور نہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہو۔ بھلا تم میں سے کوئی یہ پسند کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ سو تم کو گھن آئے، اللہ سے ڈرو، بے شبہ اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔''

پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا کہ جس طرح مردہ اپنے اس جسم کی حفاظت نہیں کر سکتا، وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری میں برا کہہ رہے ہو، اپنے الزام کی مدافعت نہیں کر سکتا، اس غیبت کی ایسے قابل نفرت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرتاً گھن آ جائے، اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہو سکتی، اس کی کراہت کی یہ شدت اسی لیے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ اس شخص کی جس کی غیبت کی جائے، اصلاح ہو سکتی ہے اور نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری برملا ظاہر ہو جاتی ہے، جو ایک مسلمان کی شان ایمان کے شایان نہیں، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی ٹوہ لگاتے پھرو گے تو ان کو برباد کر دو گے''۔ [2]

غور کیجیے کہ آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے لطیف نکتے پنہاں ہیں۔

توسط اور اعتدال

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کا دور گزر چکا تھا اور دنیا ایک ایسے مذہب کا

[1] صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب الاستئذان من اجل ...: ۶۲۴۱؛ صحیح مسلم، کتاب الادب، باب تحریم النظر فی بیت غیرہ:۵۶۳۸؛ جامع ترمذی، ابواب الاستئذان، باب من اطلع فی دار قوم ...:۲۷۰۹۔

[2] سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی التجسس: ۴۸۸۸۔

انتظار کر رہی تھی جوان دونوں کا جامع ہو، اسلام دنیا کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آیا اور سلسلۂ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملا دیا۔ عدل وانصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے اور احسان ورفق وملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوش نما بنا دیا ہے، لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جزو بالکل الگ الگ تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت مجسم عدل ہے۔ اس میں احسان ودرگزر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے۔ ❶ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے، ان کی شریعت میں عدل وانصاف کے قائم کرنے کی روح بہت کم پائی جاتی ہے۔ ❷ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت نے دنیا کے لئے عدل وانصاف کے جو اصول قائم کر دیے تھے، اس کے مقابل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں فرمایا:

''تم نے یہ سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ ❸ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا برائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کر دو۔ جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑ لے اس کو چادر بھی دے دو۔ جو شخص تم کو ایک میل تک بیگاری پکڑ لے جائے اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ۔ جو تم سے مانگے اس کو دو، جو تم سے قرض لینا چاہے اس کو واپس نہ کرو۔

تم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ اپنے عزیزوں سے محبت اور اپنے دشمنوں سے بغض رکھو، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو''۔ ❹

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے دنیا سے جو کچھ کہا یا سنا گیا تھا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قانون تھا جو بالکل عدل وانصاف پر مبنی تھا لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک سے سن رہی تھی وہ سراسر اخلاق، رحمت اور احسان تھا لیکن اسلام نے عدل واحسان دونوں میں امتزاج پیدا کر کے دنیا کے نظام حکومت کو کامل تر کر دیا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ﴾ (١٦/ النحل: ٩٠)

''بے شبہ خدا عدل اور احسان (دونوں کا) حکم دیتا ہے۔''

یہ ایک اصولی تعلیم تھی جس نے شریعت موسوی وعیسوی کی دوالگ الگ خصوصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

عدل واحسان

''عدل اور احسان'' کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لیے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے۔ قانون کی بنیاد

---

❶ یہود کی سنگدلی کے سبب سے۔ ❷ یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کے لئے۔

❸ یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے۔ ❹ متی، باب ۵، آیت: ۳۸۔

درحقیقت "عدل" پر ہے۔ "عدل" کے معنی "برابر" کے ہیں، جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے، اس کے ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے۔ یہ "عدل" ہے اور اس کو چھوڑ دینا اور معاف کر دینا اور درگزر کرنا یہ "احسان" ہے، اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں، قانون عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں اس نے دیا ہے یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے اور احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے اور یہ محض شخصی معاملہ ہے۔ قانون عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے۔ اگر اس کو مٹا دیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے اور کسی کی جان و مال و آبرو سلامت نہ رہے۔ اس لیے حکومت کو سرے سے مٹانا جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ میں پیش کر کے ہمیشہ کے لیے توراۃ کے قانون عدل کا خاتمہ کر دیا، کبھی دنیا کے لیے قابل عمل نہیں رہا۔ خود عیسائی سلطنتوں کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کسی قانونِ عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن و امان قائم نہیں رہ سکا اور نہ برائیوں کی روک تھام ہو سکی۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہیں ہوتا بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے، اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پا کر اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے۔ اس لیے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کر دینے کا پورا پورا حق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کر کے جماعت کے ہزاروں لاکھوں افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اس لیے اخلاق کو قانون عدل کی جگہ دینے میں بہت کچھ غور و فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے جو شریعت محمدی ﷺ میں پوری طرح برتی گئی کیونکہ وہ دنیا کی دائمی شریعت بننے والی تھی۔ پھر سب لوگ دنیا میں ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہیں ہوئے۔ بعض نیک، نرم مزاج، صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہیں جن کے لیے معاف کر دینا، درگزر کرنا اور بدلہ نہ لینا آسان ہے اور بعض غصہ ور، سخت مزاج اور تندخو پیدا ہوئے ہیں جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لیے بغیر چین نہیں لے سکتے۔ ان کے لیے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے اور "برائی، برائی کے بقدر" کے اصول پر عمل کرنے کے لیے ان کو رضامند کر لیا جائے۔ اس لیے ایک عالمگیر شریعت کے لیے جو تمام دنیا کی اصلاح کے لیے آئی ہو، عدل اور احسان دونوں اصولوں کی جامعیت کی ضرورت تھی۔

قانون اور اخلاق

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور برائیوں کے انسداد کے لیے دو چیزیں ہیں۔ قانون اور اخلاق اور گو ان دونوں کا منشا ایک ہی ہے مگر ان کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے۔ جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف

سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس کے ذریعہ عدل و انصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیتاً نہیں ہو سکتا، توراۃ محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق، اسی لیے یہ دونوں الگ الگ امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور بدیوں اور برائیوں کے انسداد کے لیے پوری طرح کافی نہیں۔ آنحضرت ﷺ ایک ایسی کامل شریعت لے کر آئے جو عدل و احسان اور قانون و اخلاق دونوں کی جامع ہے۔

اس جامعیت کا اصول، شریعت محمدی میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ اسلام نے ان برائیوں کے انسداد کو جن کا اثر براہ راست دوسروں تک پہنچتا ہے، قانون کے تحت میں رکھا۔ مثلاً: قتل، سرقہ، رہزنی، تہمت لگانا۔ چنانچہ ان جرائم کے لیے قرآن نے سزا مقرر کی ہے جو حکومتِ اسلام کی طرف سے دی جا سکتی ہے اور جو باتیں ایک انسان کی ذاتی تکمیلِ نفس کے متعلق تھیں، ان کو اخلاق کے دائرہ میں رکھا۔ مثلاً: جھوٹ نہ بولنا، رحم کھانا، غریبوں کی امداد وغیرہ۔ اسی طرح شریعتِ محمدی ﷺ اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ قانوناً اس نے ہر مظلوم اور صاحب حق کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے لیکن اس سے بلند تر بات یہ رکھی ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کر دے بلکہ برائی کے بجائے اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے۔ اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانون انتظام وعدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لیے وہ نسل انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشو و نما کی پوری طرح متکفل ہے۔ وہ عدل و انصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگوں کی روحانی تکمیل میں بھی کسی طرح حارج نہیں۔ وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے بلکہ وہ جسم و جان کا مجموعہ اور زندہ و محسوس پیکر ہے۔

عفو اور انتقام

موسوی، عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے، وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے۔ اسلامی قوانین کو پیش نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں۔ لیکن اگر وہ قانون محمدی ﷺ کے ساتھ ساتھ اخلاقِ محمدی کو بھی سامنے رکھتے تو ان کو یہ شبہ

پیش نہ آتا۔ معلوم ہو چکا کہ توراۃ کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے۔ اس کا حکم ہے:

''اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائے گا...... اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے، سو جیسا کرے گا ویسا پائے گا، توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت۔'' (احبار۲۴۔۱۷ خروج ۲۱۔۱۲۔ گنتی ۳۵۔۳۱۔ استثناء ۱۹۔۱۱۔۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے۔ اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے:

''تم سن چکے کہ کہا گیا، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے، دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے۔'' (متی ۵۔۳۸)

لیکن اس سرتاپا روحانی اخلاقیت پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کوئی عیسائی قوم اور عیسائی ملک اس رحیمانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد رسول اللہ ﷺ نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے۔ عدل قانون ہے اور احسان اخلاق ہے، اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں اور ہر جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کیے گئے ہیں اس کی نسبت محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۸)

''اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں برابری کے بدلے کا حکم ہوا، آقا کے بدلے آقا، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت''۔

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے:

﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۷۸)

''تو اگر اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا تو دستور کے مطابق اس کی پیروی کرنا اور نیکی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے، یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہوئی تو جو کوئی (مقتول کے رشتہ داروں میں سے) اس (معافی یا خون بہا لینے) کے بعد پھر زیادتی کرے تو اس کے لیے دکھ کی سزا ہے۔''

ان آیتوں کی بلاغت پر غور کیجئے کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان کھلی دشمنی کے بعد ان کے جذبۂ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کو مقتول کے رشتہ داروں کا بھائی کہہ کر بتایا گیا، ساتھ ہی چونکہ توراۃ

کے حکم میں خون بہا لے کر معافی کی دفعہ نہ تھی اس لیے اس عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا اور قاتل کو نیکی اور احسان کی یاد دلائی گئی اور مقتول کے رشتہ داروں کو معاف کر دینے یا خون بہا لے لینے کے بعد انتقام لینے پر عذابِ الٰہی کا ڈر سنایا گیا، دیکھو کہ اسلام کا حکم توراۃ اور انجیل، قانون اور اخلاق، انتقام اور عفو دونوں کو کس خوبی سے یکجا کرتا ہے۔

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے:

﴿ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۵۔۴۶)

’’اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراۃ میں یہ حکم لکھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں برابر کا بدلہ، تو جس نے بخش دیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جس نے خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کیا تو وہی ظالم ہیں اور ہم نے بنی اسرائیل کے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا تھا اور اس کو انجیل دی جس میں راہنمائی اور روشنی ہے اور جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتی ہے اور جو پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور وعظ و نصیحت ہے۔‘‘

② یہ فوجداری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانون و اخلاقی احکام تھے۔ مالی معاملات کے متعلق بھی اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کو پیش نظر رکھتا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۹)

’’اور اگر تم سود سے باز آ گئے تو تمہارا وہی حق ہے جو اصل سرمایہ تم نے دیا تھا۔‘‘

یہ تو قانون تھا، اب اخلاق دیکھئے:

﴿ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۸۰)

’’اور اگر قرضدار تنگ دست ہو تو اس کو اس وقت تک مہلت ہے جب تک اس کو کشائش ہو اور بالکل معاف کر دینا تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے اگر تم کو سمجھ ہے۔‘‘

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے بھی اس جامعیت کو قائم رکھا ہے، فرمایا:

﴿ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾

(۱۶/ النحل:۱۲٦)

''اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف تم کو دی گئی ہے اور اگر صبر کر لو تو یہ صبر کرنیوالوں کے لیے بہت بہتر ہے۔''

اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۳۹۔۴۰)

''اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو، تب وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے تو اگر معاف کر دیا اور نیکی کی تو اس کا ثواب دینا خدا پر ہے۔ وہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔''

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان از خود کسی پر ظلم کرنے میں پہل اور سبقت نہ کریں لیکن اگر کوئی ان پر ظلم کرے تو وہ اس ظلم کا قانوناً اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہیں جتنا ان پر کیا گیا۔ کیونکہ قانون یہی ہے کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے جیسا کہ تورات میں بیان ہوا ہے لیکن اگر کوئی مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کر دے اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس برائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلائی بھی کرے (وَاَصْلَحَ) تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملے گا اور بلاغت یہ ہے کہ اس صابر مظلوم کی تسکین کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے۔

الغرض عفو اور انتقام میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا، دنیا کی جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے۔ اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ملک میں امن وامان رہ سکتا ہے اور نہ افراد کے بڑے حصہ کو برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے۔ حالانکہ وہی ایک سچے مذہب کا مطلوب ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظام ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ ایک ایسی تعلیم کو لیکر آئے، جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے۔ اس نے یہ کہا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں دے دیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجرا میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے چھوٹے، امیر وغریب اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق کیا جائے، تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے۔ دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ بتایا تاکہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے۔

جماعتی انتظامات کے قیام کے لیے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجرا کے وقت حکم ہوتا ہے:

﴿ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾

(۲۴/ النور:۲)

''اور تم کو اللہ کے حکم چلانے میں ان دونوں گناہگاروں پر ترس نہ آئے۔ اگر تم کو خدا پر اور قیامت پر ایمان ہے۔''

یعنی اس گناہ کی جو سزا خدا کے ہاں ہے اور جو قیامت میں ہوگی، وہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگی، اس لیے اس گناہ کی سزا دنیا میں ہی دے دینا درحقیقت اپنے گناہگار بھائی پر احسان کرنا ہے۔ اس لیے اس سزا کے دینے میں نرمی نہ کی جائے۔

کسی سزا کے جاری کرنے میں اونچے نیچے اور امیر و غریب کے فرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم میں گرفتار ہوئی اور قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دی جائے اور اس کے لیے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سفارشیں پہنچائی گئیں تو فرمایا: ''اے لوگو! تم سے پہلے قومیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے۔ خدا کی قسم! اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹتا۔'' [1]

دوسری طرف عفو کا یہ حال ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا۔ الا یہ کہ اس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا ہے۔ [2] تو اس کو (قانوناً) سزا ملی ہو''۔ یہ عمل تھا۔ تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''میں نے آپ ﷺ کی خدمت میں قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہیں دیکھا لیکن یہ کہ اس میں آپ نے معاف اور درگزر کرنے کا مشورہ دیا'' [3] یعنی قصاص کے بجائے بالکل معافی یا دیت (زرتاوان یا خون بہا) لے کر معاف کر دینے کو فرمایا۔ معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہ سے فرمایا: ''آپس میں گناہوں کو معاف کر دیا کرو لیکن مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچے گا تو سزا ضروری ہو جائے گی'' [4] یعنی جب مرافعہ اور استغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہو جائے گا تو پھر سزا ہونا واجب ہے، تاکہ حکومت کا رعب دلوں پر قائم رہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک چادر اوڑھے سو رہے تھے۔ ایک شخص نے چپکے سے چادر اتار لی، وہ پکڑا گیا اور عدالت نبوی ﷺ میں پیش کیا گیا، آپ ﷺ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ جن صاحب کی چادر تھی انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! کیا تیس

---

[1] صحيح بخاری، كتاب الحدود، باب كراهية الشفاعة فى الحد:٦٧٨٨۔ [2] ايضًا، باب اقامة الحدود والانتقام لحرمات الله: ٦٧٨٦۔ [3] ابوداود، كتاب الديات، باب الامام يأمر بالعفو فى الدم: ٤٤٩٧؛ نسائی، كتاب الديات، باب الامر بالعفو عن القصاص: ٤٧٨٧، ٤٧٨٨۔

[4] ابو داود، كتاب الحدود، باب يعفى عن الحدود ما لم تبلغ السلطان: ٤٣٧٦۔

درہم کی ایک چادر کے لیے ایک انسان کا ہاتھ کاٹا جائے گا، میں یہ چادر اس کے ہاتھ ادھار فروخت کر دیتا ہوں۔ فرمایا کہ ''میرے پاس لانے سے پہلے یہ کیوں نہیں کر لیا۔'' [1] یہ تو اس عفو کا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے اور اس لحاظ سے قانونِ محمدی ﷺ، موجودہ سلطنتوں کے قوانین سے زیادہ نرم ہے، زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے، لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام میں اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

عفو و درگزر کی تعلیم

اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار ترین تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گزرتی ہے، وہ عفو، درگزر، ضبطِ نفس، تحمل اور برداشت کی ہے لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے، سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے اور خدائے تعالیٰ کی توحید اور عظمت و جلالت کا کتنا اعلیٰ اور ناقابل تبدیل تصور اس نے پیش کیا ہے، جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے، تاہم مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ ''تم مشرکوں کے بتوں کو برا بھلا نہ کہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ چڑ میں تمہارے خدا کو برا کہہ بیٹھیں۔''

﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾

(٦/ الانعام:١٠٨)

''اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ وہ اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ برا کہہ بیٹھیں۔''

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے۔ پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم و ستم اور گالی گلوچ پر صبر کرو اور ان کو معاف کرو اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانوں کو ہو رہا ہے:

﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (٧/ الاعراف:١٩٩۔٢٠٠)

''معاف کرنے کی خو پکڑ اور نیک کام کو کہہ اور جاہلوں سے کنارہ کر اور اگر تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ ابھار دے (یعنی غصہ آ جائے) تو خدا کی پناہ پکڑ وہ ہے سنتا جانتا۔''

سکون کی حالت میں عفو و درگزر آسان ہے، مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ میں بھی بے قابو نہ ہونے پائے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعریف میں فرمایا:

[1] ابو داود، کتاب الحدود، باب فی من سرق من حرز: ٤٣٩٤۔

﴿ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٣٧)

''اور جب غصہ آئے جب بھی وہ معاف کر دیتے ہیں۔''

نیکو کاروں کی تعریف میں ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا خدا کا پیارا بننے کا ذریعہ ہے:

﴿ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾

(٣/ آل عمران: ١٣٤)

''اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بہت بڑی بلند ہمتی کا کام ہے۔ فرمایا:

﴿ وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾ (٤٢/ اسوریٰ:٤٣)

''اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف کیا تو وہ بے شک ہمت کے کام ہیں۔''

اس برداشت اور عفو کو وحی محمدی ﷺ نے اپنے الفاظ میں ''عزم'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو خاص انبیا علیہم السلام اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے۔ فرمایا:

﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ (٤٦/ الاحقاف:٣٥)

''اور برداشت کر، جس طرح ہمت اور عزم والے پیغمبروں نے برداشت کیا۔''

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہیے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔ فرمایا:

﴿ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾

(٣١/ لقمان:١٧)

''اچھی بات بتا اور بری بات سے روک اور جو تجھ پر پڑے اس کو سہار لے کہ یہ ہمت کے کام ہیں۔''

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں کو اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے۔ فرمایا:

﴿ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾ (٣/ آل عمران:١٨٦)

''اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑے ہمت کے کام ہیں۔''

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگزر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام بلکہ خدا

کی محبوبی کا سبب بتایا گیا اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ حسب ذیل آیت میں ایمان والوں کو دشمنوں کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ ﴾ (٤٥/ الجاثية: ١٤)

''(اے پیغمبر!) ایمان والوں سے کہہ دو کہ ان کو جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے، معاف کریں۔''

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو امید نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی کافر ہیں جو کافر و مشرک ہیں اب دیکھئے کہ کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید بیزاری ہے اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ان کو معاف کریں اور ان کی خطاؤں سے درگزر کریں، کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے؟ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عفو و درگزر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر ان کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے:

﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴾

(٤/ النسآء: ١٤٩)

''اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرو یا چھپا کر کرو یا کسی برائی کو معاف کرو (تو یہ مسلمان کی شان ہے) کیونکہ خدا معاف کرنے والا، قدرت والا ہے۔''

یعنی جب گنہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہیے اور اس تعلیم میں قرآن پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ تمہارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی و درماندگی ظاہر ہے اس کو تو بہر حال معاف ہی کرنا چاہیے، اسی کے قریب قریب یہ آیت پاک بھی ہے:

﴿ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

(٢٤/ النور: ٢٢)

''اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

یعنی تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تم کو معاف کرے گا اس میں عفو و درگزر کی کتنی عظیم الشان ترغیب ہے۔

برائی کی جگہ نیکی

عفو و درگزر کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو برائی کرے، نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کرو، بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو اور جو عداوت رکھے اس کے ساتھ حسن سلوک کرو، اس تعلیم ربانی پر عمل کرنے

والوں کا نام خدا نے صابر اور ذُو حَظٍّ عَظِیْمٍ یعنی ''بڑا خوش قسمت'' رکھا ہے اور بتایا ہے کہ دشمن کو دوست بنا لینے کی یہ بہترین تدبیر ہے۔ فرمایا:

﴿ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝ ﴾

(۴۱/ حٰمٓ السجدة:۳۵۔۳۶)

''نیکی اور بدی برابر نہیں، تو برائی کا جواب بہتری سے دے پھر دیکھ کہ وہ جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسا ناتے دار دوست اور یہ بات انہی کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت (صبر) رکھتے ہیں اور جس کی بڑی قسمت ہے۔''

اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے ''بڑی خوش قسمتی'' سے تعبیر کیا ہے، اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ پھر دوسری جگہ فرمایا مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برا نہ مانو۔ کیونکہ دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی بے جا حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے، اگر ایسا موقع پیش آئے تو خدا سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ شیطان کے پھندے سے بچالے اور غصہ سے محفوظ رکھے:

﴿ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ ۝ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَن يَحْضُرُونِ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۹۶۔۹۸)

''مشرکوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دے، ہم جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور کہہ کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کی چھیڑ سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے رب! اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔''

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور عفو کا ذکر فرمایا ہے اور ان کاموں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے۔ مگر تمام مذکورہ بالا نیکیوں میں سے دوبارہ صرف صبر ہی کو خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ جَنَّاتُ عَدْنٍ ﴾

(۱۳/ الرعد:۲۱۔۲۳)

''جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم ان کو اللہ نے دیا ہے (یعنی ایک دوسرے کا حق) اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور حساب کے برے انجام سے خوف کھاتے ہیں اور جو

اپنے پروردگار کی خوشی کے لیے صبر کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہیں اور برائی کے بدلہ بھلائی کرتے ہیں، انہی کے لیے ہے پچھلا گھر، ہمیشہ رہنے کے باغ۔''

ان سے کہا جائیگا: ﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (۱۳/ الرعد: ۲۴) ''تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے میں کہ تم نے صبر کیا، سو خوب ملا پچھلا گھر۔'' آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارت غیبی میں نہ تو نماز کا ذکر ہے نہ خیرات کا اور نہ خوف خدا کا۔ صرف ایک صبر کی جزا کی خوش خبری ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ برائی کے بدلہ نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے کہ نماز اور زکوۃ جیسے فرائض کے پہلو بہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ ایک اور آیت میں نومسلم یہودیوں کو اپنے برخلاف اپنی ہم قوموں سے جو دل آزار فقرے اور اعتراضات سننے پڑتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ برائی کی جگہ بھلائی کرتے ہیں:

﴿ أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ ۝﴾ (۲۸/ القصص: ۵۴-۵۵)

''وہ لوگ صبر کے سبب سے اپنا حق دہرا پائیں گے اور وہ برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں اور ہمارا دیا کچھ خیرات کرتے ہیں اور جب کوئی نکمی بات سنتے ہیں تو اس سے درگزر کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے کام ہیں اور تمہارے لیے تمہارے کام، سلامت رہو، ہم کو بے سمجھوں سے مطلب نہیں۔''

ان آیتوں کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجئے۔ نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں بلکہ ان کے حق میں سلامتی کی دعائے خیر بھی کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''قرابت کا حق ادا کرنے والا وہ نہیں ہے جو احسان کے بدلہ میں احسان کرتا ہو بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو۔'' [1] ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر عرض کی کہ اے خدا کے پیغمبر ﷺ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ میں تو سلوک کرتا ہوں مگر وہ بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں۔ میں حلم اور بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ میں مٹی بھر رہے ہو، یعنی نیکی کے لقمہ سے ان کا منہ بند کر رہے ہو اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے، خدا کی مدد شامل رہے گی۔'' [2] حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافی: ۵۹۹۱۔

[2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب صلة الرحم: ۶۵۲۵؛ احمد، ۲/ ۳۰۰۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو، تم کہتے ہو کہ اگر لوگ تیرے ساتھ بھلائی کریں گے تو ہم بھی کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے، یہ نہیں بلکہ اپنے کو پرسکون اور مطمئن رکھو۔ لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں تو بھلائی کرو اور اگر برائی کریں تو بھی ظلم نہ کرو''۔ [1]

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں، جھوٹے وعدوں، خیانت کارانہ معاہدوں اور پرفریب صلحوں سے دھوکا دیا کرتے تھے ان کے متعلق بھی آنحضرت ﷺ کو یہی ہدایت ہوئی:

﴿ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۳)

''اور ان میں سے چند کے سوا اوروں کی کسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا رہتا ہے تو تو ان کو معاف کر اور ان کے قصور سے درگزر کر کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کار قوم کو بھی معاف کرنا اور ان کے قصوروں سے درگزر کرنا، اسلام میں وہ نیکی ہے جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنیوالوں کو اپنے پیار اور محبت کی خوش خبری دیتا ہے۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہو گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم اس باب میں کس قدر اہم اور کامل ہے۔

[1] جامع ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ما جاء فی الاحسان والعفو: ۲۰۰۷ (غریب)۔

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ

تمدن کے زمانہ میں نظامِ حکومت میں جو ترقیاں ہو جاتی ہیں، ان کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ تمدن اصول قانون میں کوئی جدید اضافہ کر دیتا ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدنی نظام حکومت میں قانون کے نفاذ میں ان وسیع اور ہمہ گیر دفعات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، جو اس کے اثر کو اس قدر عام کر دیتا ہے کہ دنیا کا ایک ذرّہ بھی ان کے حدود سے باہر نہیں جا سکتا، لیکن وحشت کے زمانہ میں صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے اور گردوپیش اور اطراف و جوانب کے حالات پر نظر نہیں کی جاتی، ہر سلطنت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدن سلطنت بھی ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب حکومت کی ہم پلہ ہے، لیکن اس جرم کے کلی استیصال کے لیے اسی قدر کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا استیصال صرف اس وقت ہو سکتا ہے، جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دیے جائیں جو اس جرم میں اعانت کرتے ہیں، موقعِ واردات کا سراغ دیتے ہیں، مال مسروقہ کو بیچتے یا خریدتے ہیں، وغیرہ وغیرہ بہر حال تمدنی نظام حکومت کو ایک غیر متمدن سلطنت پر جو ترجیح و امتیاز ہے، وہ صرف اس بنا پر ہے کہ تمدن نے اس کے اصول و آئین کو نہایت وسیع اور عام کر دیا ہے اور وحشیانہ نظام حکومت میں یہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں پائی جاتی، تمدن کے زمانہ میں انسانی ضروریات میں جو غیر محدود اضافہ ہو جاتا ہے اس کا راز بھی تمدن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمر ہے۔

تفصیل اور ہمہ گیری

مذہب بھی ایک عظیم الشان روحانی سلطنت ہے اور جس اصول کی بنا پر ایک دنیوی حکومت کو دوسری حکومت پر ترجیح دی جا سکتی ہے، اسی کو مختلف مذاہب کے موازنہ و مقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جا سکتا ہے، مثلاً: اصولِ شریعت میں دنیا کے اکثر مذاہب میں اشتراک واتحاد پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے عقائد میں، اعمال میں، عبادات میں، معاملات میں، اخلاق میں، جو چیزیں ناجائز اور مصلحتِ عامہ کے مخالف تھیں، ان کی سرسری طور سے سب نے ممانعت کی اور جو چیزیں جائز اور مصالح عامہ کے موافق تھیں، ان کی ترغیب دی، لیکن امرونہی کے طریقے اور ان کی جزئیات کے احاطہ میں کمی و بیشی ہے اور اسی نے ان مذاہب کے احکام و شرائع میں باہم امتیاز پیدا کر دیا ہے، اس بنا پر جس طرح اس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے، جس سے برائیوں کا تمام تر سدّباب ہوتا ہے اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کر لیا گیا ہو، اسی طرح بہترین اخلاقی تعلیم وہ ہے، جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصا کیا ہو اور عام انسانوں کے لیے کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کر دیا ہو اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کر دیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے، اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے، اس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل، ہمہ گیری اور انضباط ہے، یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا

ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہو گئے ہیں، اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اور اجمالی تشریح کی ہے، مثلاً: توحید تمام مذاہب کا امّ الاصول ہے لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعیین نہیں کی، اس بنا پر ہر مذہب میں شرک کسی نہ کسی صورت میں شامل ہو گیا، صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے شرک کے تمام علل واسباب اور عواقب ونتائج کی تحدید کی اور ان کا کلی استیصال کیا، شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا، اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دی جاتی اور عرب کے تمام بت توڑ دیے جاتے، لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا جو ان بتوں کی یاد کو تازہ کر سکتی تھیں، تصویر بجائے خود کوئی بری چیز نہ تھی، تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی، اس لیے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا، کسی کی مدح میں غلو و اغراق اگرچہ ایک قسم کی بداخلاقی ہے، تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور ان کے نفوذ و طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہو سکتا ہے، اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت کے لیے اس سے کام لے سکتا تھا، تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی ہے، جس نے امم قدیمہ میں شرک کی صورت اختیار کر لی تھی، اس لیے آنحضرت ﷺ نے برسرِ منبر سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی:

((لا تطرونی کما اطرت النصاری ابن مریم فانما انا عبده فقولوا عبدالله ورسوله)) [1]

''میری شان میں مبالغہ نہ کرو، جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم کی شان میں کیا میں تو اللہ کا بندہ ہوں، تو کہو کہ اللہ کا بندہ اور رسول۔''

یہ ایک کلی حکم تھا اور آنحضرت ﷺ نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی، اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو بتا بتا کر اس کی بیخ کنی کی، یہی حال عبادات کا بھی ہے، اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا اور یہی روش اس کے اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے، اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیروؤں کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا اور کوئی بات سوال و جواب کے لیے باقی نہیں رکھی، یہی معنی اس تکمیل کے ہیں، جس کے لیے آپ کی بعثت ہوئی۔

آنحضرت ﷺ نے اخلاق کی تکمیل، تین حیثیتوں سے فرمائی ہے:

① تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ۔

② ہر برائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول الله تعالیٰ: ﴿واذكر فى الكتاب مريم...﴾ ٣٤٤٥۔

③ نرمی وگرمی، عاجزی وبلند ہمتی دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل اوران کے مواقع کی تحدید۔

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ

یہودی وعیسائی اور دوسرے اخلاقی معلمین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈال لینا، اس راز کو فاش کر دے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نے نہیں کیا ہے، بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنالی گئی ہے اوران میں سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دے کران کو ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت احکام عشرہ کی ہے، یعنی وہ دس احکام جو بنی اسرائیل کو کوہِ سینا کے دامن میں سنائے گئے تھے، ان دس احکام میں سے پہلا حکم توحید، دوسرا تصویر اور مجسمہ بنانے کی ممانعت، تیسرا اللہ کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت اور چوتھا سبت کے دن آرام کرنے کی ہدایت پر مشتمل ہے، باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہیں، جو حسب ذیل ہیں: (دیکھو خروج باب ۲۰ آیت: ۱۲ تا ۳۰)

تورات کے اخلاقی احکام

① تو اپنے ماں اور باپ کو عزت دے۔

② تو خون مت کر۔

③ تو زنا مت کر۔

④ تو چوری مت کر۔

⑤ تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔

⑥ تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر۔

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے، اس کے بعد خروج باب ۲۲ اور ۲۳ میں قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتیں اور آ گئی ہیں، یعنی مسافر، بیوہ اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم اور جھوٹی گواہی کی ممانعت، پھر احبار باب ۱۹ میں انہی احکام کی حسب ذیل مزید تفصیل ہے:

① تم میں سے ہر شخص اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا رہے۔

② تم چوری نہ کرو، نہ جھوٹا معاملہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو۔

③ تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔

④ تو اپنے پڑوسی سے دغا بازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے، تو مزدور کی مزدوری چاہیے کہ ساری رات صبح تک تیرے پاس نہ رہ جائے۔

⑤ تو بہرے کومت کوس، تو وہ چیز جس سے اندھے کوٹھوکر لگے، اندھے کے آگے مت رکھ۔

⑥ تو حکومت میں بے انصافی نہ کر، غریب وامیر کو نہ دیکھ، بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر۔

⑦ تو عیب جوؤں کے مانند اپنی قوم میں آیا جایا نہ کر اور اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ۔

⑧ تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل میں نہ رکھ۔

⑨ تو اپنی قوم کے فرزندوں سے بدلہ مت لے اور نہ ان کی طرف سے کینہ رکھ۔

⑩ تو اس کے آگے جس کا سر سفید ہے، اٹھ کھڑا ہو اور بوڑھے مرد کو عزت دے۔

⑪ اگر کوئی مسافر تمہاری زمین پر تمہارے ساتھ سکونت کرے، تم اس کو مت ستاؤ، بلکہ مسافر کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے، ایسا جانو جیسے وہ تم میں پیدا ہوا ہے، بلکہ تم اس کو ایسا پیار کرو، جیسا آپ کو کرتے ہو۔

⑫ تم حکومت کرنے میں، پیمائش کرنے میں، تولنے میں، ناپنے میں بے انصافی نہ کرو۔

انجیل کے اخلاقی احکام

انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی تفصیل بھی نہیں کی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد درحقیقت بنی اسرائیل کی رسم پرستی اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنی اور روح کی طرف دعوت تھی، یہ حقیقت جس طرح احکام میں نظر آتی ہے، اخلاق میں بھی جھلکتی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی تجدید و اصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توراۃ، حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور، حضرت سلیمان علیہ السلام کے امثال اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں میں جو خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھیں اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے، ان کو یک جا اپنے مشہور وعظ میں ان کے سامنے پیش کیا، اس مشہور اخلاقی وعظ میں بہ ترتیب حسب ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں۔ دل کی غریبی، غمگینی، حلم و بردباری، راست بازی، رحم دلی، پاک دلی، صلح جوئی، صبر، عفو و درگزر، پاک دامنی، قسم کھانے کی ممانعت، ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، قرض معاف کرنا، دشمنوں کو پیار کرنا، ریا کی ممانعت، توکل، عیب نہ لگانا، جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں، ایسا تم بھی ان کے ساتھ کرو۔ یہ اخلاقی تعلیمات بیشتر انہی لفظوں کے ساتھ جو انجیل میں ہیں، بنی اسرائیل کے مختلف صحیفوں میں مذکور ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خاص طور سے ان اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود ان میں اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور لفظی شریعت کے اصل روح و معنی کو جلوہ گر کرنا تھا۔

اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصا

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہیں، اس لیے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا اس کو صرف ایک قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ تمام قوموں اور

زمانوں تک وسیع کیا گیا، اس لیے تمام قوموں اور زمانوں میں جو برائیاں پائی جاتیں یا پائی جانے والی تھیں، ان سب کو استقصا کر کے منع کیا گیا اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن کو بھی کھول کر بیان کیا گیا اور ان کے حصول کی تاکید کی گئی، گزشتہ صحیفوں میں جن برائیوں سے روکا گیا تھا، یا جن نیکیوں کی تعلیم دی گئی تھی، آنحضرت ﷺ کی وحی مبارک نے ان کی تمام جزئیات کا استقصا کیا اور ان کے گوشہ گوشہ کو کھول کر روشن کر دیا، ذیل میں ہم ان اخلاقی تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہیں، جن کی تعلیم یا ممانعت قرآن پاک نے کی ہے۔

قرآنی اخلاق کی فہرست

سچ بولنا، جھوٹ کی برائی، علم بے عمل کی مذمت، عام عفو و درگزر، توکل، صبر، شکر، حق پر استقامت، اللہ کی راہ میں جان دینا، سخاوت اور خیرات کا حکم، بخل کی برائی، اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت، میانہ روی کی تاکید، عزیزوں، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی، مسافروں، سائلوں اور غریبوں کی امداد، غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان، فخر و غرور کی برائی، امانت داری، وعدہ کا ایفا کرنا، عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کا لحاظ رکھنا، صدقہ و خیرات، نیکی اور بھلائی کی بات کرنا، آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو برا بھلا نہ کہنا، کسی کو نہ چڑانا، نہ برے ناموں سے یاد کرنا، والدین کی خدمت اور اطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا، حق گوئی، انصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا دل کی گناہگاری پر اثر، نرمی سے بات کرنا، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، صلح جوئی، اتحاد و اتفاق، ایمانی برادری، انسانی برادری، اکل حلال، روزی خود حاصل کرنا، تجارت کرنا، گداگری کی ممانعت، لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور بری بات سے روکنا، اولاد کشی، خودکشی اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت، یتیم کی کفالت، اس کے مال و جائیداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت، ناپ اور تول میں بے ایمانی نہ کرنا، ملک میں فساد برپا نہ کرنا، بے شرمی کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت، آنکھیں نیچی رکھنا، کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا، ستر اور حجاب، خیانت کی برائی، آنکھ، کان اور دل کی باز پرس، نیکی کے کام کرنا، لغو سے اعراض، امانت اور عہد کی رعایت، ایثار، تحمل، دوسروں کو معاف کرنا، دشمنوں سے درگزر، بدی کے بدلہ نیکی کرنا، غصہ کی برائی، مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو میں آداب کا لحاظ، مشرکوں کے بتوں تک کو برا نہ کہنا، فیصلہ میں عدل و انصاف، دشمنوں تک سے عدل و انصاف، صدقہ و خیرات کے بعد لوگوں پر احسان دھرنے کی برائی، اُلاہنے کی مذمت، فسق و فجور سے نفرت، چوری، ڈاکہ، رہزنی اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت، دل کا تقویٰ اور پاکیزگی، پاکبازی جتانے کی برائی، رفتار میں وقار و متانت، مجالس میں حسنِ اخلاق، ضعیفوں، کمزوروں اور عورتوں کے ساتھ نیکی، شوہر کی اطاعت، بیوی کا حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی

برائی، چغل خوری، طعنہ زنی اور تہمت دھرنے کی ممانعت، جسم و جان اور کپڑوں کی پاکیزگی اور طہارت، شرم گاہوں کی ستر پوشی، سائل کو نہ جھڑکنا، یتیم کو نہ دبانا، اللہ کی نعمت کو ظاہر کرنا، غیبت نہ کرنا، بدگمانی نہ کرنا، سب پر رحم کرنا، ریا اور نمائش کی ناپسندیدگی، قرض دینا، قرض معاف کرنا، سود اور رشوت کی ممانعت، ثبات قدم، استقلال اور شجاعت و بہادری کی خوبی، لڑائی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی برائی، شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت، بھوکوں کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز، بے غرض نیکی کرنا، مال و دولت سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگوں سے بے رخی نہ کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہمائش، معاملات میں سچائی اور دیانتداری۔

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست

یہ وہ تعلیمات ہیں، جن کا ماخذ قرآن پاک ہے، ان کے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت ﷺ کے ان اقوال میں ہے جو ان کی تفسیر وتشریح میں احادیث میں مذکور ہیں، ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے، آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ کے بڑی تقطیع کے ۱۸۷ صفحوں میں ہیں جن میں سے ہر صفحہ میں ۳۷ سطریں ہیں اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نو سو چھ حدیثیں ہیں، جو ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات میں منقسم ہیں، ان میں سے بعض مکرر باتیں بھی ہیں تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات و حالات کا کوئی ایسا جز نہ ہوگا جو داعی اسلام ﷺ کی تلقینات کی فہرست سے رہ گیا ہو اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ پڑی ہو، ہم ذیل میں آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں، جو صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں۔ صلہ رحمی، ماں باپ کے ساتھ سلوک، بچوں سے محبت، چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت، اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا، ہمسایوں کے ساتھ سلوک، غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا، اہل و عیال کی پرورش، یتیموں کی پرورش، بیوہ کی خبر گیری، حاجت مندوں کی امداد، اندھوں کی دست گیری، عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی، قرض داروں پر احسان، فریادیوں کی فریاد رسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں کی خیر خواہی، جانوروں پر شفقت اور رحم، محسنوں کی شکر گزاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیماروں کی خدمت و عیادت، رشک و حسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت و بہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی برائی، امیر و امام کی اطاعت، مداومت عمل، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، شیریں کلامی، خوش خلقی، فیاضی، بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم و حیا، حلم و وقار، غصہ کو ضبط کرنا، عفو و درگزر، صبر و تحمل، حسب و نسب پر فخاری کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل ہونا، دوسروں کے گھر جا کر ادھر ادھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کے لیے پیٹھ پیچھے دعا کرنا، رفق و نرمی، قناعت اور

استغنا، گداگری کی ممانعت، اپنے گناہوں کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا، چغل خوری کی ممانعت، تہمت لگانے کی برائی، غیبت کی ممانعت، بغض و کینہ کی ممانعت، دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت، راز داری، تواضع و خاکساری، امانت داری، گالی کی ممانعت، منہ پر مدح و ستائش کی ممانعت، لعنت کرنے کی ممانعت، بخل کی ممانعت، فضول گوئی کی ممانعت، فضول خرچی کی ممانعت، کبر و غرور کی مذمت، ہنسی مذاق کی برائی، نفس انسانی کا احترام، ظلم کی ممانعت، عدل و انصاف، تعصب کی ممانعت، سخت گیری کی ممانعت، غم خواری و غم گساری، توکل، لالچ کی برائی، رضا بالقضاء، ماتم کی ممانعت، قمار بازی کی ممانعت، سچائی کی ہدایت اور جھوٹ کی ممانعت، جھوٹی گواہی کی ممانعت، جھگڑا فساد کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرانا، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے، منافقت اور دورخی چال کی مذمت، وعدہ خلافی کی ممانعت، خیانت اور فریب کی ممانعت، شراب خوری، زنا کاری اور چوری کی ممانعت، طہارت و صفائی، دوست و احباب کی ملاقات، سلام و تحیت، مصافحہ و معانقہ، دیگر آدابِ ملاقات، آدابِ مجلس، آدابِ طعام، آدابِ لباس، آدابِ نشست و برخاست، خانہ داری کے آداب، سونے جاگنے کے آداب، عورتوں کے متعلق خاص آداب و اخلاق و سلوک کے احکام۔

ان تفصیلات سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے۔

اخلاقی جزئیات کا استقصا

انسان بڑا بہانہ جو اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے، اس کے لیے اخلاقیات کے صرف کلی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کے سایہ میں پناہ لے اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کر لے، اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا بد اخلاقی کے ایک ایک جزئیہ کا استقصا کیا جائے اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے اور اس کی تہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچا جائے، اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے اور ان کے متعلق صریح احکام دیے جائیں، آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے، اس کی توضیح کے لیے امر و نہی دونوں کی ایک ایک دو دو مثالیں کافی ہوں گی۔

صدقہ و خیرات تمام مذہبوں میں ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیا ہے، لیکن توراۃ نے اس کو صرف عشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے، ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اس میں نہیں ملتا، انجیل نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھا ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے اور ہر ایک کے ایک ایک جزو کی تفصیل کر دی، توراۃ میں یہ مبہم تھا، کہ کتنے غلہ یا سونے چاندی کے مالک پر عشر یا زکوٰۃ فرض اور کن کن چیزوں میں فرض ہے، شریعت محمدی ﷺ نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد اور زمانہ کی

پوری پوری تعیین کردی، وہ اجناس مقرر کر دیے جن میں عشر یا زکوۃ واجب ہے، ان کی تحصیل کا طریقہ بتا دیا، ان کے اخراجات اور مصارف کی نوعیتوں کی تشریح کر دی، اس نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا کر خود مفلس اور کنگال بن جاؤ بلکہ یہ کہا:

﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ﴾ (۲/ البقرة:۲۱۹)

''لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، کہہ دے کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔''

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر تھوڑی تکلیف اٹھا کر، دوسروں کی حاجت پوری کرو، تو یہ تمہارے کمالِ خلق کی دلیل ہے، انصار جنہوں نے خود تکلیفیں اٹھا کر مہاجرین کی مصیبتیں دور کیں، ان کی تعریف میں اللہ نے فرمایا:

﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ﴾ (۵۹/ الحشر۔ ۹)

''وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود ان کو حاجت ہو۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدح میں فرمایا:

﴿ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝﴾ (۷۶/ الدهر:۸)

''خود کھانے کی خواہش کے باوجود مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔''

قرآن پاک سراپا انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے۔

اکثر لوگ وہ چیز اللہ کی راہ میں دوسروں کو دیتے ہیں، جو سڑی، گلی، خراب اور نکمی ہو، قرآن پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے تزکیہ اور صفائی کے بجائے جو اس خیرات کا مقصد ہے، نفس کی اور دنایت اور آلودگی ظاہر کرتا ہے، فرمایا:

﴿ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝﴾

(۳/ آل عمران:۹۲)

''تم ہرگز پوری نیکی کو نہ پاؤ گے، جب تک اس میں سے تم نہ خرچ کرو، جو تم کو محبوب ہے اور جو بھی تم خرچ کرو، اللہ کو اس کا علم ہے''

پھر فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝﴾ (۲/ البقرة:۲٦۷)

''اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو، اس میں کی اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے لیے زمین

سے نکالتے ہیں، اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دو اور اس میں سے خراب چیز دینے کا قصد بھی نہ کرو کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے تو نہ لو، مگر یہ کہ چشم پوشی کر لو اور یقین کرو کہ اللہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے۔''

اس آیت پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو، کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ ''وہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے۔'' یعنی اس نے اپنے بندوں کو مال کے بہترین حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی، اس کا یہ سبب نہیں کہ نعوذ باللہ خود اللہ کو اپنے بندوں کی اچھی چیزوں کی ضرورت ہے، کہ وہ ہماری ہر اچھی سے اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پروا ہے، بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے، اس لیے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے۔ سب سے پہلے تمہاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں، جن کی کفالت کا بار تم پر ہے، اہل وعیال، دست نگر عزیز وقریب، پھر دوسرے محتاج ومسکین اور یتیم اور مسافر۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۱۵)

''لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات کریں، کہہ دے، جو کچھ تم نیکی کا مال خرچ کرو، وہ ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافر کے لیے اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو، اللہ اس سے واقف ہے۔''

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے؟ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا کہ ''ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے۔'' لوگوں نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو، تو فرمایا: ''مزدوری کرے اور جو ملے اس میں کچھ خود کھائے، کچھ محتاجوں کو کھلائے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو، فرمایا: ''تو غم رسیدہ حاجت مند کی کوئی جسمانی خدمت کرے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو برائی کرنے سے بچے یہ بھی صدقہ ہے۔'' [1] دوسرے موقع پر فرمایا: ''اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، کانٹا اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔'' [2] غور کیجئے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے۔

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کر کے اس کو یاد مت دلاؤ، نہ اپنا احسان اس پر جتاؤ، نہ اس سے اس کے شکریہ کے طالب ہو، نہ نمائش مقصود ہو، کہ اس سے خود نیکی برباد ہو جاتی ہے، آنحضرت ﷺ کو دوسری ہی وحی میں یہ نکتہ بتایا گیا، فرمایا:

---

[1] ادب المفرد امام بخاری، باب ان کل معروف صدقۃ: ۲۲۵۔

[2] جامع ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ما جاء فی صنائع المعروف: ۱۹۵۶۔

﴿ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ ﴾ (۷۴/ المدثر: ٦)

''اور اپنا احسان نہ جتا کہ تو اور زیادہ چاہے۔''

عام مسلمانوں کو تاکید کی گئی:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ﴾ (۲/ البقرة: ٢٦٤)

''اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان رکھ کر اور جتا کر برباد مت کرو، جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور پچھلے دن پر یقین نہیں رکھتا۔''

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی سی نیکی بہتر ہے:

﴿ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝ ﴾

(۲/ البقرة: ٢٦٣)

''اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے، جس کے پیچھے احسان جتا کر دینے والے کے دل کو صدمہ پہنچایا جائے اور اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔''

ریا اور نمائش سے بچنا ہو تو چھپا کر دو اور اگر لوگوں کی تشویق و ترغیب مقصود ہو تو دکھا کر کے بھی دے سکتے ہو:

﴿ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرة: ٢٧١)

''اگر تم خیرات کھول کر دو تو بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر غریبوں کو دو تو وہ تمہارے لیے سب سے بہتر ہے اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ کر دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔''

﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرة: ٢٧٤)

''جو لوگ اپنا مال رات اور دن، چھپے اور کھلے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، تو ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے، نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم۔''

صدقہ اور خیرات کھلے دل سے ہنسی اور خوشی ہونی چاہیے، جبر و کراہت سے نہ ہو، کہ یہ منافقت کی نشانی ہے:

﴿ وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبة: ٥٤)

''اور وہ اللہ کی راہ میں نہیں خرچ کرتے لیکن کڑھ کر۔''

صدقہ وخیرات پکے دل سے اور صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے:

﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲٦٥)

''اور ان کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہ کر اور اپنا دل پکا کر کے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اس باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو۔''

بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس سے مقصود خود اللہ ہو:

﴿ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۲)

''اور تم تو خرچ نہیں کرتے، مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر اور جو خیرات کرو گے، وہ تم کو پوری ملے گی تمہارا حق کچھ دبا نہ رہے گا۔''

صدقہ وخیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشوں کا احاطہ کیا ہے۔

مسکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ

احکام میں یہ وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے، مثلاً: مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہیں کیا ہے، مگر اچھا کسی نے نہیں سمجھا ہے، اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے تذبذب اور شک اور ہاں اور نہیں کے تمام پہلوؤں کو دور کر کے اس بارہ میں ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کر دیا، اسلام سے پہلے گو بعض نیک لوگوں نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا، لیکن یہ حرمت صرف اشخاص تک محدود تھی، اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو ان کے نقصانات سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کلیتہً محفوظ نہیں رہ سکتے، مثلاً: ایک شخص شراب نہیں پیتا، لیکن اس کی تجارت کرتا ہے، ایک شخص ان دونوں چیزوں سے احتراز کرتا ہے، لیکن ان برتنوں کو استعمال میں لاتا ہے، جن میں شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے، لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

قال رسول اللہ ﷺ: ((لعن اللّٰه الخمر وشاربها وساقيها، وبائعها ومبتاعها وعاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولة اليه)) [1]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ شراب پر، اس کے پینے والے پر، اس کے پلانے والے پر، اس

[1] ابوداود، کتاب الاشربة، باب العصير للخمر: ٣٦٧٤۔

کے بیچنے والے پر، اس کے خریدنے والے پر، اس کے نچوڑنے والے پر، اس سے اپنے لیے نچڑوانے والے پر، اس کے لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لے جائی جائے، لعنت کرتا ہے۔“

مہذب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگوں کو روکتا ہے، سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (تعریف) بتائے، عرب میں شراب مختلف چیزوں سے بنتی تھی، اس کے مختلف نام تھے اور ان کا اثر بھی مختلف تھا، قرآن مجید میں حرمت شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے، اس میں خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس کی تعیین فرما دی۔

قال رسول اللہ ﷺ: ((ان من العنب خمرا و ان من التّمر خمرا و ان من العسل خمرا و ان من البر خمرا و ان من الشعير خمرا)) [1]

آپ ﷺ نے فرمایا: ”انگور سے بھی شراب بنتی ہے، کھجور سے بھی، شہد سے بھی، گیہوں سے بھی اور جو سے بھی۔“

قال سمعت رسول اللہ ﷺ يقول ((ان الخمر من العصير و الزبيب و التمر و الحنطة و الشعير و الذرة و انی انهاكم عن كل مسكر)) [2]

راوی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ ”شراب انگور، منقی، کھجور، گیہوں، جو، جوار اور ہر چیز کے نچوڑ سے بنتی ہے اور میں تم کو ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں۔“

عرب کے مختلف حصوں میں انہی چیزوں کی شراب بنتی تھی، اس لیے یہ تعریف عرب کے تمام اصناف شراب کو حاوی تھی، لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا اور یہ ممکن تھا کہ دنیا کے اور حصوں میں شراب کی دوسری قسمیں استعمال کی جائیں اور تحدید ان کو شامل نہ ہو، اس لیے آپ ﷺ نے شراب کی ایک کلی تعریف کی جو تمام اقسام شراب پر حاوی تھی:

((كل مسكرٍ خمر و كل مسكر حرام)) [3]

”ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔“

((كل شراب اسكر فهو حرام)) [4]

---

[1] ابوداود، كتاب الاشربة، باب الخمر مماهی:۳۶۷۶۔ [2] ایضاً:۳۶۷۷۔ [3] ابوداود، كتاب الاشربة، باب ماجاء فی السكر:۳۶۷۹؛ صحيح مسلم، كتاب الاشربة، باب بيان ان كل مسكر خمر: ۵۲۱۸، ۵۲۱۹؛ ترمذی، كتاب الاشربة، باب ما جاء فی شارب الخمر: ۱۸۶۱؛ نسائی، كتاب الاشربة: ۵۵۸۹؛ أحمد، ج۱، ص: ۲۸۹۔ [4] ابوداود، كتاب الاشربة، باب ماجاء فی السكر: ۳۶۸۲؛ بخاری، كتاب الاشربة، باب الخمر من العسل:۵۵۸۵؛ مسلم، كتاب الاشربة، باب بيان ان كل مسكر خمر: ۵۲۱۲۔

''ہر پینے کی چیز جونشہ لائے وہ حرام ہے۔''

لیکن حیلہ جو لوگوں کے لیے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا، حرمت شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے مستنبط ہوتی ہے، نشہ ہے، لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کی جائے کہ نشہ نہ آئے، اس لیے فرمایا:

((ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام)) [1]

''جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے، اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔''

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں؛ جو نشہ نہیں لاتیں، تاہم اعصاب میں ایک خدر کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں، جو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے، بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں اور تمدن کے زمانہ میں مہذب اور حیلہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مفرحات کا استعمال کرتے ہیں، اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کی بھی ممانعت فرمائی:

نهیٰ رسول الله عن كل مسكرٍ و مفترٍ. [2]

''آنحضرت ﷺ نے ہر منشی و مخدر چیز سے منع فرمایا۔''

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی منشی چیزیں استعمال کریں، جن پر عرفاً خمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو، عرب میں اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی، جس کو داوی کہتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بھی خمریات میں داخل فرمایا:

((ليشربنّ ناس من امتي الخمر يسمونها بغير اسمها)) [3]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت میں کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال کریں گے۔''

اس کے علاوہ عرب میں جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی، شروع میں ان کے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی:

نهى عن الدباء والحنتم والمزفت والنقير۔ [4]

''آپ ﷺ نے کدو، سبز و سیاہ رنگ کے مرتبان اور کھجور کی جڑ سے جس میں سوراخ کر کے شراب رکھی جاتی منع فرمایا۔''

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی، اس لیے آپ ﷺ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرما دیا، اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں، ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دی جائے، دوسرے یہ کہ سخت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان دونوں صورتوں میں بھی شراب

---

[1] ابوداود، ایضاً: ۳۶۸۱۔ [2] ایضاً: ۳۶۸۶۔ [3] ایضا، باب فی الداذی: ۳۶۸۸، ۳۶۸۹۔

[4] ابوداود، کتاب الاشربة، باب فی الاوعية: ۳۶۹۰۔

کی ممانعت فرمائی، چنانچہ چند یتیم بچوں نے وراثت میں شراب پائی تھی، حرمت خمر کے بعد وہ بیکار چیز ہوگئی، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ کیوں نہ بنا لیا جائے، لیکن آپ ﷺ نے اجازت نہ دی۔ ❶

ایک بار دیلم حمیری نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کی، کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں اور سخت کام کرتے ہیں، اس لیے گیہوں کی شراب پیتے ہیں کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے، آپ نے فرمایا: ''کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے۔'' انھوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو اس کو چھوڑ دو۔'' انھوں نے کہا: لیکن اور لوگ نہیں چھوڑیں گے، ارشاد ہوا کہ ''اگر نہ چھوڑیں، تو ان سے جہاد کرو۔'' ❷ اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیوں سے سود لینے کی ممانعت کی تھی، انجیل نے بھی ''ناروا نفع'' سے لوگوں کو روکا ہے، تاہم یہ ممانعت بہت مجمل ہے، لیکن اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت، ربا کے اقسام، کن کن چیزوں میں کس کس قسم کا ربا ناجائز ہے، اس کی پوری تفصیل کی، اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا، اس ظلم میں جو لوگ کسی طرح بھی شریک ہوں، ان سب کو شریک جرم ٹھہرایا۔

لعن رسول اللہ ﷺ اكل الربو وموكله وشاهده وكاتبه. ❸

''آنحضرت ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، اس پر گواہی دینے والے اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی۔''

رشوت کی حرمت میں استقصا

لعن رسول اللہ ﷺ الراشي والمرتشي. ❹

''آنحضرت ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔''

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات میں بھی اس قسم کی تفصیل، استقصا اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے، کیونکہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہو جاتا ہے، اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لیے جب تک ان تمام صورتوں کو مٹا نہ دیا جائے اس چیز کا کلیتہً قلع وقمع نہیں ہوسکتا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوری

مسیحی فلسفۂ اخلاق نے دنیا میں ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کر دی تھی، کہ اس نے حسن اخلاق کا انحصار

❶ ابو داود، كتاب الاشربة، باب ماجاء في الخمر تخلل: ٣٦٧٥۔ اس سرکہ کے جواز وعدم جواز میں فقہا کا اختلاف ہے۔

❷ ابو داود، كتاب الاشربة، باب ماجاء في السكر: ٣٦٨٣۔ ❸ ابو داود، كتاب البيوع، باب في اكل الربوا: ٣٣٣٣۔ ❹ ابو داود، كتاب القضاء، باب في كراهية الرشوة: ٣٥٨٠۔

اخلاق کی صرف منفعل اور ہر دو قسم میں کر دیا تھا، یعنی تواضع، خاکساری، فروتنی، عاجزی، خواری، بردباری، مسکینی، غریبی، غمگینی، وغیرہ منفعل قوتوں کو اخلاق کا درجہ دیا تھا اور اس کے مقابل کی قوتوں کی سخت توہین کی تھی، حالانکہ دنیا کی امن و سلامتی اور ترقی و خوشحالی کے لیے دونوں قسم کی مناسب قوتوں کے امتزاج کی ضرورت ہے، جس قدر ایک مقام پر تواضع و خاکساری کی ضرورت ہے، اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزت نفس کی حاجت ہے، جس طرح عفو و درگزر بلند ہمتی کا کام ہے، اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتقام بھی بسا ضروری ہے، محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندوں کے لیے ضروری سہی، مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہیے، کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے۔

نٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

جرمن فلاسفر نٹشے نے مسیحی اخلاق پر جا و بیجا اعتراضات کے جو تیر برسائے اور ان مسیحی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ ٹھہرایا ہے، وہ اسی لیے ہے کہ وہ صرف کمزوری، عاجزی، خواری اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہیں، جن سے لوگوں میں عزم، بلند ہمتی، استقلال، ثبات قدم، عزت نفس اور خودداری کے جوہر پیدا نہیں ہو سکتے، وہ کہتا ہے:

> ''مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست اور بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا ہے، مسیحیت نے طبائع انسانی کی تمام خوددارانہ قوتوں کا استیصال کر دینا، اپنا مسلک قرار دیا ہے، مسیحیت نے زبردست دماغوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔'' [1]

اسلامی اخلاق کا اعتدال

لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مسیح علیہ السلام کے ۵۷۵ برس بعد اس نبی آخر الزماں کا ظہور ہوا ہے، جس نے مسیحی نظامِ اخلاق کی غلطیوں کی تصحیح کر دی اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا، جو ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے، اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی تعلیم پر دس سال کی مدت بھی نہیں گزری تھی، کہ محکوموں نے حاکموں کی، پست نے بلند کی، ادنیٰ نے اعلیٰ کی اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کر لی، مسیحی یورپ کو ان میں سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی، جب تک اصلاح و تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریۃً قبول نہیں کیا۔

نفوس کا اختلافِ استعداد

اخلاقی تعلیم کوئی ایک ایسی طب نہیں ہے، جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی بیماریوں کا علاج ہو، تمام انسانوں کی اندرونی کیفیتیں، اخلاقی استعدادیں اور نفسانی قوتیں یکساں نہیں ہیں، انسانوں میں کمزور و پست ہمت بھی ہیں اور قوی و بلند حوصلہ بھی، خاکسار و متواضع بھی ہیں اور مغرور و خوددار بھی، بزدل بھی ہیں اور

[1] نٹشے از ایم اے مگے، مترجم مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے باب سوم ص: ۶۷۔

بہادر بھی، بردبار بھی ہیں اور غضبناک بھی، بخیل بھی ہیں اور فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہیں اور فیاض بھی، ناامید بھی ہیں اور پرامید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہیں اور قوی دل بھی، ظالم وزبردست بھی ہیں اور ذلیل وخوار بھی، الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہیں کہ سب کے لیے ایک دوا کبھی کارآمد نہیں ہوسکتی، بہترین اخلاقی معالج وہ ہے، جس نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیے ہوں اور ہر قسم کے مریضوں کو صحیح وتندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو۔

ہر شخص کی حسبِ ضرورت اصلاح

صحیح اخلاقی تعلیم وتربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر قوم کی نفسانی کیفیت کو دیکھ کر جو عنصر کم ہو، اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو اس کو کم کر کے قوتوں میں مناسب اعتدال پیدا کرے، وہ کمزور کو بہادر اور بہادر کو عادل، پست ہمت کو بلند ارادہ اور بلند ارادہ کو دوسروں کے حقوق کو نہ غصب کرنے والا بنائے، وہ ناامید کو پرامید کرے اور امید سے بھرے ہوئے کو یہ سمجھائے، کہ جو کچھ تم کو مل رہا ہے، وہ اللہ سے مل رہا ہے، وہ قانع کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسروں سے بے نیاز کر کے اللہ سے مانگنے والا کردے، وہ ذلیل وخوار کو خوددار اور خوددار کو غیر مغرور بنادے، وہ اچھی قوتوں کو نشوونما دے اور بری قوتوں کا رخ اچھے مقصدوں کی طرف پھیر کر ان کی برائی کو کم سے کم کردے۔

قدیم فلسفہ اخلاق کے واقف کار جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے، قوت غضب اور قوت شہوت، غضب نام ہے اپنے نفس کے نامناسب امور کے پیش آنے پر ان کی مدافعت کی قوت کا اور شہوت نام ہے نفس کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا، ان دونوں قوتوں کی افراط و تفریط اور اعتدال اور ان کے مختلف مراتب سے سینکڑوں اچھے برے اخلاقی جزئیات پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے، غضب کی قوت اگر افراط وتفریط سے پاک ہو اور عقل کے قابو میں ہو، تو اس کا نام شجاعت ہے اور وہ حالات وکیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتی ہے، مثلاً: خودداری، دلیری، آزادی، حق گوئی، بلند ہمتی، بردباری، استقلال، ثبات قدم، وقار، صبر وسکون، مطالبہ حق، جدوجہد، سعی ومحنت، جہاد پھر جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی، تو تہور بن جاتی ہے اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور، نخوت، خود پرستی، تکبر، ترفع، دوسروں کی تحقیر، ظلم، قتل نفس وغیرہ کی برائیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور جب یہ قوت تفریط کی طرف جھکتی ہے، تو ذلت پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی، خوف اور دنائت کے قالب میں ظہور کرتی ہے، اسی طرح شہوت کی قوت میں جب کامل اعتدال ہوتا ہے، تو اس کو عفت کہتے ہیں، یہی صفت مختلف سانچوں میں ڈھل کر مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے، یعنی پاک دامنی، پرہیزگاری، جود وسخا، شرم وحیا، صبر وشکر، قناعت، بے طمعی، خوش طبعی، ترقی کی خواہش، نسل واولاد کی آرزو، خانگی مسرت کی مناسب

طلب وغیرہ، پھر یہ صفت جب افراط وتفریط کی طرف مائل ہوتی ہے، تو اس سے حرص وطمع، بے شرمی، فضول خرچی، بخل، ریا، اوباشی، تملق، حسد، رشک وغیرہ اوصافِ ذمیمہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق

مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی ان دونوں غضبی اور شہوی قوتوں کا استیصال ہے اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط وتفریط سے ہٹا کر ان میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے، مسیحیت کے نزدیک نفس کی یہ دونوں قوتیں بذاتہٖ بری ہیں اور اسلام کے نزدیک یہ دونوں قوتیں بجائے خود بری نہیں ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کے استعمال کا موقع ومحل برا ہوتا ہے، اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ اپنی قوت غضب کو فنا کر کے ''دشمن کو پیار کرو'' اور نہ یہ کہ اپنی قوت خواہش کو فنا کر کے مجرد رہو اور مفلس وغمگین بن کر زندگی گزار دو، بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنوں کو بہتر یہ ہے کہ معاف کرو اور خدائی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرو کہ انھیں ہدایت ملے اور اللہ کے حلال کئے ہوئے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ، لیکن شریعت کے مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو، امام غزالی کے بقول اسلام نے غصہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے، غصہ کے مٹانے والے کی نہیں، اس نے ﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ﴾ کہا ہے، وَالْفَاقِدِيْنَ الْغَيْظَ نہیں کہا۔ [1]

مسیحی اخلاق کی کمزوریاں

دنیا میں علم وہنر، خوشی ومسرت، ولولہ وانبساط، رونق وترقی، جدوجہد جو کچھ ہے، وہ انہی دونوں قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں، اگر یہ دونوں قوتیں یک قلم مٹ جائیں، یا ان میں افراط وتفریط پیدا ہو جائے تو نیکی، سعادت اور خوش بختی کی آدھی دنیا مر جائے، نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو، نہ عصمت کے کوئی معنی ہوں، نہ عدل کا وجود ہو، نہ امن وامان کا نشان ملے، نہ کسی کی ملک محفوظ اور نہ کسی کی جان سلامت رہے، نہ انسان کی بلند ہمتی، استقلال، ثبات قدم اور سعی ومحنت کے جوہر نمایاں ہوں، قوموں کی ترقی اور ملکوں کا نظام درہم برہم ہو جائے اور اللہ کی یہ دنیا ایک ایسا ویرانہ بن جائے جس میں حرکت وجنبش کا نام نہ رہے۔ مسیحی اخلاقی تعلیم میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں رہا ہے کہ نفس غصہ اور خواہش بری چیز نہیں ہے، بلکہ بے جا غصہ اور ناجائز خواہش بری چیز ہے، نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بری چیزیں ہیں، اسی قدر وہ معائب بھی جو ان دونوں قوتوں کی تفریط اور کمی سے پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً: بے آبروئی، بے غیرتی، ذلت پسندی، دنائت، بے طاقتی، تملق، کم حوصلگی، بے عملی، سستی، فاقہ زدگی بھی برے ہیں، اسلام نے اپنے پیروؤں میں ان دونوں قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے، اس نے جہاں ان کو ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (٤٨/ الفتح: ٢٩) ''آپس میں رحمدل'' اور ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (٥/ المآئدۃ: ٥٤) ''مومنوں کے فرمانبردار'' کی تعلیم دی وہیں ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾

[1] احیاء العلوم، ج٣، ص: ١٢١ مطبوعہ مصر۔

(۴۸/ الفتح:۲۹) ''کافروں پر بھاری'' اور ﴿ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۵۴) ''کافروں پر گراں'' بننے کی بھی تعلیم دی اور ان کو بتایا کہ عزت صرف اللہ اور رسول اور ان کے فرمانبرداروں کے حصہ میں ہے، ﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (۶۳/ المنافقون:۸) مسیحی قوموں کو اس وقت تک ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا، جب تک اسلامی فلسفہ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بن کر انھوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔

لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

لیکی تاریخِ اخلاقِ یورپ کی دوسری جلد میں کہتا ہے:

''لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے......اور گو یہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزوں ومناسب رہا، تاہم تمدن کی روز افزوں ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا، ترقی تمدن کے لیے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری ہو اور حریت کے جذبات موجود ہوں اور انکسار وتواضع اس کے دشمن ہیں، خانقاہانہ طرز زندگی کا مثل، فوجی طرز زندگی کے اقتضا یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو، تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی وخودداری موجود ہوتی ہے، لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ زندگی کا مطمع نظر ہے، کسی طرح ترقی تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑ سکتا تھا اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں، لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مترادف ہو جاتا ہے، اسی کو دیکھ کر متاخرین حکمائے اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا اور اس کے دو مظاہر ہیں، ایک مردانگی اور دوسرے خودداری، انہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک میں جو صاف گوئی، آزاد خیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت وحمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے، وہ کیتھولک علاقوں میں نہیں پائی جاتی، بلکہ ان کے بجائے دنائت، پست ہمتی، کم ظرفی، بزدلی اور گداگری کے مناظر سامنے آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اول الذکر میں سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں ان سے آخر الذکر یکسر خالی ہیں۔'' [1]

اسلام اور بلند اخلاق

لیکن اس کے بالمقابل معلمِ اسلام ﷺ کی تعلیم جو کچھ ہے اس کا اندازہ آپ ﷺ کے صرف ایک سبق سے ہو سکتا ہے، فرمایا:

((ان اللّٰہ یحب معالی الامور ویبغض سفسافھا)) [2]

''بیشک اللہ معالی امور کو پسند اور محقرات امور کو ناپسند کرتا ہے''

---

[1] فصل:۱۱، ص:۱۲۴، مترجمہ عبدالماجد دریا آبادی۔

[2] مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ج۸، ص:۱۸۸ بروایت طبرانی۔

''معالی امور'' سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام اور محقرات سے مراد چھوٹی اور ادنیٰ باتیں ہیں، اس حدیث میں گویا ارشاد ہوا کہ ایک مسلمان کو اللہ کا دوست بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اونچی اور مقصد ہمیشہ بلند رہے اور دنائت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے الگ رہے۔ اسی کے ساتھ آنحضرت کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((المؤمن القوی خیر واحب الی اللّٰه من المؤمن الضعیف وفی کل خیر احرص علی ماینفعك واستعن باللّٰه ولا تعجز وان اصابك شيء فلا تقل لو انی فعلت کان کذا وکذا ولکن قل قدر اللّٰه وما شاء فعل فان لو تفتح عمل الشیطان)) [1]

''کمزور مسلمان سے قوت ور مسلمان زیادہ بہتر اور اللہ کے نزدیک پیارا ہے اور ہر ایک میں بھلائی ہے، ہر وہ چیز جو تجھے نفع دے اس کی پوری خواہش کر اور اللہ سے مدد چاہ اس راہ میں کمزوری نہ دکھا اور اگر تجھے اس میں کچھ تکلیف پہنچ جائے تو یہ نہ کہہ ''اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا'' بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے مقدر کر دیا ہے اور جو چاہا اس نے کیا، کیونکہ یہ اگر (اور مگر) شیطان کا کاروبار کھولتا ہے۔''

تقدیر، توکل، صبر اور شکر

یہ حدیث ان تمام مسائل کی شرح کرتی ہے، جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر، توکل، صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے اور جن کی پوری تفصیل مسئلہ قضا و قدر کے ضمن میں جلد چہارم میں اور عبادات قلبی کے تحت عنوان جلد پنجم میں کی جا چکی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ چاروں تعلیمات اسی لیے ہیں کہ مسلمانوں میں حوصلہ مندی، پرامیدی، استقلال اور ثبات قدم پیدا ہو، مسلمان میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہیے، پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ اللہ پر بھروسہ اور توکل کر کے کام شروع کر دینا چاہیے، اگر کام میں کامیابی ہوئی تو فخر و غرور کے بجائے دل سے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اسی کے فضل و کرم سے ہوا اور اگر ناکامی ہو تو دل میں یاس اور ناامیدی کے بجائے صبر و ثبات پیدا ہونا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ اللہ کا منشا یہی تھا، (یہی تقدیر ہے)

حدیث بالا میں جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآن پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے:

﴿ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ إِن يَنصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ

[1] صحیح مسلم، کتاب القدر، باب الایمان بالقدر والإذعان له: ٦٧٧٤۔

لَكُمْ ۚ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝﴾

(۳/ آل عمران :۱۵۹۔۱۶۰)

''جب تو پکا ارادہ کر لے، پھر اللہ پر بھروسہ کر، بیشک اللہ متوکلوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہیں اور اگر وہ چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد کون تمہاری مدد کر سکتا ہے، اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔''

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝﴾ (۵۷/ الحدید :۲۲۔۲۳)

''کوئی مصیبت نہیں آتی زمین پر اور نہ تم پر لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب (الٰہی) میں درج ہوتی ہے یہ اللہ پر آسان ہے، یہ اس لیے، تا کہ اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کرو اور جو تم کو اللہ دے اس پر اترایا نہ کرو، اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ تقدیر، توکل اور صبر وشکر کی تعلیم اسلام میں پستی اور دنائت کے لیے نہیں، بلکہ مسلمانوں میں ہمت، جرأت، بہادری اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لیے ہے، اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتوں اور فوجوں کا مقابلہ کیا اور کامیاب رہے، ان کو مشکلات میں اللہ کے دوسرے برگزیدوں کی یہ دعا سنائی گئی:

﴿رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝﴾

(۲/ البقرۃ:۲۵۰)

''اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر وثبات کا پانی بہا اور ہمارے پاؤں کو مضبوط گاڑ اور ہم کو کافر لوگوں پر فتح یاب کر۔''

اور بتایا کہ مشکلات میں دوسرے پیغمبروں کے ساتھیوں نے کیا کیا:

﴿وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝﴾

(۳/ آل عمران :۱۴۶۔۱۴۷)

''اور کتنے نبی تھے کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے لڑائی لڑی، تو اللہ کی راہ میں جو

مشکل یا مصیبت پیش آئی اس سے وہ سست نہ ہوئے اور نہ کمزور ہوئے اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار فرماتا ہے اور ان کا کہنا نہ تھا، لیکن یہی کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ اور ہمارا حد سے بڑھ جانا معاف فرما اور ہمارے پاؤں مضبوط رکھ اور ہم کو کافروں پر فتح دے۔''

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۠ ﴾

(۳/ آل عمران: ۲۰۰)

''اے وہ جو ایمان لائے، ثابت قدم رہو اور دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو اور اللہ سے تقویٰ کرو، تاکہ کامیاب ہو۔''

ان آیتوں سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی، عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور مشکلات میں صبر و ثباتِ قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے، یعنی جس طرح اس کے نزدیک تواضع، فروتنی اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے، اس طرح سطوت اور بہادری وحکومت کا رعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے۔

اپنے دشمنوں سے پیار کرو

مسیحی اخلاقی تعلیم کا سب سے زریں اصول یہ ہے کہ اپنے دشمنوں کو پیار کرو، اس میں شک نہیں کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن اہل معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے، یہی سبب ہے کہ خود انجیل کے مفسروں [1] نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے، تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو، دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو، دشمن کے حق میں دعائے خیر کر سکتے ہو، مگر تم دشمن سے پیار اور محبت نہیں کر سکتے کہ یہ دل کا فعل ہے، جس پر تم کو قدرت نہیں۔

اخلاقِ محمدی نے اس کے بجائے وہ تعلیم دی، جس پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے اور اللہ کے بندوں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے، یعنی دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک کرو، برا چاہنے والوں کے ساتھ بھلائی کرو، جو تم کو بددعائیں دیں، ان کو دعا دو، جو تمہارا قصور کریں، ان کو معاف کرو اور جو تم پر ظلم کریں، ان کے ساتھ انصاف کرو، فرمایا:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ؗ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ؗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۝ ﴾

(۵/ المائدۃ: ۸)

''اے ایمان والو! اللہ کے لیے کھڑے ہو جایا کرو، انصاف کے ساتھ گواہ بن کر اور کسی قوم کی دشمنی تم کو عدل و انصاف کرنے سے باز نہ رکھے، انصاف کرو، کہ انصاف کرنا پرہیزگاری سے

[1] اسکاٹ صاحب کی تفسیر متی۔

بہت نزدیک ہے اور اللہ سے ڈرو کہ اس کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔"

﴿ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝ وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ ﴾ (حم السجدة:٣٦)

"اور بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کو بھلائی سے دفع کرو، تو دفعتہً وہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے، رشتہ دار دوست کے مانند ہو جائے گا اور اس پر عمل کی توفیق انہی کو ہوتی ہے، جو صبر کرتے ہیں اور انہی کو یہ سعادت ملتی ہے، جو بڑی قسمت والے ہیں اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو کہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔"

① اس آیت پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں، ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے۔

② اس آیت پاک میں جس نیکی اور حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے، وہ ان لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے جو تمھارے دشمن ہیں، کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمہارے اس نیک طرزِ عمل سے تمہارا دشمن تمہارا دوست بن جائے گا۔

③ دشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاقِ محمدی ﷺ کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے؟

④ دشمن کے ساتھ برائی کرنے کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جو صحابہ میں بڑے مفسر ہیں، اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں: [1]

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ و غضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کی برائی کرنے پر حلم اور عفو و درگزر کرنے کا حکم دیا ہے، وہ ایسا کریں گے، تو اللہ ان کو شیطان کے پنجہ سے چھڑائے گا اور ان کا دشمن بھی دوست کی طرح ان کے آگے سر جھکا دے گا۔"

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جو آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے گالی دی، وہ سن کر چپ رہے، اس نے دوبارہ وہی حرکت کی، وہ پھر بھی چپ رہے، اس نے پھر تیسری دفعہ بدزبانی کی، تو وہ چپ نہ رہ سکے اور کچھ بول اٹھے، یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ فوراً اٹھ گئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یارسول اللہ! کیا آپ ﷺ مجھ سے خفا ہوئے، فرمایا: "اے ابوبکر! جب تک تم چپ تھے، اللہ کا فرشتہ تمہاری

[1] صحيح بخاري، كتاب التفسير، تفسير سورة حم السجدة في ترجمة الباب؛ وابن جرير، ج ٢٤، ص: ٦٨ مصر۔

طرف سے کھڑا تھا، جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا۔'' ❶

آپ ﷺ نے فرمایا: ''صلہ رحم یہ نہیں ہے کہ صلہ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلہ رحم کرو، بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرے اس کے ساتھ صلہ رحم کرو۔'' ❷ یعنی دوستوں کے ساتھ دوستی کوئی بات نہیں، بلکہ دشمنوں کے ساتھ دوستی اصلی خوبی ہے۔

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمت نبوی میں آ کر عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے وہ بات بتائیے، جس کے کرنے سے جنت مل جائے، آپ ﷺ نے اس کو چند باتیں بتائیں، منجملہ ان کے فرمایا: ''ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتوں کی بارش کرو۔'' ❸

اسلام کی نظر میں کافر و مشرک سے بڑھ کر تو کوئی مذہب دشمن نہیں ہو سکتا، لیکن دیکھو کہ قرآن پاک مسلمانوں کو اپنے ایسے دشمنوں کے ساتھ بھی عفو و درگزر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے:

﴿قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ لِیَجْزِیَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ۝﴾ (۴۵/ الجاثیہ: ۱۴)

''(اے پیغمبر!) مسلمانوں سے کہہ دے کہ ان کو جو اللہ کے دنوں پر یقین نہیں رکھتے، معاف کر دیا کریں، تاکہ اللہ ایسے لوگوں کو ان کے کرتوتوں کا بدلہ دے۔''

اگر عملی مثالیں چاہتے ہو تو وہ ''ریاکار فریسیوں'' اور سانپوں ''سانپوں کے بچوں'' ❹ والی مسیحیت کے واعظ میں نہیں بلکہ اسلام کے اس اولین داعی و واعظ میں ہے، جس نے فاتح بن کر، مفتوح ہو کر نہیں، حاکم ہو کر محکوم بن کر نہیں، بیک دفعہ مکہ کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کر دیا، جن میں سے ہر ایک اس کے خون کا پیاسا رہ چکا تھا، ❺ جس نے اس کو معاف کیا، جس نے اس کے قتل یا گرفتاری کے لیے اہل مکہ کا اشتہار و انعام سن کر اس کا تعاقب کیا تھا، ❻ جس نے خیبر میں اپنے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا، ❼ جس نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا، ❽ جس نے حمزہ کی لاش کو بے حرمت کرنے والی اور ان کے جگر کو چبانے والی کو معاف کیا، ❾ جس نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا، ❿ جس نے تنعیم کی وادی میں قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا، ⓫ جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا، جس نے نجد کے ایک

---

❶ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی الانتصار: ۴۸۹۶۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافی: ۵۹۹۱۔ ❸ مستدرك حاكم، كتاب المكاتب، ج ۲، ص: ۲۱۷ حیدر آباد دکن۔ ❹ انجیل متی: ۲۳، ۲۵، ۳۳۔ ❺ مسلم، کتاب الجهاد، باب فتح مكة: ۴۶۲۲ تا ۴۶۲۴؛ سنن الکبری للنسائی: ۱۱۲۳۴ نیز دیکھیں کتب سیر کے ابواب فتح مکہ۔ ❻ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة: ۳۹۰۶۔ ❼ صحیح بخاری، کتاب الهبة، باب قبول الهدیة من المشرکین: ۲۶۱۷، ۵۷۷۷۔ ❽ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل حمزه بن عبدالمطلب: ۴۰۷۲۔ ❾ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ذکر هند بنت عتبة: ۳۸۲۵۔ ❿ کتب سیر و طبقات صحابه ذکر اشتهاریان فتح مکة و اصابة ذکر هبار بن اسود، ج ۶، ص: ۲۷۹ و زرقانی، ج ۳، ص: ۳۳۳۔ ⓫ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة الفتح: ۳۲۶۴۔

نخلستان میں جب وہ محوِ خواب تھا، اپنے ایک تیغ بکف حملہ آور کو قابو میں پا کر معاف کیا، ❶ جس نے ان طائف والوں کے حق میں دعائے خیر ❷ کی جنھوں نے اس پر کبھی پتھروں کی وہ بارش کی تھی، جس سے اس کے پاؤں خون آلود ہو گئے تھے، جس نے احد کے میدان میں اپنے چہرہ کے زخمی کرنے والوں کو نیک دعا دی، ❸ جس نے دشمنوں کے حق میں بددعا کرانے والوں کو کہا کہ میں دنیا میں لعنت کے لیے نہیں، بلکہ رحمت کے لیے آیا ہوں، ❹ انتہا یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کے ساتھ معاہدہ کو پورا کرنا تقویٰ (پرہیز گاری) کی شان بتائی گئی:

﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ: ٤)

''لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد باندھا پھر انھوں نے تم سے کچھ کم نہ کیا اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کا عہد ان کی مدت مقرر تک پورا کرو، اللہ پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔''

کفار و مشرکین سے عدم موالات

اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے ان احکام کو پیش کرتے ہیں، جن میں مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے، حالانکہ یہ بالکل علیحدہ چیز ہے، یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیرووں کو اس کے ان مخالفوں کے میل جول، رازداری اور رفاقت سے روک دے، جو زور یا سازش سے اس کے مٹانے اور برباد کر دینے کے درپے ہوں، خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹا دینے کی کوششیں ہو رہی ہوں اور طرفین میں لڑائی کی سی حالت قائم ہو، یا غلط شبہے اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیرووں کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہوں، چنانچہ اس قسم کی آیتیں:

﴿ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰىةً ۭ ﴾ (۳/ آل عمران: ۲۸)

''ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں، تو جو ایسا کرے گا تو اس کو اللہ سے کوئی علاقہ نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ چاہو۔''

﴿ يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاۗءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاۗءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَي الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۲۳)

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الجھاد، باب تفرق الناس عن الامام: ۲۹۱۳۔ ❷ ابن سعد غزوۃ طائف مغازی، قسم اول، جزء ثانی، ص: ۱۱٤؛ تفسیر ابو حیان تفسیر سورہ الفتح، ج۸، ص: ۹۸۔ ❸ فتح الباری، ج ۷، ص: ۲۸٦ باب احد۔ ❹ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب النھی عن لعن الدواب: ٦٦١٣۔

''اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے محبت رکھیں، اپنا دوست نہ بناؤ اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا، تو وہی حد سے گزرنے والے ہوں گے۔''

اسی موقع کی ہیں، ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہوں تو اہل حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی، فطرۃً ان اہلِ باطل سے اسی قدر بیزاری اور علیحدگی ہوگی، جو اس حق کے مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں، اس لیے حق کی حفاظت کی خاطر اہلِ حق کو اہلِ باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے، اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہیں جو ''شہزادہ امن'' کے اس اعلان کے ہیں:

''یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا، صلح کروانے نہیں، بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں، کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ اور بیٹے کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کروں، آدمی کے دشمن اس کے گھر کے لوگ ہوں گے، جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے، وہ میرے لائق نہیں۔'' (متی کی انجیل باب ۱۰۔۳۴)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی، رحم دلی اور رقیق القلبی نہ تھی، جو دوسرے نادان بت پرستوں اور گناہگاروں کے ساتھ تھی، وہ یہودیوں کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے خطاب کرتے تھے، جب حجاز کے یہودیوں اور سرحد شام کے عیسائیوں سے مسلمانوں کی جنگ چھڑی اور بظاہر مال و دولت، ساز و سامان، اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے ان کا پلہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا، تو مدینہ کے منافقوں اور کمزوردلوں کی عاقبت بینی اور دور اندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی، کہ وہ اسلام کے ان دشمنوں سے ساز باز رکھیں، تاکہ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے، اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دین اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہل کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا، فرمایا:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَتَّخِذُواْ ٱلْيَهُودَ وَٱلنَّصَٰرَىٰٓ أَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُۥ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّٰلِمِينَ ۝ فَتَرَى ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يُسَٰرِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰٓ أَن تُصِيبَنَا دَآئِرَةٌ ۚ فَعَسَى ٱللَّهُ أَن يَأْتِىَ بِٱلْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِۦ فَيُصْبِحُواْ عَلَىٰ مَآ أَسَرُّواْ فِىٓ أَنفُسِهِمْ نَٰدِمِينَ ۝ وَيَقُولُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَهَٰٓؤُلَآءِ ٱلَّذِينَ أَقْسَمُواْ بِٱللَّهِ جَهْدَ أَيْمَٰنِهِمْ ۙ إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۚ حَبِطَتْ أَعْمَٰلُهُمْ فَأَصْبَحُواْ خَٰسِرِينَ ۝ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِۦ فَسَوْفَ يَأْتِى ٱللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُۥٓ أَذِلَّةٍ

عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَٰفِرِينَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۵۱۔۵۴)

''اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو رفیق نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان سے رفاقت کرے، وہ انہی میں سے ہے، اللہ بے انصاف لوگوں کو راہ نہیں دیتا، اب تو ان کو دیکھتا ہے، جن کے دل میں بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان سے ملے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آ جائے، تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی) فتح یا (ان کی کامیابی کی) کوئی اور بات اپنے پاس سے بھیجے، تو پھر وہ اپنے دل کی چھپی بات پر پچھتانے لگیں اور مسلمان کہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں، جو اللہ کی پکی قسم کھاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، خراب گئے ان کے عمل، پھر رہ گئے نقصان میں، اے ایمان والو! اگر تم سے کوئی اپنے دین سے پھرے گا تو اللہ کا کچھ حرج نہیں، اللہ اپنے دین کے لیے اور دوسرے لوگوں کو لائے گا، جن سے اللہ راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے، جو ایمان والوں کے فرمانبردار اور کافروں پر بھاری ہوں گے۔''

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ ٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُوا۟ دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِّنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ مِن قَبْلِكُمْ وَٱلْكُفَّارَ أَوْلِيَآءَ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۵۷)

''اے ایمان والو! اہل کتاب اور کفار میں سے ان کو جو تمہارے دین کو ہنسی مذاق بناتے ہیں اپنا رفیق نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو، اگر یقین رکھتے ہو۔''

ان آیتوں میں پوری تصریح ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیقِ کار، محرمِ اسرار اور مددگار نہ بناؤ اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آل عمران کی اس آیت میں ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا۟ مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ ٱلْبَغْضَآءُ مِنْ أَفْوَٰهِهِمْ وَمَا تُخْفِى صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ ٱلْءَايَٰتِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۱۸)

''اے ایمان والو! اپنے غیر کو اپنا بھیدی نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے، جتنی تم کو تکلیف پہنچے، ان کو خوشی ہے، دشمنی ان کی زبان سے نکلی پڑتی ہے اور جو ان کے جی میں چھپا ہے، وہ اس سے زیادہ ہے، ہم نے تم کو باتیں جتا دیں، اگر تم کو عقل ہے۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کمزور مسلمانوں کو ملا ملا کر مسلمانوں کے منصوبوں اور نقشوں کی جاسوسی کرتے تھے اور بھیدوں کا پتہ چلاتے تھے، جس کی روک تھام کے لیے مسلمانوں کو ان کی رفاقت اور سازباز سے روکا گیا ہے، سب سے زیادہ تصریح سورۂ ممتحنہ میں ہے، فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ڰ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ڰ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْۗءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝ۭ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ڔ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ڔ ﴾ (٦٠/ الممتحنة: ١-٣)

''اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو دوستی کا پیغام بھیجو اور وہ اس سچائی کے جو تم کو ملی، منکر ہیں، وہ رسول کو اور تم کو اس لیے گھر سے نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے، اگر تم میری راہ میں لڑائی اور میری خوشنودی کی طلب میں نکلو، تو تم ان کو دوستی کے چھپے پیغام بھیجو اور مجھے خوب معلوم ہے، جو تم چھپاتے اور جو تم ظاہر کرتے ہو، جو تم میں سے ایسا کرتا ہے، وہ سیدھی راہ بھولا ہے، اگر وہ (جن کو تم دوستی کا چھپا پیغام بھیجتے ہو) تم کو موقع سے پائیں، تو تمہارے دشمن ہوں اور تمہیں تکلیف پہنچانے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھائیں اور برائی کے ساتھ اپنی زبانیں کھولیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر ہو جاؤ تم کو تمہاری قرابت اور تمہاری اولاد قیامت کے دن نفع نہیں پہنچائے گی۔''

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنیے:

﴿ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ﴾ (٦٠/ الممتحنة: ٨-٩)

''اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے باز نہیں رکھتا، جو تم سے مذہب میں لڑائی نہیں کرتے اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں، اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے، وہ انہی سے دوستی کرنے کو منع کرتا ہے، جو تم سے مذہب میں لڑائی لڑیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور تمہارے نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار بنیں، جو ان سے دوستی کا دم بھرے گا، تو وہی بے انصاف ہوں گے۔''

اس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ عنقریب تمہاری فتح ہوگی اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائے گی، فرمایا:

﴿ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۗ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۗ ﴾

(٦٠/ الممتحنة :٧)

''امید ہے کہ اللہ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کر دے اور اللہ قدرت والا ہے۔''

ان آیتوں کا مطلب ان کے شانِ نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہو جاتا ہے، انھی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بے خبری میں مکہ پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے، تیاریاں ہو رہی تھیں، کہ ایک مسلمان حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ نے اپنی ذاتی منفعت کے لیے چپکے سے ایک خط لکھ کر اور ایک عورت کو دے کر مکہ کی سمت روانہ کر دیا، کہ قریش خبردار ہو جائیں، آنحضرت ﷺ کو خبر ہو گئی، آپ ﷺ نے دو سواروں کو بھیجا کہ راستہ سے وہ خط اس سے واپس لے آئیں، وہ خط آیا تو آپ نے حاطب سے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! جلدی نہ فرمایئے، بات یہ ہے کہ میں قریش میں رہتا ہوں، لیکن ان سے میرا کوئی نسبی تعلق نہیں اور جس قدر مہاجر ہیں، وہاں ان کی قرابتیں اور رشتہ داریاں ہیں، جن کے سبب سے ان کے خاندان کے لوگ محفوظ ہیں، میری وہاں کوئی قرابت نہ تھی، جس کا مکہ والے لحاظ کرتے، تو میں نے چاہا کہ میں ان پر یہ احسان کروں، تاکہ وہ میرا کچھ لحاظ کریں، میں نے دینِ حق سے مرتد ہو کر ایسا نہیں کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''بدر والے لوگ ہو اللہ نے تمہارے گناہ معاف کیے ہیں۔'' اس پر یہ آیت اتری [1] ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا ﴾ ''اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔'' یہ احکام اسی قسم کے ہیں جو عہد عتیق میں بھی مذکور ہیں، زبور میں ہے:

''اے خدا! تو یقیناً شریروں کو قتل کرے گا، پس اے خونیو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ، کیونکہ وہ تیری بابت شرارت سے باتیں کرتے ہیں، تیرے دشمن تیرا نام عبث لیتے ہیں، اے خداوند! کیا میں ان کا کینہ نہیں رکھتا، جو تیرا کینہ رکھتے ہیں، کیا میں ان سے جو تیرے مخالف ہو کے روٹھے ہیں، بیزار نہیں، میں شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہوں، میں انھیں اپنے دشمنوں میں گنتا ہوں۔'' (۱۳۹۔۱۹۔۲۲)

یشوع کے صحیفہ میں ہے:

''اگر تم کسی طرح سے برگشتہ ہو اور ان لوگوں کے بقیہ سے لپٹو جو تمہارے درمیان باقی ہیں اور ان کے ساتھ نسبتیں کرو اور ان سے ملو اور وہ تم سے ملیں تو یقین جانو کہ خداوند تمہارا خدا پھر ان گروہوں کو تمہارے سامنے سے دفع نہ کرے گا، بلکہ وہ تمہارے لیے پھندے اور دام اور

[1] صحيح بخاري، كتاب التفسير، تفسير سورة الممتحنة: ٤٨٩٠۔

تمہاری بغلوں کے لیے کوڑے اور تمہاری آنکھوں میں کانٹے ہوں گے، یہاں تک کہ تم اس اچھی سرزمین پر سے جو خداوند تمہارے خدا نے عنایت کی ہے، نابود ہو جاؤ گے۔،، (یشوع باب۲۳۔۱۲)

قرآن پاک اور احادیث میں بعض احکام ایسے بھی ہیں، جن میں منکروں، ظالموں، بدکاروں اور گناہگاروں سے علیحدہ رہنے کی نصیحت ہے:

﴿ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (٤/ النسآء: ٨٩)

"وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو، جس طرح انھوں نے کفر کیا، تو ان میں سے اپنے دوست نہ بناؤ، یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ اختیار کریں۔"

﴿ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾

(٦/ الانعام: ٦٨)

"اور جب تو ان کو دیکھے، کہ جو میری آیتوں کی شان میں لغو بکتے ہیں، تو ان سے کنارہ کر لے، یہاں تک کہ وہ اس کے سوا دوسری بات میں لگ جائیں اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے، تو یاد آنے کے بعد پھر ان گناہگار لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھ۔"

﴿ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ڮ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ﴾

(٤/ النسآء: ١٤٠)

"اور تم پر کتاب میں یہ حکم اتار چکا کہ جب سنو اللہ کی آیتوں سے انکار ہوتے اور ان پر ہنسی ہوتے، تو ان کے ساتھ جب تک وہ دوسری بات نہ کرنے لگیں نہ بیٹھو، ورنہ تم بھی ان ہی کے جیسے ہو جاؤ گے۔"

یہ احکام اس لیے ہیں، تاکہ بری صحبت کا برا اثر مسلمانوں پر نہ پڑے، ان کے معنی قریب قریب وہی ہیں، جو سینٹ پال کے ان فقروں کے ہیں:

"میں نے خط میں تم کو لکھا کہ حرام کاروں میں مت ملے رہو، لیکن نہ یہ کہ بالکل دنیا کے حرام کاروں یا لالچیوں یا لٹیروں یا بت پرستوں سے نہ ملو نہیں تو تمھیں دنیا سے نکلنا ضرور ہوتا، پر میں نے اب تمھیں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار، یا لالچی، یا بت پرست، یا گالی

دینے والا، یا شرابی، یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا، بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا ......غرض کہ تم اس برے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو۔'' (اول قرنیتون ۵)

''اور تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوئے میں مت جتے جاؤ کہ راستی اور ناراستی میں کونسا ساجھا ہے اور روشنی اور تاریکی میں کونسا میل ہے، ایمان دار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصہ ہے، اللہ کی ہیکل کو بتوں سے کون سی موافقت ہے......اس واسطے اللہ یہ کہتا ہے کہ تم ان کے درمیان سے نکل آؤ اور جدا ہو اور ناپاک کو مت چھوؤ۔'' (قرنیتون ٦)

کفار و مشرکین کے ساتھ دلی بیگانگی اور روحانی غیرت کے باوجود اسلام دنیاوی معاملات اور اخلاق میں مسلمانوں کو ان سے عدل و انصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہے، عین لڑائی کی حالت میں بھی یہ حکم ہے:

﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (۹/ توبة:٦)

''اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے، تو اس کو پناہ دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے کلام کو سن لے، پھر اس کو تو اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دے، یہ اس لیے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔''

کیا ایک جنگجو مذہبی دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ بھی حسن سلوک ہوسکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآن پاک میں یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ماں باپ مشرک و کافر ہوں تو بھی ان کی خدمت بجالانا اور دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ان کی مسلمان اولاد پر فرض ہے، فرمایا:

﴿ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾

(۳۱/ لقمان:۱۵)

''اور اگر وہ دونوں (والدین) اس پر ضد کریں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھے علم نہیں، تو ان کی بات نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کر اور اس کی راہ چل جو میری طرف جھکا، پھر تم سب کو میری طرف آنا ہے، پھر میں تم کو جتاؤں گا، جو تم کرتے تھے۔''

مذہبی دشمنوں کے ساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہوسکتی ہے کہ مذہبی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

سختی کا جائز موقع

اس میں شک نہیں کہ اسلام میں نہ صرف کفار بلکہ ان کے ساتھ بھی جن کو قرآن کی اصطلاح میں

''منافقین'' کہتے ہیں، بعض موقعوں پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانوں کو لڑائی درپیش ہو اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانوں کے ساتھ آباد ہیں، وہ دھوکے سے دشمنوں کے ساتھ میل اور سازش نہ کر لیں، یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر ان کی جماعت میں تفرقہ پردازی کریں اور طرح طرح کے شبہوں اور افواہوں سے مسلمانوں کی جمعیت میں پریشانی پیدا کریں، اس حالت میں ان کافروں اور منافقوں کی سختی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ بھال کی جائے اور مسلمانوں کو ان کے میل جول سے روک دیا جائے اور اگر وہ لڑ پڑیں تو بہادری کے ساتھ ان سے لڑا جائے، یہاں تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت سے باز نہ آ جائیں، ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امام وقت کو حاصل ہے، اس موقع کی دو آیتیں سورۂ توبہ میں ہیں:

﴿ يَآيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ ﴾

(٩/ التوبة:٧٣-٧٤)

''اے پیغمبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کی جائے پناہ دوزخ ہے اور وہ کتنی بری بازگشت کی جگہ ہے، یہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے ایسا نہیں کہا، حالانکہ انھوں نے یقیناً کفر کی بات کہی اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر کیا اور اس بات کا قصد کیا تھا، جس کو وہ پا نہ سکے اور انھوں نے عیب نہیں کیا، لیکن یہی کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنی مہربانی سے ان کو دولتمند کر دیا، تو اگر وہ باز آ جائیں، تو ان کے لیے یہ بہت اچھا ہے اور اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ انکو اس دنیا میں اور آخرت میں دردناک سزا دے گا اور زمین میں نہ ان کا کوئی دوست ہوگا نہ مددگار۔''

یہ آیتیں اس سختی کے موقع کو خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہیں اور ان کے آگے اور پیچھے جو اور آیتیں ہیں، وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہیں، تین رکوع کے بعد سورہ کے خاتمہ میں مسلمانوں کو رومیوں [1] کے مقابلہ میں اپنی پوری سختی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (٩/ التوبة:١٢٣)

''اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمہارے ہم سرحد ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر

[1] تفسیر ابن جریر، طبری، ج ١٠، ص: ٤٦۔ مصر۔

سختی پائیں اور یقین کرو کہ اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔''

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لیے ہے، تا کہ وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر ان پر حملہ کی نیت نہ کریں۔

تحریم اور ایلاء کے موقع پر بھی جب بعض منافق اہلِ بیتِ نبوی میں پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کی جماعت میں افتراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے، کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا:

﴿ يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝﴾

(٦٦/ التحریم:٩)

''اے پیغمبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بازگشت کی کتنی بری جگہ ہے۔''

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کیے گئے ہیں جو اس انتظام و نظام کی بربادی میں کفار و منافقین کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے۔

قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے، جس سے مخالف جو اسلام پر سنگدلی و بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں اور وہ سورۂ فتح کی حسب ذیل آیت ہے، جس میں ایک طرف صحابہ رضی اللہ عنہم کی بہادری اور دوسری طرف ان کی باہمی محبت اور رحم دلی کی تعریف ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۗ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٩)

''محمد اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (بھاری) ہیں اور آپس میں مہر و محبت رکھتے ہیں۔''

أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا یہ ترجمہ کہ ''وہ کافروں پر سخت ہیں۔'' اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگ دلی، بے رحمی اور بد اخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور شدتِ ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں، کہ کفار ان سے مرعوب ہیں اور مقابلہ میں مسلمان ان پر ایسے بھاری ہیں، کہ کفار ان پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے محاورہ کے مطابق أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں، بلکہ یہ کرنا چاہیے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں، یعنی ان پر غالب اور ان کے مقابل میں کافی مضبوط ہیں، ان سے کسی طرح دبتے نہیں، چنانچہ علامہ زمخشری نے کشاف میں، ابن حیان اندلسی نے بحر المحیط میں، قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیے ہیں، جو سورۂ مائدہ کی اس آیت کے ہیں:

﴿ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٥٤)

''فرمانبردار ہیں مسلمانوں کے اور بھاری ہیں کافروں پر۔''

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، مثلاً سورۂ ہود میں ہے:

﴿ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ (۱۱/ هود:۹۲)

''اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر اللہ سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے۔''

دوسری آیت میں ہے:

﴿ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ ﴾ (۹/ التوبة:۱۲۹)

''تمھاری تکلیف رسول پر گراں ہے۔''

لسان العرب میں ہے:

وَرَجُلٌ شَدِيْدٌ قَوِيٌّ وَالْجَمْعُ اَشِدَّآءُ۔ [1]

مرد شدید، یعنی قوی اور اس کی جمع اشداء ہے۔

قرآن پاک میں ﴿ اَشَدُّ قُوَّةً، اَشَدُّ خَلْقًا، اَشَدُّ تَثْبِيْتًا، اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا ﴾ وغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے، دوسرے مشتقات میں بھی یہ معنی مراد لیے گئے ہیں:

﴿ اُشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴾ (۲۰/ طٰه:۳۱)

''اس سے میری کمر کو مضبوط کر۔''

﴿ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ﴾ (۷۸/ النبا:۱۲)

''اور تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔''

﴿ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ ﴾ (۳۸/ صٓ:۲۰)

''اور ہم نے ان کی سلطنت مضبوط کی۔''

﴿ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ﴾ (۴۷/ محمد:۴)

''پھر مضبوط باندھو۔''

شَدِيْدٌ کے مشترک معنی یہ ہیں کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے، بلکہ اس کے مقابلہ میں مضبوط اور سخت رہے اور یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صفت تھی، انھوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پروانہ کی، تکلیفوں اور مزاحمتوں کا پرزور مقابلہ کیا، دشمنوں کی تلوار کے نیچے سر رکھ دیا، ان کے نیزوں کو سینوں میں جگہ دی، ان کے تیروں کی بوچھاڑ سے لہولہان ہوئے، مگر جس کو ایک کہا تھا، پھر اس کو دو نہ کہا اور جس کی تصدیق کر چکے تھے، پھر اس سے انکار نہ کیا، آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود ان سے دبنے لگے اور مسلمانوں کی ایمانی

---

[1] ج ٤، ص: ۲۱۸ مصر۔

قوت کا رعب ان پر بیٹھ گیا، قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ ﴿ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۵۱، ۸/ الانفال: ۱۲) کہ ''میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بٹھا دوں گا۔'' وہ بالآخر پوری ہوئی اور فرمایا: ﴿ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ ﴾ (الاحزاب، الحشر۔۱) ''ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا۔''

مخالفوں کے دلوں میں اسی رعب بٹھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہمیشہ سامانِ جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے:

﴿ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ ﴾

(۸/ الانفال: ۶۰)

''ان کے لیے تم سے جو طاقت ہو سکے اور گھوڑوں کا باندھنا وہ تم تیار رکھو کہ اس سے دشمنوں کو مرعوب کرو۔''

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو، بلکہ یہ ہے کہ تمہارا ساز و سامان اور جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل آنے سے رعب کھائے، اسی لیے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے اور آنحضرت ﷺ نے جہاد کی غرض سے گھوڑوں کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے، فرمایا: ''جو شخص گھوڑا اللہ کی راہ میں باندھتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے وہ اس کے لیے ثواب کا موجب ہے، جو ضرورت کے لیے باندھتا ہے، اس کے لیے پردہ پوش ہے اور جو نمائش کے لیے باندھتا ہے، وہ اس کے لیے عذاب ہے۔'' [1]

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعتِ محمدیہ میں نیت کا سوال سب سے اہم ہے، اسی لیے ضروری ہے کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے، اس کا منشا ذاتی و قومی نفرت اور بیزاری نہ ہو، بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور اللہ کے لیے ہو، لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل و انصاف اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیروؤں کو نہیں روکا ہے۔

اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے ناراضی

یہاں کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا، لیکن ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی کرنا ہے، محبت اور عداوت، موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضی انسان کے فطری جذبات ہیں اور دنیا کے تمام کام، تمام تحریکیں اور تمام جدوجہد، انہی دو برابر کے جذبات کے نتیجے ہیں، اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کی نیک و بد ہر قسم کی گرم جوشیاں سرد پڑ جائیں اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے، برف کا تودہ بن جائے، اس لیے یہ ناممکن ہے اور نامناسب ہے، کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الخيل لثلاثة: ۲۸۶۰۔

فنا کر دیا جائے، بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے، محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس غیظ وغضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو، جو یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع ومحل متعین کیا جائے، چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی، ذاتی خود غرضی اور شخصی نفع ونقصان کے لیے نہ ہو، بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت، نیکی کی اعانت اور اللہ کی خوشنودی کے لیے ہو، دوستی ودشمنی، رضامندی وناراضی اور محبت وعداوت جو کچھ ہو، وہ اللہ کے لیے ہو، "الحب فی اللہ والبغض فی اللہ۔" [1]

یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی وناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے، مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے، ناخوشی وناراضی کو سرے سے فنا نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ جو ہو سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی وناراضی کے موقع ومحل کی اصلاح کی جائے، یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے، وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو شر سے نفرت بھی کرے گا، وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہوگا، وہ نیکوں سے دوستی کرے گا، تو شریروں سے علیحدہ بھی ہوگا، مومن سے خوش ہوگا تو منافق سے ناخوش بھی ہوگا، انسان کے سینہ میں صرف ایک دل ہے اور ایک ہی دل میں ایک شے کی اور پھر اسی کی ضد کی دونوں کی محبت یکجا نہیں ہو سکتی، جیسا کہ قرآن نے کہا:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ﴾ (۳۳/ الاحزاب:٤)

''اللہ نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔''

ع سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

اسی مفہوم کو حضرت مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

''کوئی آدمی دو آقاؤں کی خدمت نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یا ایک سے دشمنی رکھے گا یا دوسرے سے دوستی یا ایک کو مانے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا، تم اللہ اور مال دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔'' (متی ٦۔٢٤)

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے، پولوس [2] نے اللہ اور آدمی، یعقوب [3] نے اللہ اور دنیا، یوحنا [4] نے اللہ اور دنیا کے برے کاموں کو باہم مقابل ٹھہرا کر کہا ہے کہ جو ایک سے محبت کرے گا، وہ دوسرے سے نہیں۔

یہی مفہوم احادیث کا ان الفاظ میں ہے کہ محبت اور عداوت دونوں صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے، اپنی ذات کے لیے نہیں، بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ایمان کی کونسی زنجیر زیادہ مضبوط ہے؟ عرض کی: اللہ اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے۔ فرمایا یہ کہ ''باہمی میل جول

[1] ابوداود، کتاب السنة، باب مجانبة اهل الاهواء: ٤٥٩٩؛ احمد، ٥/ ١٤٦۔
[2] گلیتوں کے نام (١۔١٠)۔ [3] یعقوب (٣۔٤)۔ [4] یوحنا (٢۔١٥)۔

اللہ میں ہو، محبت بھی اللہ ہی میں ہو اور ناراضی بھی ہو تو اللہ ہی میں ہے۔" [1] مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ "کون سی نیکی اللہ کو زیادہ پیاری ہے؟" کسی نے نماز کہا، کسی نے زکوۃ کہا، کسی نے جہاد بتایا، آپ نے فرمایا: "تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ اللہ کو یہ نیکی پسند ہے کہ اللہ ہی کے لیے محبت اور اللہ ہی کے لیے مخالفت ہو۔" [2]

اسلام میں کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہیں

اللہ کے لیے کسی سے ناخوشی یا مخالفت یا ناراضامندی کے یہ معنی ہیں کہ نفسانی غرض وغایت کو اس جذبہ میں کوئی دخل نہ ہو، نیز یہ کہ شخص سے شخص کی حیثیت سے مخالفت یا بیزاری نہ ہو، بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو اور اس کے سبب سے اس شخص سے علیحدگی و بیزاری ہو، جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں، قرآن پاک کی ایک آیت ہے:

﴿ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ﴾

(۴۹/ الحجرات: ۷)

"اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کیا اور کفر اور بے حکمی اور نافرمانی کو تمہارے نزدیک مکروہ بنایا۔"

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود مومن یا فاسق وعاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا اور فسق و فجور اور عصیان کو نفرت و کراہت کا مورد قرار دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری و ناراضامندی کا بنیادی سبب کافر و منافق کا کفر و نفاق ہے، یہ دور ہو جائے تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے، فرمایا:

﴿ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۱۱)

"تو اگر وہ کفر سے توبہ کر لیں اور نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔"

یہی سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعتہً کراہت محبت سے دشمنی دوستی سے اور ناراضامندی رضامندی سے بدل جاتی ہے، کیونکہ اسلام میں شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت و کراہت کا وجود نہیں، نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قابل نفرت اچھوت ہے، نہ ملچھ ہے نہ چنڈال ہے، نہ یہودیوں کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے اور نہ غیر قوم ہے اور نہ مجوسیوں کی طرح کوئی پاک نژاد اور بدگہر کی تفریق ہے اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کالے گورے اور یورپین غیر یورپین کی تقسیم ہے، جو کچھ ہے وہ کفر و ایمان اور شرک و توحید کا فرق ہے، ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابوجہل و ابولہب ہو سکتا ہے اور ایک معمولی حبشی و عجمی، مومن و موحد ہو کر بلال حبشی، صہیب رومی اور سلمان فارسی کا رتبہ پا سکتا ہے، وہی عمر، وہی سفیان، وہی عکرمہ، وہی خالد رضی اللہ عنہم جو کل تک کفر کے علمبردار بن کر مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے،

[1] شعب الایمان بیہقی: ۹۵۱۴؛ مشکوۃ المصابیح، کتاب الادب، باب الحب فی: ۵۰۱۴۔

[2] مسند امام احمد، ج ۵، ص: ۱۴۶۔

بیک نظر ان کی وہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے سرگروہ ہو گئے اور مسلمان ان کے فدائی بن گئے اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا:

﴿ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ﴾ (۳/ آل عمران:۱۰۳)

''(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے، تو اس نے تمہارے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی اور تم اسکے فضل وکرم سے بھائی بھائی بن گئے۔''

ناپسندیدگی و بیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے، جس کی بنا کسی انسان کی گناہگاری اور عصیان کاری پر ہے، تو بہ وندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت وشفقت سے مبدل ہو جاتا ہے، مبشرِ عالم، نے ایسے گناہگاروں کو اللہ کی زبان سے یہ مژدہ سنایا کہ

﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ (۳۹/ الزمر:۵۳)

''اے میرے وہ بندو جنہوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ سب گناہوں کو معاف کر سکتا ہے، وہ بخشنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ)) [1] ''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو'' یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گناہگاروں کے ساتھ بھی شفقت فرمائی اور ان کی طرف ترحم کی نظر سے دیکھا اور ان کو رضائے الٰہی کی بشارت سنائی، ایک صاحب کو شراب پینے کی عادت تھی، وہ اس کی سزا بار بار بھگتتے تھے، ایک دفعہ جب وہ اسی جرم میں پکڑے آئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: اللہ اس کو رسوا کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے، آنحضرت نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا: ''تم اپنے بھائی کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو، مجھے اس کے متعلق جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کو پیار کرتا ہے۔'' [2] اس واقعہ سے علما نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے، کہ گناہگار پر بددعا نہ کی جائے۔ [3] ماعز بن مالک ایک صاحب تھے، جو بشری کمزوری سے زنا کے مرتکب ہوئے، واقعہ کے بعد ان کا روحانی احساس بیدار ہوا، وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے، تاہم انھوں نے خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر اپنی حالت عرض کی اور سزا کی درخواست کی، آنحضرت نے کئی دفعہ ان کی درخواست رد کی، لوگوں سے تحقیق کی یہ پاگل تو نہیں؟ سب نے کہا: ایسا تو نہیں ہے، اس کے بعد ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، وہ میدان میں کھڑے کیے گئے اور ان پر سنگ باری کی گئی اور اسی حال میں انھوں نے جان دی، صحابہ میں بعض ایسے تھے جو اس بہادرانہ سزا پانے کے

[1] ابن ماجه، ابواب الزهد، باب ذكر التوبة: ٤٢٥٠۔

[2] صحيح بخاري، كتاب الحدود، باب مايكره من لعن شارب الخمر: ٦٧٨٠، ٦٧٨١۔

[3] فتح الباري، كتاب الحدود، باب ما يكره من ..... ، شرح حديث مذكور، ج ١٢، ص: ٦٨۔

باوجود ماعز کو برا کہتے تھے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو فرمایا: ''ماعز کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا مانگو کہ اس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ کسی پوری قوم میں بانٹی جائے تو اس میں سب کی گنجائش ہو سکتی ہے۔'' ❶

اسی طرح قبیلہ غامد کی ایک حاملہ عورت نے آکر خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور سزا کی درخواست کی، آپ نے فرمایا: ''وضع حمل کے بعد آنا'' وہ اس کے بعد آئی، فرمایا: ''بچہ کی پرورش کرلو، جب بچہ دودھ چھوڑ دے تب آنا'' وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبک دوش ہو کر آئی اور اب بھی اس کے احساس گناہ کا جذبہ کم نہیں ہوا تھا، آپ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، اس کو سنگسار کیا گیا تو اس کے خون کی چھینٹیں اڑ کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے منہ پر پڑیں، انھوں نے عورت کو برا کہا، آنحضرت ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ ''خالد چپ رہو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا۔'' ❷

ترک ھویٰ

آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے یہ نکتہ سکھایا ہے، کہ انسان کے نیک سے نیک فعل کی اچھائی بھی اس کی غرض و غایت پر موقوف ہے، یعنی یہ کہ اگر وہ اللہ کی خوشنودی اور رضامندی کے لیے ہے تو وہ نیک اور اچھا ہے اور اگر اس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لیے ہے تو وہ نیکی نہیں، اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآن پاک میں ھویٰ ہے، ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال و اخلاق کو ھویٰ سے پاک رکھے، کہ انسان کا حقیقی اللہ وہی ہے، جس کے لیے وہ کام کرتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو دین حق کے پیرو نہیں اور اپنے کاموں کی بنیاد اخلاص پر نہیں رکھتے، یہ کہا کہ ان کا دین و مذہب اپنی خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور ان کے سینوں کے اندر اغراض نفسانی اور خواہش و ھویٰ کے بت چھپے ہیں، قرآن نے فرقان اور جاثیہ دو سورتوں میں متنبہ کیا:

﴿ أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ ﴾ (٤٥/ الجاثیة:٢٣)

''اے پیغمبر کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا الٰہ بنا رکھا ہے۔''

اسی لیے نفس کے تزکیہ وصفائی اور روح کی بلندی و پاکی کے لیے شریعت محمدی ﷺ نے ترک ھویٰ کا طریقہ پیش کیا، بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بری خواہش سے پاک ہو جائے، کیونکہ انسان اگر اچھی اور بری خواہش سے پاک ہو جائے تو اس کے فعل کی کوئی غرض و غایت نہ ٹھہرے گی اور نہ اس کا کوئی محرک باقی رہے گا، اسی لیے اسلام کی تعلیم میں ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں، بلکہ ہر بری خواہش، ہر باطل غرض اور ہر نفسانی ہوا و ہوس کے ترک کا مطالبہ ہے، کیونکہ اسی کی پیروی سے گمراہی و ضلالت پیدا ہوتی ہے، وحی محمدی نے فرمایا:

﴿ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ ﴾ (٢٨/ القصص:٥٠)

❶ صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسه بالزنی: ٤٤٣١۔ ❷ ایضا: ٤٤٣٢۔

''اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے اللہ کی راہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی۔''

پھر فرمایا:

﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (۳۸/ ص:۲۶)

''اور خواہش نفسانی کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی۔''

عدل وراستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے، وہ اسی ھویٰ کے زہر قاتل سے مر جاتی ہے، فرمایا:

﴿ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ﴾ (۴/ النساء:۱۳۵)

''عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔''

ہوائے نفسانی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے، جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا، وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا اور اس کے امن کی جگہ جنت ہے، فرمایا:

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴾

(۷۹/ النازعات:۴۰۔۴۱)

''اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو بری خواہش سے روکا تو بیشک جنت ہے اس کے امن سے رہنے کی جگہ۔''

اخلاق اور محبتِ الٰہی

دین ودنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت اور پیار ہے، خاص کر وہ محبت اور پیار جو اللہ کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو، یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے، ان میں دیگر ضروریات دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسنِ اخلاق ہے، عقائد کے باب میں محبت الٰہی کے زیرِ عنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہو چکا ہے، مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو راۃ اور انجیل میں بھی ہے، مگر اصل سوال یہ ہے کہ اللہ کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے اور یہ دولت انسان کو کیونکر مل سکتی ہے، اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے، مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں داعی خیر کی پیروی محبتِ الٰہی کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی زبان سے فرمایا:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ (۳/ آل عمران:۳۱)

''کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

اس لیے آنحضرت کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق اور اعمال کی پیروی محبت الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، لیکن قرآن پاک نے اس مختصر جواب پر قناعت نہیں کی ہے، بلکہ نام بنام اس نے بتایا ہے کہ اللہ

کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں؟ اس سے اسلامی اصولِ اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کاموں سے جو اللہ کی محبت کا ذریعہ ہیں، حسن خلق بھی ہے اور ان امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے، بداخلاقی اور بدکرداری بھی ہے۔

پہلی صف میں حسب ذیل خوش قسمت انسانی جماعتیں داخل ہیں:

﴿ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران :٦٨)

''اور اللہ ایمان والوں کا دوست ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرة:۱۹۵ والمآئدة:۱۳)

''اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ ﴾ (۲/ البقرة :۲۲۲)

''اللہ توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۹)

''اللہ توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝ ﴾ (٥/ المآئدة:٤٢ حجرات ۷)

''اللہ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۝ ﴾ (۹/ التوبة:٤)

''اللہ تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:١٤٦)

''اور اللہ صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۝ ﴾ (۹/ التوبة:۱۰۸)

''اور اللہ پاک وصاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ ﴾ (٦١/ الصف:٤)

''اللہ ان کو پیار کرتا ہے، جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔''

ان آیات پاک میں نو باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو محبت الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی، جہاد۔

حسب ذیل صفتیں وہ ہیں جو محبت الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہیں:

﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران: ۳۲)

''تو اللہ کافروں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۝ ﴾ (٢/ البقرة:١٩٠)

''اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۝ ﴾ (٤/ النسآء:٣٦)

''اللہ اس کو پیار نہیں کرتا، جو اترانے والا ہو شیخی مارنے والا ہو۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا۝ ﴾ (٤/ النسآء :١٠٧)

''اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو خیانت کار اور گناہگار ہو۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۝ ﴾ (٨/ الانفال:٥٨)

''اللہ خیانت کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ۝ ﴾ (٢٢/ الحج:٣٨)

''اللہ کسی خیانت کار ناشکرے کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ۝ ﴾ (٢٨/ القصص:٧٦)

''اللہ اترانے والوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۝ ﴾ (٢٨/ القصص:٧٧)

''اللہ فساد کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۝ ﴾ (٦/ الانعام:١٤)

''اللہ فضول خرچ لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ۝ ﴾ (١٦/ النحل:٢٣)

''اللہ مغروروں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ۝ ﴾ (٤٢/ الشورٰى:٤٠)

''اللہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔''

﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ۝ ﴾ (٢/ البقرة: ٢٧٦)

''اللہ ناشکر گناہگاروں کو پیار نہیں کرتا۔''

کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے آگے بڑھ جانے، فخر، غرور، شیخی، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم، گناہ، وہ بداخلاقیاں ہیں، جو انسان کو محبت الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں۔

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب میں محبت الٰہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے۔

تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب

آنحضرت ﷺ کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لیے ہوئی، یعنی لوگوں کو سکھانا اور بتانا اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملاً بھی ان کو اچھی باتوں کا پابند اور بری باتوں سے روک کر، آراستہ و پیراستہ بنانا، اسی لیے آپ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ

﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۹)

''وہ (رسول) ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا اور پاک وصاف کر کے نکھارتا ہے۔''

اور اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ

((وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا)) [1]

''اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلمِ ربانی نے کن طریقوں سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا۔

ایک کامیاب معلم کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں ہوں، وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ میں نشتر ہو، جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو، جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے اور تندرست گوشت اور چمڑے کی پرورش ہو، اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ نہ زخم کو پاک کر سکتا ہے اور نہ فاسد گوشت پوست کی جگہ تندرست گوشت و پوست پیدا کر سکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیمِ اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا، مگر یہ کہ کوئی شریعت کے حدود کو توڑے تو اس کو سزا دیتے تھے، [2] قریش کی ایک بی بی چوری کے جرم میں پکڑی گئی، بعض مسلمانوں نے ان کی سفارش کرنی چاہی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو ان کو سزا دیتے تھے اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو ان کے احکام ٹال جاتے تھے۔'' [3]

یہ تو سختی کی مثالیں ہیں، نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک بدوی آیا، اتفاق سے اس کو استنجے کی ضرورت معلوم ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھ گیا، صحابہ رضی اللہ عنہم یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اس کو مارنے کو دوڑے، آپ ﷺ نے روکا اور فرمایا: ''تم سختی کے لیے نہیں بلکہ نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو۔'' اس

---

[1] ابن ماجہ، کتاب السنۃ، باب فضل العلماء:۲۲۹۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الادب باب قول النبی ﷺ: یسروا ولا تعسروا: ۶۱۲۶۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب کراھیۃ الشفاعۃ فی الحدود...... ۶۷۸۸۔

کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا: ''یہ عبادت کے گھر ہیں، یہ نجاست کے لیے موزوں نہیں، یہ اللہ کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کے لیے ہیں۔'' پھر لوگوں سے فرمایا: ''اس پر پانی بہا دو۔'' [1]

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان میں بحالت روزہ ایک غلطی ہوگئی، اس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور کے پاس لے چلو، انھوں نے کہا، یہ ہم سے نہ ہوگا، تو وہ اکیلا آنحضرت کے پاس پہنچا اور واقعہ عرض کیا، فرمایا: ''ایک غلام آزاد کرو۔'' عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس تو ایک غلام بھی نہیں، فرمایا: ''دو مہینے لگا تار روزے رکھو۔'' عرض کی، روزہ ہی میں تو یہ گناہ ہوا، فرمایا: ''تو اچھا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔'' عرض کی، ہم تو خود کنگال ہیں، فرمایا: ''اچھا بنی زریق کے صدقہ کے منتظم کے پاس جاؤ اور اس سے صدقہ لے کر پہلے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور جو بچے وہ تم اور تمہارے گھر والے کھائیں۔'' وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ میں آیا اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے اور حضور ﷺ نے کتنی نرمی کی۔ [2]

یہ اور اسی قسم کے واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حدود الٰہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا، وہاں نرمی نہیں برتی جاتی تھی، لیکن جن امور میں وسعت ہوتی یا جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل ورذائل کا موقع ہوتا تھا، آپ ﷺ نرمی سے سمجھا دیتے اور لطف ومحبت سے فرما دیتے تھے۔

ع قاہری با دلبری پیغمبری است

اخلاقی فضائل ورذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کیے گئے، کہیں کسی اخلاقی تعلیم کو حکمِ الٰہی بتا کر، کہیں اچھی اچھی مؤثر تشبیہوں کے ذریعہ، کہیں اس کے اچھے یا برے نتیجوں کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے۔

چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم میں کہیں فرمانِ الٰہی کی صورت اختیار کی اور کہا:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴾ (١٦/ النحل:٩٠)

''بے شک اللہ عدل اور احسان کرنے اور رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی کی بات اور ناپسندیدہ بات اور سرکشی سے منع کرتا ہے، تمھیں وہ نصیحت فرماتا ہے، تاکہ تم نصیحت پکڑو۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہِ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو اور ان سے بچو، تمام انسانوں کا جو اس قادر مطلق کے عاجز ودرماندہ بندے ہیں، یہ فرض ہے کہ وہ اس کے حکم کی پوری پوری تعمیل کریں، اس تعمیل میں بندوں کے چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابل نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب یسروا ولا تعسروا:٦١٢٨ وکتاب الوضوء: ٢٢٠؛ صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب وجوب غسل البول:٦٦١۔ [2] ابو داود، کتاب الطلاق، باب فی الظهار:٢٢١٣۔

سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگرداں ہو جائے، مثلاً: اللہ کی راہ میں دینا ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی تصویر یوں کھینچی گئی کہ ﴿ كَمَثَلِ حَبَّةٍ ﴾ (۲/ البقرہ: ۲۶۱) یہ نیکی ایک دانہ ہے، زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اگتا ہے اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں، اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے۔

ریاو نمائش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے، نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور نہ اللہ کے ہاں اس کا کوئی بدلہ ہے، قرآن نے اس کو یوں ادا کیا ﴿ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ ﴾ (۲/البقرۃ:۲۶۴) ''اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان اپنا بیج ایسی چٹان پر چھینٹ دے، جس پر ذرا سی مٹی پڑی ہو، جہاں ذرا زور کی بارش ہوئی تو بیج اور مٹی سب بہہ گئی اور چٹان دھل کر صاف ہوگئی، اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا۔ بے ایمانی سے یتیموں کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ ''جو ایسا کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔'' (۴/ النسآء:۱۰) پیٹھ پیچھے مسلمان کی برائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی: ''کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے۔'' (۴۹/ الحجرات:۱۲) کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے، آنحضرت ﷺ نے اس کی برائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے: ''جو دے کر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کر کے پھر چاٹتا ہے۔'' [1] اس سے زیادہ کوئی مکروہ تشبیہ اس بداخلاقی کی ہوسکتی ہے؟ قبیلہ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود آ کر عدالتِ نبوی ﷺ میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی، حضور نے تحقیقات کے بعد اس کے سنگسار کیے جانے کا حکم دیا، جب وہ سنگسار ہو چکا، تو آپ ﷺ نے ایک صاحب کو دوسرے سے یہ کہتے سنا کہ اس کو دیکھو کہ اللہ نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا، لیکن اس نے اپنے آپ کو نہیں چھوڑا اور کتے کی طرح سنگسار کیا گیا۔ حضور ﷺ یہ سن کر خاموش رہے، تھوڑی دور چلے تھے، کہ ایک گدھے کی لاش پڑی ملی، آپ ﷺ نے پکارا کہ ''فلاں فلاں صاحب کہاں ہیں؟'' انہوں نے کہا ہم یہ ہیں یارسول اللہ! فرمایا: ''اترو اور اس گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ۔'' انہوں نے عرض کی، اے اللہ کے رسول ﷺ! اس کو کون کھائے گا، فرمایا: ''تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھناؤنی بات ہے''۔ [2] غیبت کی برائی کو ذہن نشین کرنے کے لیے اس سے زیادہ مؤثر طرز کوئی ہوسکتا ہے؟

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور برے کاموں کے برے نتیجہ کو کھول کر بیان کر دیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار اور برے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے، اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے، مثلاً: شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا تو اس کے برے نتیجوں کو قرآن میں بوضاحت بیان

[1] صحیح بخاری، کتاب الهبة، باب لا یحل لاحد أن یرجع فی هبته: ۲۶۲۱۔

[2] ابوداود، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالك: ٤٤٢٨۔

کیا: ''مسلمانو! شراب، جوا اور پانسے کے تیر ناپاک ہیں، شیطان کے کام، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں عداوت اور دشمنی بڑھے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے۔'' (۵/ المآئدہ: ۹۰۔۹۱) شراب اور جوئے کے برے نتیجے یہ ہیں کہ ان کا خاتمہ اکثر کھیلنے والوں کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے اور انسان ان میں پھنس کر اپنے دین و دنیا کے فرض سے غافل اور بیکار ہو جاتا ہے، نتیجہ جانی و مالی بربادی ہوتی ہے۔ اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائلِ اخلاق کو الوہیت، ملکوتیت اور نبوت کے محاسن میں اور رذائل کو شیطان کے خصائص میں داخل کرتا ہے، جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے، مثلاً: عفو و درگزر کی تعلیم دی تو یوں فرمایا:

﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء: ١٤٩)

''اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ یا کسی برائی کو معاف کرو تو اللہ ہے معاف کرنے والا قدرت والا۔''

قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے، بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو، "تخلقوا باخلاق الله" گو صرف ایک مشہور مقولہ ہے، مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے۔ [1]

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو، تو کیا یہ بھی غرور ہے؟ فرمایا: ''نہیں۔''

((اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ)) [2]

''اللہ جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔''

اس لیے بندوں کو بھی چاہیے کہ اپنے طور و طریق و لباس میں سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھیں۔

مسلمانوں میں عزم و استقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو اس کو قرآن نے اس طرح کہا:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (٣٣/ الاحزاب: ٢١)

''تمہارے لیے اللہ کے رسول میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔''

حق کے مقابلہ میں ماں باپ، رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نمونہ سے دی گئی:

﴿ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ﴾ (٦٠/ الممتحنة: ٤)

[1] تفسیر بحر محیط، ابی حیان اندلسی زیر آیت مذکورہ ۳، ص: ۳۸۵۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر و بیانه: ٢٦٥؛ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الکبر: ١٩٩٩۔

’’تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔‘‘

ان دونوں آیتوں میں اخلاق کی بعض صفتوں کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کر کے اس کی بڑائی ظاہر کی ہے اور ان کی پیروی کی ترغیب دی ہے۔

فضول خرچی کی بری صفت سے مسلمانوں کو بچانا تھا تو اس کی برائی کو یوں ذہن نشین کرایا:

﴿ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۲۷)

’’بے شبہ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں۔‘‘

اب کون ہے جو شیطانوں کا بھائی ہونا پسند کرے گا۔

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی خوبی اور رذائل کی برائی جاہل عربوں کے ذہن نشین کر دی، جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ ایک صحابی دربارِ نبوت میں اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مجلس میں ایک شخص بیٹھا ہے، جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجالاتے ہیں، میں نے پوچھا، یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا، یہ اللہ کے رسول ہیں، یہ سن کر میں نے دو دفعہ کہا، اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ پر سلام، (علیک السلام) آپ ﷺ چپ رہے، پھر فرمایا: ’’علیک السلام نہ کہو، یہ مردہ کا سلام ہے، السلام علیک کہو۔‘‘ میں نے کہا کہ کیا آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا: ’’ہاں میں اس اللہ کا رسول ہوں جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو تو وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور اس سے خشک سالی میں مانگتے ہو تو وہ اُگا دیتا ہے اور جس سے تم جب کسی لق ودق بے نشان بنجر میں ہو، تمہاری سواری وہاں گم ہو جائے، تم دعا کرتے ہو تو وہ اس کو تمہارے پاس لوٹا دیتا ہے۔‘‘ میں نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے، ارشاد ہوا: ’’کسی کو برا نہ کہہ۔‘‘ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے اس فرمان کا یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام، یہاں تک کہ کسی جانور کو بھی برا نہیں کہا، آپ ﷺ نے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ ’’تم کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اس کو کیے جاؤ اور تم کو چاہیے کہ اپنے بھائی سے جب بات کرو تو تمہارا چہرہ کھلتا رہے، یہ بھی نیکی ہے اور اپنا تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھو، اگر یہ نہیں تو ٹخنے سے اونچا ضرور رہے، کیونکہ تہبند کو بہت نیچے تک لٹکانا غرور کی نشانی ہے [1] اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا اور اگر تمھیں کوئی گالی دے اور تم میں جو برائی وہ جانتا ہے، تم کو اس کی عار دلائے، تو تم اس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو، اس کو عار نہ دلاؤ، کہ اس کا وبال اسی کی گردن پر ہوگا‘‘۔ [2]

اس طریقہ تعلیم کی بلاغت پر غور کیجئے، کہ آپ ﷺ نے بدوی کو اللہ کے آگے جھکنے اور اس سے گڑگڑا کر مانگنے کے وہی موقعے یاد دلائے جو اس کی زندگی میں اللہ جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہوں گے، اس کا اثر یہ

---

[1] عرب امراء فخر وغرور کے لیے ایسا کرتے تھے جیسے عبا کے دامن یا گون کو زمین پر گھسیٹ کر چلنا دوسری قوموں میں غرور کی نشانی تھی۔

[2] سنن ابی داود، کتاب اللباس، باب ما جاء فی اسبال الازار: ۴۰۸۴۔

ہوا کہ اس کا دل سچائی کو پکار اٹھا اور حضورِ اقدس سے دین و دنیا کی نصیحت چاہی، ایک حکیم کا فرض یہ ہے کہ مریض کی حالت کو دیکھ کر نسخہ تجویز کرے، یہ نہیں کہ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ خواہ بیماری کوئی ہو پلاتا چلا جائے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مختلف پوچھنے والوں کے جواب میں ہر ایک کے مطابق الگ الگ باتیں بتائیں، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو جو تعلیم دی، اس کا نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو، پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تدبیریں بتائیں۔

ایک اور شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے نصیحت فرمایئے، ارشاد ہوا کہ ''غصہ نہ کر۔'' اس نے کئی دفعہ اپنا سوال دہرایا، آپ نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ ''غصہ نہ کر۔'' ❶ اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ہر شخص کا علاج اس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے، اس شخص میں غصہ ہی اتنا ہوگا کہ اس سے اس کے سبب سے بہت سی برائیاں ہو جاتی ہوں گی، اس لیے آپ ﷺ نے اس کے لیے یہ علاج تجویز فرمایا، جس کو وہ بادی النظر میں معمولی سمجھا اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی، لیکن آپ نے ہر بار یہی فرمایا: ''غصہ نہ کیا کرو۔''

ایک دفعہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! سب کاموں میں بہتر کام کیا ہے؟ فرمایا: ''اللہ پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔'' پھر پوچھا، کس غلام یا باندی کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے، فرمایا: ''جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر میں زیادہ پسندیدہ ہو۔'' پھر دریافت کیا کہ اگر ان نیکی کے کاموں میں سے کچھ نہ کرسکوں؟ فرمایا: ''تو کسی بے کس کی مدد کرو یا کسی بدسلیقہ کا کام کردو۔'' پوچھا: اگر یہ بھی نہ بن سکے؟ فرمایا: ''شر سے لوگوں کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کرسکتے ہو۔'' ❷

کبھی آپ ﷺ یہ کرتے کہ لوگوں سے سوال کرتے، وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے، آپ ﷺ ان کی اس توجہ کو مفید پاکر وہ جواب دیتے جو ان کے دل میں اتر جاتا، ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے آپ نے پوچھا: ''کہ تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟'' لوگوں نے عرض کی، ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو، نہ سامان ہو، فرمایا: ''میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گو نماز، روزہ اور زکوۃ کی نیکیاں لے کر آئے گا، لیکن اس نے اس کو گالی دی ہوگی، اس پر تہمت لگائی ہوگی، اس کا مال کھا گیا ہوگا، اس کا خون بہایا ہوگا، اس کو مارا ہوگا، تو اس کی نیکیوں میں سے کچھ کچھ ان لوگوں کو دے دیا جائے گا، اگر اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور اس کے ذمہ لوگوں کا کچھ باقی رہ گیا، تو ان کی برائیاں اس کے نام لکھ دی جائیں گی، پھر وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔'' ❸

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ آپ ﷺ نے یہ دریافت کیا کہ ''پہلوان تم کس کو کہتے ہو؟'' لوگوں نے کہا، جس کو لوگ

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب: ٦١١٦ والترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی کثرة الغضب: ٢٠٢٠۔ ❷ ادب المفرد للبخاری، باب ان کل معروف صدقة: ٢٢٥۔

❸ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ٦٥٧٩۔

کشتی میں پچھاڑ نہ سکیں، فرمایا: ''نہیں یہ پہلوان نہیں ہے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔'' ❶

اس شخص کو جس کے بچے نہ جیتے ہوں، صبر کی تلقین کرنی تھی، تو دریافت فرمایا کہ ''بے اولاد تم کس کو کہتے ہو؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، جس کے بچہ نہ ہو، فرمایا: ''وہ بے اولاد نہیں، بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگے نہیں بھیجی۔'' ❷ (احادیث میں ہے کہ جو بچے کمسنی میں مر جائیں اور ان کے والدین صبر کریں تو وہ قیامت میں ان کی شفاعت کریں گے) اس طریقہ ادا نے کس خوبی سے یہ دل میں بٹھا دیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہیں، بلکہ اگر اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت میں درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی۔

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ ''کیا میں تمھیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون اور برا کون ہے؟'' حاضرین چپ رہے، (شاید یہ سمجھے ہوں کہ آپ اس جماعت کے اچھے اور برے لوگوں کے نام لیں گے) آپ ﷺ نے دوسری بار یہی سوال کیا، پھر تیسری بار پوچھا، ایک شخص نے کہا، ہاں، یارسول اللہ! فرمایئے، ارشاد ہوا: ''تم میں سب سے اچھا وہ ہے، جس سے اچھائی کی امید کی جائے اور جس کی برائی سے لوگ امن میں ہوں اور تم میں سب سے برا وہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے اور جس کی برائی سے کوئی امن میں نہ ہو۔'' ❸

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھ سے کون یہ باتیں سیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے کہ وہ ان پر عمل کریں۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا، میں اے اللہ کے رسول! ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، کہ آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، پھر پانچ باتیں گن کر فرمائیں: ''گناہوں سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گزار ہو جاؤ گے، اللہ نے جو تم کو دیا ہے اس پر راضی رہو، تو سب سے بڑھ کر دولت مند ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن بنو گے، لوگوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے اور زیادہ ہنسا نہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مر جاتا ہے۔'' ❹ (یعنی دل کی صلاحیت جاتی رہتی ہے)

ایک دفعہ فرمایا: ''کون مجھ سے اپنے دو جبڑوں اور دونوں پاؤں کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے، میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں''۔ ❺ کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لیے اٹھے ہوں گے، ان دو فقروں کی بلاغت پر غور کرو، دونوں جبڑوں کے بیچ میں زبان ہے، جو ہر قسم کی قولی برائیوں کی جڑ ہے اور دونوں پاؤں کے بیچ میں انسان کی شرمگاہیں ہیں، جو ہر قسم کی بے حیائیوں اور بدکاریوں کی جگہ ہیں، ان دو کی حفاظت کی جائے تو انسان کی برائیوں کے بڑے حصہ کی اصلاح ہو جائے۔

ایک دفعہ فرمایا کہ ''کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے، میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا

❶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل من یملك نفسه عند الغضب: ٦٦٤١۔ ❷ ایضا۔
❸ ترمذی، کتاب الفتن، باب حدیث خیرکم من یرجی...... ٢٢٦٣ وباب فی خیار الأمراء وشرارهم: ٢٢٦٤۔
❹ جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب من اتقی المحارم فهوا علم الناس: ٢٣٠٥۔
❺ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان: ٦٤٧٤۔

ہوں۔'' آپ ﷺ کے غلام ثوبان نے اٹھ کر کہا، میں اے اللہ کے رسول! فرمایا: ''کسی سے کچھ مانگا نہ کرو۔'' چنانچہ انھوں نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا۔ ❶

سب کو معلوم ہے کہ ارض حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے، حجۃ الوداع میں آنحضرت منیٰ میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو دریافت فرمایا: ''لوگو! آج کونسا دن ہے؟'' لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں، عرض کی، اللہ اور اللہ کے رسول کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا: ''کیا یہ قربانی کا دن نہیں۔'' سب نے کہا: جی ہاں، پھر پوچھا: ''یہ کونسا مہینہ ہے۔'' پھر سب چپ رہے، سمجھے کہ آپ ﷺ اس کا نام کچھ اور بتائیں گے، فرمایا کہ ''کیا یہ ذی الحجہ نہیں۔'' سب نے کہا، جی ہاں، پھر فرمایا: ''یہ کونسا مقام ہے۔'' پھر سب خاموش رہے، کہ آپ ﷺ کوئی اور نام بتائیں گے، فرمایا کہ ''یہ بلد الحرام نہیں ہے۔'' سب نے کہا، جی ہاں، ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی تو فرمایا: ''مسلمانوں کا خون، مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمہارے لیے ایسی ہی محترم ہے جیسا یہ دن، اس مقام میں اور اس مہینہ میں۔'' ❷ کبھی خاص خاص صاحبوں کو ان کی مناسبت طبع دیکھ کر خاص خاص طور کی نصیحتیں فرماتے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ گویا فطرۃً تارکِ دنیا تھے، بڑے ہی زاہد و عابد تھے، ان کے ذوق طبع کو دیکھ کر ان سے فرمایا: ''اے ابوذر! جہاں رہو اللہ سے ڈرتے رہو، برائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اس کو مٹا ڈالو گے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو۔'' ❸

لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ صدقہ اللہ کی راہ میں صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے، آنحضرت ﷺ کو لوگوں کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا، تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تمہارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھٹکے ہوئے کو راہ بتا دینا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، ہڈی، یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی انڈیل دینا بھی صدقہ ہے۔'' ❹

صدقہ کی جو اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں تھی اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیوں کو صدقہ بتا کر آنحضرت ﷺ نے اس طریقہ ادا سے ان نیکیوں کی، کتنی اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں بٹھا دی۔

کبھی آپ ﷺ مسلمانوں سے مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے تھے، چنانچہ خود قرآن پاک میں ہے کہ ''جو عورتیں ایمان لانا چاہیں وہ بیعت میں رسول سے ان باتوں کا عہد کریں کہ وہ چوری نہ کریں گی، بدکاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی، بہتان نہ باندھا کریں گی اور کسی بھلے کام میں رسول کی نافرمانی نہ کریں گی۔'' (٦٠/ الممتحنة: ١٢)

---

❶ مسند احمد، ج٥، ص: ٢٧٥۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام منی: ١٧٤١، ١٧٤٢۔

❸ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی معاشرة الناس: ١٩٨٧۔

❹ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی صنائع المعروف: ١٩٥٦۔

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ ''ہم ہر حالت میں رسول ﷺ کی پیروی کریں گے اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل وانصاف کے ساتھ ٹھیک رکھیں گے اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے''۔ ❶

یہی عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے اور ان میں چند آدمیوں کو چن کر آپ ﷺ نے نقیب بنایا تو ان میں سے ایک میں بھی تھا، آنحضرت ﷺ نے ہم نقیبوں سے ذیل کی باتوں پر بیعت لی: ''ہم اللہ کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے، بدکاری نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے اور ناحق کسی کی جان نہ لیں گے، لوٹ مار نہیں کریں گے اور نافرمانی نہ کریں گے، اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی میں پورا کر دکھائیں گے تو ہمیں جنت ملے گی اور اگر اس میں کمی کی تو اس کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے۔'' ❷ اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا۔

بعض دفعہ حضور ﷺ ایک سوال کرتے تھے، سوال سن کر لوگ متوجہ ہو جاتے تھے، مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں، خود ہی جواب دے دیتے تھے، دریافت فرمایا کہ ''افترا کس کو کہتے ہیں؟ پھر خود ہی فرمایا: ''وہ چغلی ہے، لوگوں کے درمیان بات کو ادھر سے ادھر پہنچانا۔'' ❸ ایک بار ارشاد ہوا کہ ''تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں۔'' لوگوں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول جانتا ہے، فرمایا: ''تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اس کو ناپسند ہو۔'' کسی نے کہا، اگر میرے بھائی میں وہ برائی واقعی موجود ہو تو، فرمایا: ''اگر اس میں ہے تب ہی تو وہ غیبت ہے، ورنہ پھر وہ بہتان ہے۔'' ❹ ایک موقع پر ارشاد ہوا: ''میں تمھیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، ہاں یا رسول اللہ! فرمایا: ''ہر کمزور نرم دل جس کو لوگ حقیر جانیں یا جو متواضع ہو، (لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ) اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ اس کی قسم پوری کر دے۔'' پھر فرمایا: ''کیا میں تمھیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، ہاں یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا: ''ہر درشت مزاج، شیخی خور، مغرور۔'' ❺

کبھی آنحضرت ﷺ آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اس کو بار بار دہراتے، حاضرین اس بار بار کی تکرار سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے اور مشتاق ہو کر پوچھتے کہ یا رسول اللہ! یہ کیا بات ہے، اس وقت آپ ﷺ جواب ارشاد فرماتے جس کا اثر ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا، ایک دفعہ خود سے فرمایا: ''اللہ کی قسم! وہ صاحب ایمان نہ ہوا، اللہ کی قسم! وہ صاحب ایمان نہ ہوا، اللہ کی قسم! وہ صاحب ایمان نہ ہوا۔''

❶ مسند احمد بن حنبل، ج ٥، ص: ٣١٨۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الدیات: ٦٨٧٣۔
❸ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم النمیمة: ٦٦٣٦۔
❹ ایضًا، باب تحریم الغیبة: ٦٥٩٣۔
❺ صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب النار یدخلها الجبارون......: ٧١٨٧۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے مشتاقانہ پوچھا، کون یارسول اللہ! فرمایا: ''جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہوا۔'' [1]

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: ''دین داری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! کس کے ساتھ، فرمایا: ''اللہ کے ساتھ، اس کی کتاب کے ساتھ، اس کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے سرداروں کے ساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ''۔ [2]

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصول اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کے ان اخلاقی تعلیمات کا استقصا کیا جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملیں، ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کردیا ہے، حقوق، فضائل ورذائل اور آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے، یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے، اس کا نام فضائلِ اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے، مثلاً: سچ بولنا، اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے۔

تیسری قسم، کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجا لانا ہے، اس کو آداب کہتے ہیں، مثلاً: اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور وطریق۔ ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے۔

---

[1] صحيح بخاري، كتاب الادب، باب اثم من لا يأمن جاره بوائقه:٦٠١٦؛ صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان تحريم إيذا الجار:١٧٢ میں ((لا يدخل الجنة من لا يأمن جاره بوائقه)) کے الفاظ ہیں۔

[2] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان أن الدين النصيحة:١٩٦۔

حقوق وفرائض

حقوق کے معنی

حقوق کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی، لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی مزید تفصیل کر دی جائے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

﴿ خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ﴾ (۲/ البقرة: ۲۹)

''اللہ نے تمہارے (کام کے) لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔''

اس لیے انسان کو دنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے، ایک گونہ لگاؤ ہے، اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی وحفاظت میں کوشش کی جائے، اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لیے اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے اور ان موقعوں پر اس کو صرف کیا جائے جن میں اللہ نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے، اسی ذمہ داری کا نام حق ہے، جس کو از خود ادا کرنا ضروری ہے، ارشاد ہوا:

﴿ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴾ (۵۱/ الذاريات: ۱۹)

''اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔''

﴿ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۝ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴾ (۷۰/ المعارج: ۲۴۔۲۵)

''اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا مقررہ حق ہے، جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔''

﴿ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۲۶)

''اور قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔''

﴿ فَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ ﴾ (۳۰/ الروم: ۳۸)

''تو قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔''

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے، ان کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے، یہ ان کا حق ہے اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں، پھر غریب، مسافر، ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے:

﴿ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۖ وَلَا تُسْرِفُوا ﴾ (۶/ الانعام: ۱۴۲)

''اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے دن ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو۔''

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی اور پھل پھول نکلے اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے اور

اس میں سے ان کو بھی کچھ دے، جن کو یہ نعمت نہیں ملی اور اس نعمت کو بے موقع خرچ نہ کرے اور ضائع نہ کرے کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے اور اس کی نفع رسانی کے ضروری موقع ومحل کو نقصان پہنچاتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

((ان لزوجك عليك حقا و لزورك عليك حقا)) ❶

''تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق اور تیرے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔''

((و لأهلك عليك حقا)) ❷

''تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے۔''

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ''بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ وہ اس کو کھانا کھلائے، کپڑے پہنائے اور اس کے چہرہ پر تھپڑ نہ مارے۔'' ❸ ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے کچھ حقوق ہیں، بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے، اس کے ایک ایک عضو کا اس کے اوپر حق ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((فان لنفسك عليك حقًا)) ❹

''بیشک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔''

((فان لجسدك عليك حقًا و لعينيك عليك حقًا)) ❺

''تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے، جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔

حقوق کی وسعت

جب انسان کا تعلق کائنات ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی اس کی ہر چیز سے متعلق ہے، جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع نہ صرف کیا جائے، نباتات سے بھی کہ ان کو نشوونما اور تربیت کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے اور ان کے آرام و آسائش کا خیال کیا جائے اور انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور ان کے فریضہ محبت کو ادا کیا جائے اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ اسکا ہر عضو جس غرض کیلئے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسب طور سے وہ کام لے۔

❶ صحيح بخاري، كتاب الصوم، باب حق الجسم في الصوم: ١٩٧٥۔ ❷ صحيح بخاري، كتاب الصوم، باب حق الاهل في الصوم: ١٩٧٧۔ ❸ ابوداود، كتاب النكاح، باب في حق المرأة على زوجها: ٢١٤٢۔ ❹ صحيح بخاري، كتاب التهجد: ١١٥٣۔

❺ صحيح بخاري، كتاب الصوم، باب حق الجسم في الصوم: ١٩٧٥۔

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیط اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہیں، لیکن انسان کے علاوہ اس کائناتِ ارضی کی دوسری بے جان اور جاندار چیزوں کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ، توضیحِ مقصد کے لیے مفید ہے۔

انسان کے علاوہ دوسری جان دار اور بے جان چیزوں کے دو حق انسان پر ہیں، ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لیے وہ پیدا کی گئی ہیں، ان سے وہی کام لیا جائے، دوسرا یہ کہ ان کے قدرتی نشوونما، پرورش اور ترقی میں وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے، بلکہ اس کے مناسب اسباب فراہم کرے اور اس کے مناسب غذا، سیرابی اور آرام کی فکر رکھے، یہ دونوں حقوق اصل میں قرآن پاک کی اسی حقیقت کے کہ

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (۲/ البقرۃ:۲۹)

''زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ نے تمہارے (یعنی انسانوں کے) لیے پیدا کیا۔''

کے صریح نتیجے ہیں، کہ جب انسان کیلئے یہ سب چیزیں پیدا ہوئیں، تو انسان کا فرض ہے کہ ان سے وہی کام لے جس کیلئے وہ بنائی گئیں اور اس لیے، تاکہ وہ وقتِ مقررہ تک انسانوں کو اپنا نفع پہنچا سکیں، ان کی پرورش و ترقی کے قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا۔

آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع میں ایک تمثیلی حکایت میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے، فرمایا کہ ''ایک دفعہ ایک آدمی بیل پر سوار جا رہا تھا کہ دفعتہً اس نے منہ پھیر کر سوار سے کہا کہ میں تو اس کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہوں، میں تو کھیتی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔'' ❶ اور اسی لیے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا اور فرمایا گیا: ''جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے، تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں، اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے۔'' ❷ اسی سبب سے پھلدار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسندیدہ ہے۔ ❸

ایک اور تمثیلی حکایت میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک شخص صرف اس لیے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی ❹ اور ایک اور شخص پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھا اور اس کو کھانے پینے کو نہیں دیا یہاں تک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مرگئی، ❺ ایک اور شخص نے چیونٹی کو جلا دیا تھا، اس پر اس سے باز پرس ہوئی۔'' ❻

❶ صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ، باب استعمال البقر للحراثۃ: ۲۳۲۴۔

❷ صحیح بخاری، باب فضل الزرع والغرس: ۲۳۲۰ ومسلم کتاب المساقاۃ: ۳۹۶۸ تا ۳۹۷۳۔

❸ فتح الباری شرح صحیح البخاری، شرح باب مذکور، جلد خامس، ص: ۷ مصر۔

❹ صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب الآبار علی الطریق: ۲۴۶۶۔

❺ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب فی ... : ۳۳۱۸۔ ❻ ایضًا: ۳۳۱۹۔

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لیے بھی بیان کیے گئے ہیں، تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے، وہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے، جن کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

حقوق کی ترتیب

مگر ان تمام حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے، جس کی تفصیل ذیل میں ہے۔

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو توراۃ وانجیل کی طرح مختصر یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا لیکن صرف ''محبت کرنا'' کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ ان چیزوں کی تفصیل کرنی چاہیے، جو اس محبت کا تقاضا اور اس کے مظاہر ہیں، یہی تفصیل وتکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لیے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لیے رکھتے ہو''۔ [1] اس سے معلوم ہوا کہ جسم و جان اور مال وملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم و جان اور مال وملکیت کے لیے چاہتا اور پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لیے چاہنا اور پسند کرنا توراۃ و انجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سرعنوان ہے، لیکن اسلام میں یہ سرِ عنوان تشریح کا محتاج ہے اور اس تشریح کے ضمن میں انسانی تعلیمات کی تدریجی ترتیب کی بحث آ جاتی ہے، جس کو اسلام نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی اور دوری ونزدیکی کی تدریج اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے، مثلاً: ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی مدد، ایک اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی، غیروں اور بیگانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی اور ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری ونزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ہے، مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے، اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو، تو اس کے مقابلہ میں اس غیر و بیگانہ کی امداد جو حق پر ہے، فرض ہے، کہ جو مدد محض قرابت اور عزیزداری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے، اس کا نام اسلام کی اصطلاح میں عصبیت (تعصب) ہے، جس سے بچنے کی ہر [2] مسلمان کو تاکید کی گئی ہے۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے، انسان اور حیوان کے درمیان بھی خط فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے، مثلاً: بودھ کی اخلاقی تعلیمات میں انسان وحیوان کے اور پھر انسانوں میں اہل ملک، قوم، قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں، بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں آتی، اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر درجہ رکھتا ہے اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پا سکتا ہے، یہودیت اور عیسائیت میں تمام

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان......:۱۳؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان:۱۷۰، ۱۷۱۔

[2] سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی العصبیۃ:۵۱۲۱۔

قرابت داروں کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے برترانہ حقِ اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن دوسرے قرابت مندوں اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا ہے، لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔ اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے، اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی دوہری تہری ہو جاتی ہے، مثلاً: ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کر سکتا ہے، اس کی ایک غریب بیمار ماں ہے، ایک غریب اور بیمار باپ ہے، ایک غریب اور بیمار بھائی ہے، ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے، پھر اسی حالت میں اس کا ہم محلہ دار بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے، تو اس کو کس کی مدد کرنی چاہیے، یہی وہ موقع ہے جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے، ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے حقوق پہلے ماں کے ہیں، پھر باپ کے ہیں، پھر بھائی کے ہیں، پھر پڑوسی کے ہیں، پھر ہم وطن کے ہیں اور اسی ترتیب سے اس کا ادا کرنا بھی ضروری ہے، یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائے، یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید مزاحمت گوارہ کر کے، دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو، اگر ایسا وہ نہ کر سکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا، شریعتِ محمدی ﷺ نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے:

﴿ وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ﴾ (٤/ النسآء:٣٦)

''اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور رشتہ داروں پڑوسی کے ساتھ اور بے گانہ پڑوسی کے ساتھ اور ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور لونڈی، غلام کے ساتھ۔''

﴿ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (٢/ البقرۃ:٢١٥)

''اے پیغمبر ﷺ ان سے کہہ دو کہ تم جو خرچ کرو، وہ اپنے ماں باپ اور عزیزوں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافر کے لیے اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو، اللہ اس سے آگاہ ہے۔''

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ ﴾ (١٧/ بنی اسرآئیل:٢٦)

''اور رشتہ دار کا حق ادا کرو اور مسکین کا اور مسافر کا اور فضول خرچی نہ کرو۔''

عام طور سے اکثر مذہبوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے اور اسلام میں بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے مگر اس کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب ہیں۔

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے، بلکہ تینوں میں ان کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے:

''تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تا کہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے، دراز ہو۔'' (خروج ۲۰۔۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے:

''تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے۔'' (احبار ۱۹۔۳)

انتہا یہ ہے کہ تورات نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ

''اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کرے مارڈالا جائے گا، اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی پر ہے۔'' (احبار ۲۰۔۹)

''اور وہ جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا۔'' (خروج ۲۱۔۷)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی صرف لفظی تعلیم نہ کی جائے، بلکہ ان کے روح و معنی کا خیال کیا جائے، فرمایا:

''کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب ہے سو خدا کی نذر ہوا اور اپنے ماں باپ یا ان کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں، پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا۔'' [1]

نبوتِ محمدی ﷺ جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے اس نے تورات و انجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور ان سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا۔

① اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کمزوری، بیچارگی اور حمل، وضعِ حمل اور تربیتِ اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا، ماں کی بڑائی اس کی سب سے پہلے دل دہی کرنے اور اس کی فرمانبرداری کرنے کی

[1] اسکے علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں توراۃ کے الفاظ کا بعینہ اعادہ ہے مثلاً: متی ۱۹۔۱۹ مرقس ۷۔۱۰،۱۰۔۱۹ لوقا ۱۸۔۲۰۔

سب سے بڑی دلیل ہے:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۴)

''اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی، اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا اور دو برس تک دودھ پلایا۔''

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ ﴾ (۴۶/ الاحقاف:۱۵)

''اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ نیکی کرے، اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ جنا، پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا، پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلا کر چھڑانا تیس مہینے ہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی، ایک شخص نے خدمت اقدس میں آ کر دریافت کیا کہ یارسول اللہ! سب سے زیادہ میرے حسنِ سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا: ''تیری ماں۔'' پوچھا، پھر کون؟ فرمایا: ''تیری ماں۔'' اس نے عرض کی، پھر کون؟ فرمایا: ''تیری ماں۔'' تین دفعہ آپ ﷺ نے یہی جواب دیا، چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا: ''تیرا باپ۔'' [1] ایک دن آنحضرت ﷺ نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرِ فہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا: ''تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے۔'' [2] ایک دفعہ ایک شخص نے آ کر عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے، کیا میرے لیے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا: ''کیا تیری ماں زندہ ہے؟'' جواب دیا نہیں۔ دریافت کیا: ''خالہ ہے؟'' گزارش کی، ہے، فرمایا: ''تو اس پر نیکی کر۔'' [3] یہی اس کی توبہ بتائی۔ ایک اور صحابی نے دریافت کیا، یارسول اللہ ﷺ! میں نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپ ﷺ سے مشورہ چاہتا ہوں، فرمایا: ''کیا تمہاری ماں ہے؟'' جواب اثبات میں دیا۔ فرمایا: ''تم اسی کے ساتھ چپٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔'' [4]

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم میں مخلوقات انسانی میں جنسِ لطیف کی ہی ایک صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے۔ انسان سب سے زیادہ اپنے وجود میں جن کا ممنون ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہیں، وہ خالق اکبر کی علت فاعلہ ذات کے بعد ماں

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من احق الناس بحسن الصحبة:۵۹۷۱۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر: ۵۹۷۵۔ [3] جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب فی بر الخالة: ۱۹۰۴۔ [4] سنن النسائی، کتاب الجهاد، باب الرخصة فی التخلف لمن له والدة:۳۱۰۶؛ ابن ماجه، ابواب الجهاد، باب الرجل یغزو وله أبوان:۲۷۸۱؛ ترغیب وترهیب منذری، ج ۲، ص: ۱۲۴۔

اور باپ ہیں، لیکن باپ کی مادی علت چند لمحوں اور چند قطروں سے زیادہ نہیں، مگر ماں وہ ہستی ہے، جس نے اس کی ہستی کو اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہہ کر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا، پھر اس کے جننے کی ناقابل برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا، پھر اس نو پید امضغۂ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا اور اس کی پرورش اور غور پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان، اپنا ہر ایمان ترک اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی۔ ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی اور کا محتاج ہے؟ اس لیے شریعتِ محمدی ﷺ نے اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے، وہ اس کی سزاوار ہے۔

② ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی بچہ کی تولید و تکوین میں شریک ہے، وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں، اس لیے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچتا ہے، تو اس پر فرض ہے کہ اپنی ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے، چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی ''عزت'' کرنے اور ان سے ڈرتے رہنے کے وعظ پر اکتفا کی، بلکہ ان کی خدمت، ان کی اطاعت، ان کی امداد اور ان کی دلدہی، ہر چیز پر فرض قرار دی، بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر اف تک نہ کرو، ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو، ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو، انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے، بلکہ انہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسن سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید بارہ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی ہے اور اکثر موقعوں پر، تعلیم، توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے کہ پہلی تخلیق انسانی کی علتِ فاعلی اور دوسری علت مادی ہے، سب سے پہلی آیت سورۂ بقرہ میں ہے جس میں تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے، فرمایا:

﴿ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا ٱللَّهَ وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَانًا ﴾

(۲/ البقرۃ:۸۳)

''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم نہ پوجو گے مگر اللہ کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔''

یہ آیت پاک گو اس حکم کا اعادہ ہے جو توراۃ کی آیتوں میں ہے، لیکن یہاں توراۃ کی طرح صرف ماں باپ کی عزت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں بلکہ ''نیکی کرنے'' کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے، جس سے تعلیم کے مفہوم میں بڑی وسعت آ گئی ہے اور ہر قسم کی خدمت اطاعت اور عزم کا مفہوم اس کے اندر پیدا ہے۔ اسی صورت میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے:

﴿ قُلْ مَآ أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَٰلِدَيْنِ وَٱلْأَقْرَبِينَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱۵)

''فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، وہ ماں باپ اور رشتہ داروں (وغیرہ) کے لئے۔''

سورۂ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کی جاتی ہے:

﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾ (٤/ النسآء:٣٦)

''اور اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔''

کفار کو جنہوں نے اپنے وہم وخیال اور رسم ورواج سے حلال وحرام کی ہزاروں رسمیں اور خیالی باتیں پیدا کر لی تھیں، اللہ تعالیٰ خطاب کر کے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں، آؤ ہم بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں، خدا کے ساتھ شرک نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش آنا:

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ﴾

(٦/ الانعام:١٥١)

''کہہ (اے پیغمبر ﷺ!) آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔''

معراج کے احکام دوازدہ گانہ میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم اس اہتمام کے ساتھ دی جاتی ہے کہ ان کے سامنے اف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، ان کے حق میں دعائے خیر کرو اور بڑھاپے میں ان کی خدمت کرو، فرمایا:

﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ ﴾

(١٧/ بنیٓ اسرآئیل: ٢٣-٢٤)

''اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا، اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، تو ان کو اف بھی نہ کہو اور نہ ان پر خفا ہو اور ان سے ادب سے بولو۔ اور ان کے لیے اطاعت کا باز و محبت سے جھکاؤ اور کہو کہ اے میرے پروردگار! تو ان پر رحمت فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔''

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے۔

خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی، اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی ان کی خدمت سے ہاتھ اٹھانا روا نہیں، بجز اس کے کہ اگر وہ شرک کی دعوت دیں تو ان کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے۔ ارشاد ہوا:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۸)

''اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں تو ان کا کہنا نہ مان، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، تو میں تم کو تمہارے کرتوت سے آگاہ کروں گا۔''

اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر تمہارے بت پرست ماں باپ تم کو بت پرستی کی دعوت دیں تو صرف ان کی دعوت کو قبول نہ کرو، لیکن ان کی دنیاوی خدمت اور حسنِ سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے، بلکہ وہ اس حالت میں بھی اپنی جگہ پر قائم رہے فرمایا:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ۝ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۴۔۱۵)

''اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کر اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا، کہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے، میرے ہی پاس پھر آنا ہے، اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو ان کا یہ کہنا نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی سے گزران کر۔''

اس اہتمام کو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسان مندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ کرتا ہے اور اس شرک پرستی کی دعوت اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسی قدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب میں ان کی بات اولاد نہ مانے، مگر دوسری باتوں میں ان کا ادب، ان کی اطاعت اور ان کی خدمت کا وہی عالم رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا مگر اپنے وعدہ کی بنا پر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً ان کی دعا سے مراد یہ ہوگی کہ وہ ایمان لا کر حسنِ خاتمہ پر مرے:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ ﴾ (۱۴/ ابراھیم:۴۱)

''اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔''

حضرت نوح علیہ السلام نے بھی یہی دعا کی:

﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ ﴾ (۷۱/ نوح:۲۸)

''میرے پروردگار! مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔''

اس لیے والدین کے حسن خاتمہ اور مغفرت کی دعا مانگنا انبیا علیہم السلام کی پیروی ہے، آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں ان کی خدمت بجا لاتے ہیں اور ان کے لیے خدا سے دعائے خیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ میں ان کے سارے گناہ معاف کر دیتا اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت ان کو عطا فرماتا ہے:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۖ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ۝ ﴾

(٤٦/ الاحقاف:١٥۔١٦)

''اور ہم نے انسان کو تاکید کر کے کہہ دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اس کی ماں نے اس کو تکلیف کر کے پیٹ میں اٹھایا اور تکلیف کر کے جنا اور تیس مہینوں تک اس کو پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا، یہاں تک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان ہوا اور چالیس برس کا ہوا، اس نے کہا کہ میرے پروردگار! مجھ کو توفیق دے کہ تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر میرے ماں باپ پر کیا اور اس کی کہ میں وہ کام کروں جس کو تو پسند کرے اور میری اولاد نیک کر، میں تیری طرف لوٹ کر آیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں ہوں، یہی وہ ہیں جن کے اچھے کام ہم قبول اور ان کے برے کاموں سے درگزر کرتے ہیں، یہ جنت والوں میں ہوں گے، یہ سچائی کا وہ عہد ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا۔''

ان آیتوں نے والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت واطاعت ورضامندی کو وہ پانی بتایا ہے جس سے گناہوں کی فرد دھل کر صاف ہو جاتی ہے، احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسی منشائے الٰہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں ادا فرمایا ہے، کہیں فرمایا ہے کہ ''ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔'' [1] کبھی ارشاد ہوا: ''رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے۔'' [2] کسی نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! میرے حسن معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا: ''تیری ماں۔'' دریافت کیا، پھر کون؟ فرمایا: ''تیری ماں۔'' عرض کی، پھر کون؟ فرمایا: ''تیری ماں۔'' گزارش کی، پھر کون؟ چوتھی بار فرمایا: ''تیرا باپ اور اس کے

---

[1] نسائی، کتاب الجهاد، باب الرخصة فی التخلف لمن له والدة:٣١٠٦؛ مسند امام أحمد، ج٣، ص:٤٢٩۔

[2] جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء من الفضل فی رضا الوالدین:١٨٩٩۔

بعد جو اس سے قریب ہے، پھر جو اس سے قریب ہے۔'' ❶ ایک دفعہ حضور انور ﷺ مجلس قدس میں تشریف فرما تھے، جاں نثار حاضر تھے فرمایا: ''وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا۔'' صحابہ نے پوچھا، کون؟ یا رسول اللہ ﷺ! ارشاد ہوا: ''وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت حاصل کر لی۔'' ❷ ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے، فرمایا: ''وقت پر نماز پڑھنا۔'' عرض کی، پھر کون سا؟ ارشاد ہوا: ''ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔'' دریافت کیا، پھر کون؟ فرمایا: ''خدا کی راہ میں محنت اٹھانا۔'' (جہاد)۔ ❸

ایک دفعہ آپ ﷺ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت موثر حکایت میں بیان فرمایا ارشاد ہوا کہ ''تین مسافر راہ میں چل رہے تھے، اتنے میں موسلا دھار پانی برسنے لگا، تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، قضارا ایک چٹان اوپر سے ایسی گری کہ اس سے اس غار کا منہ بند ہو گیا۔ اب ان کی بے کسی و بیچارگی اور اضطراب و بے قراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے، ان کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی، اس وقت انہوں نے پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دربار الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہیے، ایک نے کہا، بار الٰہی تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، میں بکریاں چراتا تھا اور انہی پر ان کی روزی کا سہارا تھا، میں شام کو جب بکریاں لیکر گھر آتا تھا تو دودھ دوھ کر پہلے اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا، ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کو دور نکل گیا، لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے۔ میں دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہوا، نہ ان کو جگاتا تھا کہ ان کی راحت میں خلل آ جاتا اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھیں کھلیں اور دودھ مانگیں، بچے بھوک سے بلک رہے تھے مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں، میں اسی طرح پیالہ میں دودھ لیے رات بھر سرہانے کھڑا رہا اور وہ آرام کرتے رہے۔ خداوند! اگر تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ کام تیری خوشنودی کے لیے کیا تو اس چٹان کو اس غار کے منہ سے ہٹا دے، یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خود بخود جنبش ہوئی اور غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی، اس کے بعد باقی مسافروں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر دعا کی اور غار کا منہ کھل گیا۔'' ❹

اسلام میں جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے مگر والدین کی خدمت گزاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں کہ جہاد کے میدان میں سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہوتا ہے اور ہر

❶ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی بر الوالدین: ۱۸۹۷۔

❷ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب رغم من ادرك ابويه أو احدهما عند الكبر.....: ۶۵۱۰، ۶۵۱۱۔

❸ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی بر الوالدین: ۱۸۹۸۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب اجابة دعاء من برّ لوالديه: ۵۹۷۴۔

وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے، اس لیے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے جسم و جان کو کھونے کا حق نہیں، جس کو اس کی خدمت گزاری کے لیے وقف ہونا چاہیے تھا، اسی لیے ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گزاری کے بعد رکھا، ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر خدمت اقدس میں شرکتِ جہاد کی اجازت طلب کی۔ دریافت فرمایا: ''تمہارے ماں باپ بھی ہیں۔'' عرض کی، جی ہاں، ارشاد ہوا: ''تو پھر انہی کی خدمت کا فریضۂ جہاد ادا کرو۔'' ❶

قرآنِ پاک کی صریح آیتوں میں خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت کا ذکر ہے احادیث میں بھی وہی درجہ رکھا گیا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ''تم پر خدا نے ماؤں کی نافرمانی حرام کی ہے۔'' ❷ ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو خدمت میں حاضر تھے، دریافت کیا کہ ''کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں؟'' انہوں نے عرض کی، ضرور یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا کہ خدا کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے سیدھے ہو کر برابر ہو گئے اور فرمانے لگے: ''اور جھوٹی گواہی۔'' ❸

توراۃ میں حقوقِ والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے جو بے حد سخت تھے۔ وحی محمدی ﷺ نے بعض حیثیتوں سے ان میں تخفیف کر دی ہے اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے، مثلاً: توراۃ کا یہ حکم تھا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے، اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے بجائے اخروی سزا کا موجب قرار دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتے ہیں اور مجرم کو اپنے فعل پر نظر ثانی کی تازندگی مہلت ملتی ہے، لیکن اگر اس نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر عذاب بھی ہے، جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے، اسلام کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سنگ دل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتوں میں وہ اس کے قصاص میں قتل نہ ہوگا بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہوگا، کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے اس کا مقتضا یہی ہے کہ اس کے فعل کو قتل بالقصد کے بجائے اتفاقی سمجھا جائے، تاکہ اس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو۔ ❹ اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے، تورات نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دے کر دوسری طرف بیوی کے سامنے ان کو بالکل

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لا یجاھد الاباذن الابوین:۵۹۷۲۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر:۵۹۷۵۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر: ۵۹۷۶۔ یہ تمام واقعات اور اقوال عام کتب حدیث میں مذکور ہیں خصوصیات کے ساتھ دیکھو، بخاری، کتاب الادب، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، جامع ترمذی کتاب البر والصلة۔ مشکوۃ باب مذکور۔ ❹ فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہیں، احناف اور شوافع کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہے ورنہ نہیں اور ظاہر یہ کہ اصول کے مطابق قتل عمد کی ہر صورت میں قصاص ہے اور یہی قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ باپ کے وفور شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلا قصد سمجھا گیا ہے اس لیے اکثر فقہا نے اس کو قتلِ خطا سمجھ کر قصاص کے بجائے اس پر دیت لازم کی ہے الآیہ کہ دلائل وقرائن باپ کے سوئے قصد کو ظاہر کرتے ہوں۔

بے قدر کر دیا ہے، لکھا ہے:

''اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔'' (پیدائش ۲۔۲۴)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی جو گو (انجیل کے بیان کے مطابق) ماں باپ اور بیوی تینوں سے نا آشنا تھے تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ میں ہے ماں باپ کے مقابلہ میں بیوی کی طرف داری اور حمایت کی اور اسی لیے طلاق کو ناجائز قرار دیا، (مرقس ۱۰۔۷۔۸) مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابلِ حل اختلاف ہو اور اس لیے ان دونوں میں سے کسی کو مجبوراً ترجیح دینا پڑے تو کیا صورت اختیار کی جائے، اسلام کا حکم ہے کہ اس حال میں بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کو قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے جو ٹوٹ کر جڑ سکتا ہے اور مٹ کر بدل سکتا ہے، لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابل شکست اور ناقابل تغیر ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک بیوی تھیں جن سے وہ راضی تھے، مگر ان کے پدر بزرگوار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بہو پسند نہ تھیں، اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی، آنحضرت ﷺ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو مشورہ دیا کہ وہ باپ کی اطاعت کریں۔ [1]

[1] جامع ترمذی، کتاب الطلاق، باب ما جاء فی الرجل یسأله أبوه أن یطلق زوجته: ۱۱۸۹۔

اولاد کا حق

اصولِ تعلیم

جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں، اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں اور یہ وہ عنوان ہے، جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا اور اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے، مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا، اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ جو مذہب لے کر تشریف لائے اس کی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں، وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے، اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے، آنحضرت ﷺ نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتا دیا ہے جو ان تمام حقوق کی نہایت جامع متن ہے، ان حقوق کی جس قدر تشریح کی جائے، یہ متن ان سب پر محیط ہے، فرمایا:

((لیس مِنّا من لم یرحم صَغِیْرنا وَلَمْ یوقر کبیرنا)) [1]

''جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔''

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں، یہ وہ اصول ہے، جس پر چھوٹوں اور بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام میں قائم کی گئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت میں چھوٹوں، بڑوں، افسروں، ماتحتوں، آقاؤں، نوکروں اور بزرگوں اور عزیزوں کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزردگی پیدا نہ ہونے پائے، جب کبھی چھوٹوں اور بڑوں میں کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے، کہ ترازو کے ان دونوں پلڑوں میں توازن قائم نہیں رہا ہے۔ حکیموں اور مقنّنوں کے بنائے ہوئے نظم و انتظام کے سارے مشرح و مفصل قانون اور قاعدوں کا بے پایاں دفتر جو کام نہیں کر سکتا وہ نبی امی ﷺ کے یہ دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں، اگر واقعتاً کسی جماعت میں یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانون کا بارِ گراں بھی پھر اس کو برابر نہیں کر سکتا۔ اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب اللہ نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے تو وہ بالقصد اس کے نقشِ زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنیں، بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کی نشو و نما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہیں، یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے اور ذریعہ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہیں سمجھا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔

---

[1] جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی رحمة الصبیان: ۱۹۱۹۔

اولاد کشی کا انسداد

عرب کے سفا کانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی اور سنگدلی کا کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تھا، یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے، اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب تھے، ایک تو مذہبی تھا، یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے خود ذبح کر کے ان پر چڑھا دیتے تھے، منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہوگا تو اپنے بچہ کی قربانی کریں گے، [1] یہ قابل نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں جاری تھی، رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں ''اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا، اس قتل کی کوئی بازپرس نہ تھی اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت سے رواج تھا''۔ [2] اور سب سے زیادہ ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی صورت میں رائج تھا، اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں دیوتاؤں کی خوشی اور نذرانے کے لیے ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی جاتی تھیں، قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے: [3]

﴿ وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴾ (٦/ الانعام: ١٣٨)

''جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں اللہ برحق کے ساتھ ان کے دیوتاؤں نے اپنا حصہ لگا لیا ہے، اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے دیوتاؤں نے یہ بات خوبصورت کر کے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیں، تاکہ یہ دیوتا ان کو (ہمیشہ کے لیے) ہلاک کر دیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے، تو ان مشرکوں کو اور جو کچھ وہ اللہ پر افترا کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ایسا حکم دیا ہے اس کو چھوڑ دے۔''

اسی سلسلہ میں آگے چل کر اللہ فرماتا ہے:

﴿ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ (٦/ الانعام: ١٤١)

''گھاٹے میں ہیں وہ جنھوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بے جانے قتل کیا۔''

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی تو اس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہوگا، اس لیے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبک دوش ہوتے

---

[1] سیرۃ ابن ہشام و طبقات ابن سعد و تاریخ طبری وغیرہ کتب سیر میں عبدالمطلب کا عبداللہ کو قربانی دینے کا واقعہ، نیز مؤطا امام مالک، کتاب النذور، باب مالا یجوز من النذور فی معصیۃ اللہ: ١٠٣٠۔

[2] لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول ص: ٢٢٠۔ [3] کشاف زمخشری تفسیر آیت ذیل۔

تھے، نبوت محمدی ﷺ نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا، بلکہ وہ اللہ ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے اور وہی ہر جاندار کی روزی کا میر سامان ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ﴾ (۱۱/ ھود: ۶)

''اور زمین پر کوئی جاندار نہیں لیکن یہ کہ اس کی روزی کا فرض اللہ ہی پر ہے۔''

اس لیے جاہل عربوں کو تعلیم دی گئی:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۳۱)

''اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالا کرو، ہم ہی ہیں جو ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں، ان کا مار ڈالنا بے شبہ بڑا گناہ ہے۔''

قتل اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی، آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنہوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنالی ہیں، بتادو کہ اصلی چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں؟

﴿ قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ ۖ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ ﴾ (۶/ الانعام: ۱۵۱)

''کہہ دے اے پیغمبر! آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، اللہ کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور مفلسی کے ڈر سے اپنے بچوں کو نہ مار ڈالو، ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیتے ہیں۔''

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا، یارسول اللہ ﷺ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا: ''شرک۔'' پوچھا، اس کے بعد، فرمایا: ''والدین کی نافرمانی۔'' پھر عرض کی، اس کے بعد، فرمایا یہ کہ ''تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی''۔ [1] یہ جواب حقیقت میں آیت بالا کی تفسیر ہے، انہی تعلیمات اور نبوت کے اس پرتو فیض نے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ رازق اللہ ہے، اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے، ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے، اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لیے پاک ہوگئی۔ اولاد کشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابل افسوس تھی وہ لڑکیوں کا زندہ دفن کر دینا تھا، کہ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں، جب گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا اور وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا، اہل عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید: ۷۵۲۰ وکتاب التفسیر: ۴۴۷۷، ۴۷۶۱ وکتاب الادب: ۶۰۰۱ وکتاب المحاربین: ۶۸۱۱؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون الشرك أقبح الذنوب: ۲۵۷۔

لڑکیاں ہیں، قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمہاری شرم کا باعث ہو اور اللہ کو لڑکیوں کا باپ کہو تو شرم نہ آئے، فرمایا:

﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ۝ ﴾

(۴۳/ الزخرف:۱۷)

''اور جب ان میں کسی کو اس کے ہونے کی خوش خبری دی جائے جس کی وہ رحمت والے اللہ پر تہمت باندھتے ہیں تو اندر ہی اندر غصہ کے مارے اس کا منہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔''

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم و عار کے مجسمہ کو پردہ خاک میں چھپا کر باپ اس مصیبت سے نجات پانے کی فکریں کرتے، قرآن مجید نے اہل عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْۗءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ ﴾ (۱۶/ النحل :۵۸۔۵۹)

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا ہے کہ آیا ذلت اٹھا کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کو مٹی میں چھپا دے (یعنی زندہ دفن کر دے)۔''

یوں تو اس رسم بد کا رواج تمام عرب میں تھا، مگر اخبار عرب کے بعض واقف کہتے ہیں کہ ایک خاص سبب سے بنو تمیم میں اس کا رواج سب سے زیادہ تھا، [1] بنو تمیم کے رئیس قیس بن عاصم نے خود آنحضرت ﷺ سے اقرار کیا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کیا ہے، [2] یہ رسم جس شقاوت اور سنگدلی کے ساتھ انجام دی جاتی تھی اس کا حسرتناک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کے سامنے خود اپنی بپتی سنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمت عالم ﷺ بے چین ہو گئے۔

دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت ہے، [3] کہ ایک شخص نے آکر خدمت اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے، بتوں کو پوجتے تھے اور اولاد کو مار ڈالتے تھے، میری ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی۔ ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی۔ میں آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ جب ایک کنوئیں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا اور لڑکی اس کے قریب پہنچی، تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا، وہ ابا ابا کہہ کر پکارتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔ رحمت کونین ﷺ اس پُر درد افسانہ کو سن کر آنسو ضبط

[1] مجمع الامثال کرمانی مطبوعه ایران، ص: ۳۴۸ وکتاب مجمع الامثال میدانی، ج ۱، ص: ۲۸۷ مطبعه خیریه مصر، زیر مثل اضل من موؤدة۔ [2] ابن جریر، ابن کثیر و در منثور سیوطی بحواله سنن بیهقی ومسند براز (مصنف عبدالرزاق زیر تفسیر سورة تکویر)۔

[3] سنن دارمی المقدمة، باب ماكان عليه الناس قبل مبعث النبي ﷺ من الجهل والضلالة: ۲، یہ روایت گو مرفوع اور قوی نہیں، لیکن اس لیے نقل کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیل ہی ہمارے سامنے آ جائے۔

نہ کر سکے، ایک صحابی نے ان صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضور کو غمگین کر دیا، فرمایا: ''اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے۔'' پھر ان صاحب سے فرمایا: ''ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر سناؤ۔'' انھوں نے دوبارہ پھر بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریش مبارک تر ہوگئی، پھر فرمایا: ''جاؤ کہ جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہوگئے، اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو۔''

قبیلہ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انھوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! میں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں۔ فرمایا: ''اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرو۔'' عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! میرے پاس اونٹ ہیں، فرمایا: ''اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک اونٹ قربانی کرو۔'' [1]

مردوں کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتیں بھی اس جرم میں مردوں کی شریک تھیں، مائیں خود اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لیے حوالہ کرتی تھیں، ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے:

مالقی المؤودمن ظلم اُمِّهٖ کمالقیت ذهل جمیعاً و عامر

''زندہ دفن ہونے والے بچہ نے اپنی ماں کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہیں اٹھائی جو ذہل اور عامر نے اٹھائی۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک عورت نے آکر کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کروں گی، فرمایا: ''ایسا نہ کرو، بلکہ کفارہ دے دو۔'' [2]

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لیے صرف اسی قدر ہوا کہ ایک دو نیک آدمیوں نے ایسی لڑکیوں کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا اور ان کی پرورش کی، چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس میں بڑا نام پیدا کیا تھا، اسلام کے بعد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا تو عرض کی، یارسول اللہ! میں نے اسلام سے پہلے ۳۶۰ لڑکیوں کو خرید کر موت سے بچایا ہے، کیا مجھ کو اس کا ثواب ہوگا؟ فرمایا: ''ہاں تم کو اس کا ثواب ملے گا کہ اللہ نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے۔'' [3] اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ جو بعثت نبوی سے پہلے دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے، وہ بھی اس قسم کی لڑکیوں کو اپنے آغوشِ شفقت میں لیتے تھے اور ان کی پرورش کرتے تھے، جب وہ بڑی ہو جاتی تھیں تو وہ ان کے باپ کو کہتے تھے کہ کہو تو میں تم کو واپس کر دوں، چاہے ان کو میرے ہی پاس رہنے دو۔ [4] یہ شخصی کوششیں تھیں جو ملک میں بار آور نہ ہوئیں، لیکن بعثتِ محمدی ﷺ کی رحمتِ عام کی جب بہار آئی، تو ان شقاوتوں کے موسم پر ہمیشہ کے لیے خزاں چھا گئی۔

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری بروایت قتادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق وبزار و در منثور سیوطی بحوالہ مسند بزار و حاکم فی الکنٰی وبیهقی فی السنن زیر سورۃ اذا الشمس کورت۔ [2] مؤطا امام مالک، کتاب النذور، باب النهی عن النذور فی معصیة الله: ۱۰۳۰۔ [3] تفسیر در منثور بحوالہ طبرانی۔ تفسیر اذا الشمس کورت۔ [4] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل: ۳۸۲۸۔

لوگ عموماً لڑکیوں کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے، نبوتِ محمدی ﷺ نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنا دیا کہ وہ نجات اخروی کا ذریعہ بن گئیں، فرمایا: ''جو کوئی ان لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کی مصیبت میں مبتلا ہو اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچا لے گی، وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائے گی۔'' 1 نیز فرمایا: ''جو دو لڑکیوں کی بھی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں، تو قیامت میں میرا اور اس کا مرتبہ دو انگلیوں کو اٹھا کر فرمایا کہ یوں برابر ہوگا۔'' 2 غور کیجیے کہ وہی حقیر ہستی جو پہلے شرم و عار کا موجب تھی، عہدِ محمدی ﷺ میں آ کر عزت اور سعادت کا وسیلہ بن گئی۔

ان اخلاقی نصیحتوں کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لیے آپ ﷺ نے عورتوں اور مردوں سے بیعت لی، صلح حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتیں اسلام لائیں، ان سے توبہ کی جو بیعت لی جائے، اس میں ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ ﴿وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ﴾ (٦٠/ ممتحنہ: ١٢) کہ ''وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی''۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت نے عورتوں سے خصوصیت کے ساتھ اس کی بیعت لی، فتح مکہ کے دن جب عورت مرد جوق در جوق اسلام کے لیے حاضر ہو رہے تھے تو آپ نے عورتوں سے خاص طور سے اس کا اقرار لیا اور انھوں نے اقرار کیا۔ 3 عید کے اجتماع عام میں عورتوں کے مجمع میں آپ تشریف لائے اور دوسری باتوں کے علاوہ اس کا بھی عہد 4 لیا کہ وہ قتلِ اولاد کی مرتکب نہ ہوں گی، دوسرے موقعوں پر بھی جو خاتون دربارِ رسالت میں حاضر ہوتیں ان سے بھی اس کا عہد لیا جاتا تھا، 5 بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پیش نظر عرب کی جو ابتدائی اصلاحیں تھیں، ان میں ایک چیز یہ بھی تھی، چنانچہ بیعت عقبہ میں سب سے پہلے انصار سے جن باتوں پر عہد لیا گیا تھا، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ ''وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے۔'' 6

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربارِ رسالت میں حاضر تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہ کرو گے، بدکاری نہ کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، جو اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کا معاوضہ اللہ پر ہے اور اگر کسی نے ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا میں مخفی

---

1 صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد: ٥٩٩٥؛ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل الاحسان الی البنات: ٦٦٩٣۔ 2 صحیح مسلم، ایضاً: ٦٦٩٥۔

3 صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الممتحنۃ: ٤٨٩٥؛ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب کیفیۃ بیعۃ النساء: ٤٨٣٤۔

4 صحیح بخاری، کتاب العیدین، باب موعظۃ الامام النساء یوم العید: ٩٧٨، ٩٧٩۔

5 ترمذی: ١٥٩٧؛ نسائی: ٤١٨٦؛ ابن ماجہ: ٢٨٧٤، ٢٨٧٥؛ مسند امام احمد حدیث امیمۃ بنت رقیقۃ، ج ٦، ص: ٣٥٧ وسلمی بنت قیس، ج ٦، ص: ٣٧٩۔

6 تفسیر ابن کثیر، ج ٩، ص: ٤٤٣ برحاشیہ فتح البیان بحوالہ ابن ابی حاتم۔

رہا تو اللہ کو اختیار ہے چاہے بخش دے چاہے عذاب دے“۔ [1] صحابہ سے فرمایا کہ ”اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے“۔ [2] ان تمام تدبیروں کے علاوہ قرآنِ پاک کی ایک مختصر سی آیت نے عرب کی ان تمام قساوتوں، ان تمام سنگدلیوں اور ان تمام سفاکیوں کو مٹانے میں وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہیں کر سکتی تھیں۔ قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے، مجرم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں، غضب الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے، دانائے غیب قاضی اپنی معدلت کی کرسی پر ہے، اعمال نامے شہادت میں پیش ہیں کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیاں خون سے رنگین کپڑوں میں آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں، شہنشاہِ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے، اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم میں ماری گئیں:

﴿ وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ۝ ﴾ (۸۱/ التکویر: ۸۔۹)

”یاد کرو جب (قیامت میں) زندہ دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی۔“

کس درجہ بلیغ اور مؤثر طرز ادا ہے، اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیتے تھے، یا یہ زمانہ آیا کہ ادائے عمرہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں، سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ کی یتیم بچی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھی، چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ ہاتھوں میں اٹھا لیتے اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے حوالہ کرتے ہیں کہ یہ لو تمہارے چچا کی بیٹی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہیے، کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر میں ہے، حضرت زید رضی اللہ عنہ آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ حضور! یہ لڑکی مجھ کو ملنی چاہیے کہ حمزہ میرے مذہبی بھائی تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے، آنحضرت ﷺ اس دل خوشکن منظر کو دیکھتے ہیں، پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اس کو یہ کہہ کر اس کی خالہ کی گود میں دے دیتے ہیں کہ ”خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔“ [3]

کیا یہ وہی جنس نہ تھی کہ جس کی ہستی شرم و عار کا موجب تھی، جس کی پیدائش کی خبر سن کر باپ کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ لوگوں کے مجمع میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا یا یہ حال ہے کہ ایک لڑکی کی پرورش کے لیے دفعتہً چار چار گود خالی ہو جاتے ہیں اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے، وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی، آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنتی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان: ۱۸، وکتاب مناقب الانصار: ۳۸۹۲، ۳۸۹۳؛ مسلم، کتاب الحدود: ۴۴۶۱، ۴۴۶۳ ومسند احمد، ج ۵، ص: ۳۱۴؛ مستدرك حاكم، ج ۲، ص: ۳۱۸۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الادب: ۵۹۷۵ وکتاب فی الاستقراض: ۲۴۰۸؛ صحیح مسلم، کتاب الاقضیة، باب النهی عن كثرة المسائل: ۴۴۸۳۔ [3] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء: ۴۲۵۱۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۷۴)

’’(جنت ان کو بھی ملے گی جو......) اور جو کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار! ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے ہم کو آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔‘‘

اور آخروہ زمانہ آیا کہ ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا:

غدا الناس مذ قام النبی الجواریا۔

’’پیغمبر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہے کہ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔‘‘

رضاعت وحضانت

اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشوونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے، اس کی خبر گیری کی جائے اور اس کے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی اور اس کے خرچ کی کفالت کی جائے، چنانچہ اسلام نے ان دونوں باتوں کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے، تنہا باپ پر رکھا ہے، رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے، مختصر یہ ہے کہ بچہ کو شیر خوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلائے اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا اور اس کی اُجرت ادا کرنا فرض قرار دیا گیا اور اس شیر خوارگی کی پوری مدت بھی دو برس کی مقرر کر دی گئی ہے:

﴿ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۳)

’’اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں، یہ مدت اس کے لیے ہے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری کرے اور لڑکے والے (باپ) پر ان دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔‘‘

اور شیر خوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اگر اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے، جس نے قانوناً اس اہمیت کو قبول کیا اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے، فرمایا:

﴿ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ ﴾ (۴/ النسآء:۲۳)

’’اور تمہاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔‘‘

دکھانا یہ ہے کہ ان ننھے بچوں کی نشوونما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور احترام رکھتی ہے کہ نسبی رشتہ

داریوں کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔

اوپر کی پہلی آیت میں جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری باپ پر ڈالی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ پر ہے اور باپ نہ ہو تو دادا پر اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ورثہ پر ہے۔

تعلیم وتربیت

ظاہری اور جسمانی نشو ونما کے بعد اولاد کی باطنی وروحانی تربیت کا درجہ ہے، قرآن پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے، اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے، کہ اس کی تفصیل وتشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں، فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ﴾ (٦٦/ التحریم: ٦)

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔''

اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچانا بزرگ خاندان کا فرض ہے، یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود ان تمام برائیوں، خرابیوں اور ہلاکتوں سے ان کی حفاظت ہے، جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہیں، اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے۔

اللہ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعائے خیر کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''بارِالٰہی! تو ان کو ظاہر و باطن کا حسن، صورت وسیرت کی خوبی اور دین ودنیا کی بھلائی دے کر میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا، فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ ﴾ (٢٥/ الفرقان: ٧٤)

''اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولادوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔''

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادت مند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی وسعادت مندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہیے، ایک سورہ میں اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور ان کی خدمت کی توفیق چاہتے ہیں، اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی بھی دعا کرتے ہیں:

﴿ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝ ﴾ (٤٦/ الاحقاف: ١٥)

''اور (اے اللہ)! میرے لیے میرے کاموں کو میری اولاد میں صالح بنا، میں اپنے گناہوں سے تیری طرف باز آیا اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس باب میں وحی الٰہی کے مقصود کو تعلیم ربانی پا کر مختلف طریقوں سے واضح فرمایا۔

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربار نبوی میں آیا، حضور ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیار کر رہے تھے، اس کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی، اس نے کہا، کیا آپ بچوں کو پیار کرتے ہیں، میرے دس بچے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کو پیار نہیں کیا، حضور ﷺ نے اس کی طرف نظر اٹھائی، پھر فرمایا: ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔'' ❶ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم وشفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں''۔ ❷ ان دونوں کا منشا یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ محبت وشفقت سے پیش آنا چاہیے کہ جو اپنے بچوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا۔

ایک دفعہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کر آئی، اس کے ساتھ اس کی دو کمسن بچیاں بھی تھیں، اس وقت کاشانہ نبوی ﷺ میں ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا، ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے وہی ایک کھجور اس کے نذر کر دی۔

ماں کی مامتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھا لے اور ان ننھی جانوں کو اس سدرمق سے محروم رکھے، اس نے اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو غریب ماں کی محبت کے اس منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا، آنحضرت ﷺ جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا، حضور ﷺ نے سن کر فرمایا: ''جب کسی کو لڑکیوں کی کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ ان کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لیے آڑ بن جائیں گی۔'' ❸ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ عمر تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اس کا یہ رتبہ ہوگا کہ وہ اور میں (دو انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوئے ہوں گے۔'' ❹ اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''باپ کا اپنے بچہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے۔'' ❺ ایک دفعہ یہ فرمایا: ''کوئی باپ اپنے بچہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔'' ❻

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے اختلاف کے سبب سے ترجیح نہ دے،

---

❶ یہ روایت صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد: ۵۹۹۷ میں ہے، نیز دیکھو ابو داود، کتاب الادب، باب قبلة الرجل ولده: ۵۲۱۸۔ ❷ بخاری، ایضًا: ۵۹۹۸۔

❸ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة باب فضل الاحسان الی البنات: ٦٦٩٣۔ ❹ ایضا: ٦٦٩٥۔

❺ ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء فی ادب الولد: ۱۹۵۱۔ ❻ ایضًا: ۱۹۵۲۔

ارشاد ہوا کہ ''جس کے لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ اسے جنت میں داخل فرمائے گا''۔ ❶ باہم لڑکوں میں بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعت محمدی ﷺ میں قائم نہیں، اسی لیے دنیا کی اکثر شریعتوں اور قانونوں کے خلاف اسلام میں بڑے اور پہلوٹے کے امتیازی حقوق نہیں، کہ ہر ایک کو ان میں سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے، یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلاوجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو، تو آنحضرت ﷺ نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا، ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا اور چاہا کہ اس پر آنحضرت کی شہادت ہو، انہوں نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی، دریافت کیا کہ ''تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے؟'' عرض کی نہیں، فرمایا: ''تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنوں گا''۔ ❷ اس سے اس قانون کی جو اسرائیلوں، رومیوں، ہندوؤں اور دوسری پرانی قوموں میں رائج تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائیداد کا مالک بنے، یا اس کا کوئی ترجیحی حق ہو، اصلاح کر دی گئی اور باپ کی نظر میں اس کے تمام لڑکوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا اور چھوٹوں پر ظلم کا جو مسلسل قانونی طریقہ جاری تھا اس کا خاتمہ ہوا۔

---

❶ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فضل من عال یتامی: ٥١٤٦۔

❷ ابوداود، کتاب البیوع، باب فی الرجل یفضل بعض ولدہ فی النحل: ٣٥٤٢۔

حقوق زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ زن وشو کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھوں کی تسکین روحانی کا ذریعہ اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا، اسی طرح حقوقِ زوجین کی تشریح پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش و مسرت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے، ان سب میں عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقی مدارج کے لیے عائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا، ہندوستان میں بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھو پن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے، عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمال روحانی کا ذریعہ تھا، [1] اسلام نے آ کر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس تجرد میں ہو سکتی ہے، اس سے بدرجہا تعلق ازدواج میں ممکن ہے، کہ اخلاق نام حسن معاملہ اور حسن سلوک کا ہے، جو کسی کا شوہر نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو، جو کسی کا باپ نہ ہو، جو کسی کی ماں نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو اور نہ کسی کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناطہ رکھے، اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لیے اس کو کون سے فطری مواقع مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت وعصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے، اس تجرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے، مذہبی تجرد کی وہ پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد وعورت بلکہ آزاد و غلام ہر ایک کے لیے بہتر بلکہ خیر و برکت کا سبب قرار دیا، حکم ہوا:

﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۭ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ؀﴾ (۲٤/ النور :۳۲)

''اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا (خواہ وہ کنواری ہوں یا رانڈ) اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحوں کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا اور اللہ گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے۔''

اس آیت پاک کا یہ فقرہ کہ ''اگر وہ غریب وتنگ دست ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ان کو غنی بنا دے گا۔'' یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر و برکت کا ذریعہ ہے، مذہبی حیثیت سے تو اس بنا پر کہ اگر ایک کی تقدیر میں غربت ہوگی تو شاید دوسرے کی تقدیر میں فارغ البالی ہو، تو ایک کے ذریعہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچے

[1] انجیل فرینتون، باب:۷۔

گا اور دنیاوی لحاظ سے دوسببوں سے، ایک تو یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بجائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے اور آگے اولاد کے ذریعہ اور کام کرنے والے پیدا ہوں گے، اس فلسفہ کا راز اہلِ دولت نہیں، غریب ہی سمجھ سکتے ہیں، خصوصاً مزدور اور کاشت کار، دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکمے سے نکمے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں ہلانے پر تیار ہوتا ہے، اس لیے جو بے کاری سے غریب ہے بیوی کے بوجھ سے مجبور ہوگا، کہ وہ کام کہیں سے پیدا کرے، خصوصاً اس لیے کہ اس کی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کردے گی، جس کے لیے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہ ہوسکتا، آخر میں فرمایا کہ اللہ بڑی وسعت والا ہے، اس کی گنجائش میں سب کچھ ہے اور پھر علم والا ہے، غیب کا علم اسی کو ہے، اس لیے اس کا یہ حکم حکمت سے خالی نہیں۔ پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا: اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کرلے، فرمایا:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ ﴾ (٤/ النسآء: ٢٥)

''اور جو تم میں سے اس کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح کرسکے تو تمہاری ان مومن باندیوں میں سے کسی سے نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہو اور اللہ تمہارا ایمان زیادہ جانتا ہے، تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔''

آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے، یہ فرمایا کہ اگر شریف و آزاد بیوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو تو کسی باایمان باندی ہی سے نکاح کرلو، اب یہاں سے دو شبہے پیش آتے ہیں کہ یہ کیا نو مسلم باندیاں پرانے مسلمانوں کے برابر ہوسکتی ہیں؟ تو فرمایا: کہ نئے اور پرانے مسلمان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا اور اللہ کے نزدیک قبول ہے، دوسرا شبہ یہ تھا کہ یہ نو مسلم عورتیں شریف خاندانوں کے ہم مرتبہ کیسے ہوں گی، تو فرمایا: یہ تفریق بھی غلط ہے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہیں۔ یہ اہتمام بیان اس لیے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وسوسوں میں پڑ کر نکاح سے باز نہ رہیں اس سے اندازہ ہوگا کہ شخصی مسرت کی تکمیل میں کسی رفیقہ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((اتزوج النسآء فمن رغب عن سنّتي فليس مني)) [1]

''میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں، تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی تو وہ مجھ سے نہیں۔''

[1] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح: ٥٠٦٣؛ مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح......: ٣٤٠٣۔

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لیے اپنے ایک ہم جنس کی تلاش ہوتی ہے اور یہ اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے، چنانچہ زن وشو کے باہمی اخلاص ومحبت کو اللہ نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے، فرمایا:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾ (۳۰/ الروم:۲۱)

’’اور اس (اللہ کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا، بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے کتنی نشانیاں ہیں۔‘‘

قرآن پاک نے ایک لفظ ’’سکون‘‘ سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے، وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے، اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاکش، دنیا کے حوادث اور مشکلات کے تلاطم میں امن اور سکون اور چین کا گوشہ ہے، اس لیے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوشگواری ہونی چاہیے کہ اس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لیے اللہ نے اس زناشوئی کے تعلق کو اپنے عجیب وغریب آثار قدرت میں شمار کیا ہے، پورے ہوں، یعنی باہمی اخلاص اور پیار، مہر ومحبت، سکون اور چین، اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہوں تو اس میں دونوں یا دونوں میں سے ایک کا قصور ہے۔

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ان لوگوں کی سخت برائی کی ہے، جو زن وشو کے باہمی میل جول اور مہر ومحبت میں فرق ڈالیں، فرمایا:

﴿ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۰۲)

’’تو وہ (یہود) ان سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں...... اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔‘‘

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ بیوی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر بیوی کی دلجوئی کرے، زن وشو باہم اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے گو برابر ہیں، لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لیے زیادہ دیا گیا ہے، کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے اور اس کے جائز مصارف کا بوجھ اٹھاتا ہے اور دوسرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو مشکلات میں پڑنے اور عورت کی حفاظت اور بچاؤ کی خاطر اس کو جسمانی صلاحیتیں عورتوں سے کچھ زیادہ دی ہیں، فرمایا:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَي النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَھُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ

أَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۚ﴾ (٤/ النسآء:٣٤)

''مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں، اس لیے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بزرگی دی ہے اور اس لیے کہ مرد اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں، تو نیک بیبیاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور غائبانہ نگہبانی کرتی ہیں کہ اللہ نے ان کی حفاظت کی ہے۔''

آیت کے اخیر حصہ کا یہ مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بیبیاں شوہر کی غیر حاضری میں، اپنی اور شوہر کی عزت و آبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کر کے ان کو محفوظ کر دیا ہے، اب اگر کسی عورت سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلافِ فطرت ہے۔

مرد و عورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کی معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لیے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم، ایک دوسرے کی پردہ پوش، ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، قرآن پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ میں ادا کر دیا ہے:

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ﴾ (٢/ البقرة:١٨٧)

''عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔''

اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں، تم ان کے ستر پوش ہو، وہ تمہارے لیے، تم ان کی زینت ہو، وہ تمہاری، تم ان کی خوبصورتی ہو، وہ تمہاری، تم ان کی تکمیل کا ذریعہ ہو، وہ تمہاری یہی نکاح کے اغراض ہیں اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوقِ زوجین کو ادا کرنا ہے:

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق اور ان کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے، فرمایا:

﴿يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۝﴾ (٤/ النسآء:١)

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا لحاظ کرو جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا، اس اللہ کا جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رحموں (رشتوں) کا لحاظ رکھو، اللہ تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہے۔''

آنحضرت ﷺ ان آیات کو نکاح کے خطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے، ان آیتوں میں انسانیت کے

پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے، جس سے کروڑوں مرد وعورت پیدا ہوئے اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہیے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں اپنے اس خالقِ حقیقی کا اور ان رحموں (رشتوں) کا لحاظ کریں جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہیں، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ یہی نکاح ہے، یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہوسکتا، اس لیے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اس نقطۂ خیال سے بھی دنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے، کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر ومحبت اور الفت ومودّت کا آغاز ہوتا ہے۔ نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد وعورت میں صلاح اور عفت پیدا ہو، قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے: ﴿ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٥) ''پاک دامنی کے لیے، نہ شہوت رانی کے لیے۔'' اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ جوانوں کو خطاب کر کے فرمایا: ''اے جوانوں کے گروہ! تم میں نکاح کی جس کو طاقت ہو، وہ نکاح کر لے کہ اس سے نگاہیں نیچی اور شرم گاہیں محفوظ رہیں گی اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے، کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے۔'' [1]

نکاح کے ان اغراض کا پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں میں صلح اور یک جہتی کا رجحان نمایاں رہے اور ہر موقع پر جہاں تعلقات کے شیشہ کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہو، باہم صلح کے لیے آمادہ رہنا چاہیے اور اصلاح حال کے لیے دونوں کو برابر کوشش کرنی چاہیے، اسی لیے زوجین میں مناقشہ پیش آنے کی صورت میں بھی اصلاح حال کی بار بار تاکید کی گئی ہے، فرمایا: ﴿ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ﴾ (٢/ البقرۃ:٢٢٨) ''اگر یہ شوہر اصلاح چاہیں۔'' ﴿ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا ﴾ (٤/ النساء:١٢٩) ''اگر اصلاح کرو اور تقویٰ کرو''۔ کہیں اسی اصلاح کا نام اللہ کی حدوں کو قائم کرنا کہا گیا ہے:

﴿ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ﴾ (٢/ البقرۃ:٢٢٩)

''یہ کہ میاں بیوی دونوں اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں گے۔''

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ نہیں کریں گے اور جب انھیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں، مجبور ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ نے وحی کی زبانِ مبارک سے ایسے لوگوں کو فرمایا:

﴿ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (٢/ البقرۃ:٢٢٤)

''اور اللہ کو اپنی قسموں کا ہتھکنڈا نہ بناؤ، کہ سلوک نہ کرو اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔''

---

[1] ابن ماجه، ابواب النكاح، باب ما جاء في فضل النكاح: ١٨٤٥۔

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھا کر علیحدگی اختیار کر لینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن و شو کے معاملہ سے ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کے ساتھ حسن سلوک (بر) پرہیز گاری کا برتاؤ (تقویٰ) اور صلح جوئی اور درستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں:

﴿ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ ﴾ (٤/ النسآء: ٣٤)

''تو نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر (کے مال و دولت اور عزت و آبرو) کی حفاظت کرتی ہیں۔''

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرمانبردار رہیں، ان کے مال و دولت اور ملکیت کی جن کی حفاظت ان کے سپرد ہے، پوری نگرانی رکھیں اور ان کی عزت و آبرو کی جو خود ان کی اپنی عزت و آبرو ہے، شوہر کی غیر حاضری میں بھی حفاظت کریں، مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض، اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت و عفت ہیں، حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے، شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے وہ اس کی قسم پوری کر دے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے۔'' [1]

زن و شو کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں ان الفاظ میں فرمائی:

''لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں، تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے، لیکن یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں، اگر ایسا کریں، تو ان کو خواب گاہ میں علیحدہ کر دو اور ان کو ہلکی مار مارو، تو اگر تمہاری بات مان لیں تو پھر ان پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو، بیشک تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے، تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو دوسروں سے پامال نہ کرائیں جن کو تم پسند نہیں کرتے اور نہ تمہارے گھروں میں ان کو آنے کی اجازت دیں، جن کا آنا تم کو پسند نہیں، اور ہاں! ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو۔'' [2]

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آ کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے؟ فرمایا: ''جب خود کھائے تو اس کو کھلائے، جب خود پہنے تو اس کو پہنائے، نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے، نہ اس کو برا بھلا کہے

[1] سنن ابن ماجه، ابواب النكاح، باب افضل النسآء: ١٨٥٧۔

[2] سنن ابن ماجه، ابواب النكاح، باب حق المرأة على الزوج: ١٨٥١۔

اور نہ گھر کے علاوہ اس کی سزا کے لیے اس کو علیحدہ کرے۔'' ❶ دوسری طرف آپ ﷺ نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے شوہروں کی پوری اطاعت کریں، یہاں تک فرمایا کہ ''اگر اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔'' ❷ آپ ﷺ نے یہ طریقہ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کے لیے اختیار فرمایا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام میں اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں۔

ایک مشہور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((خیر کم خیر کم لاهله)) ❸

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔''

((خیار کم خیار کم لنساء هم)) ❹

''تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لیے بہترین ہیں۔''

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بتا دی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے، جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کر سکتا وہ دوسروں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے، کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہیے۔

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے، لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا کر فرمایا:

((ولزوجك علیك حقًا)) ❺

''اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، وہ ہر وقت معمولی قصوروں پر ماری پیٹی جا سکتی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا، پھر وہ کہتے ہیں کہ ''ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار و قطار میں نہیں سمجھتے تھے، اسلام آیا تو اس نے ان کے بارہ میں احکام اتارے اور ان کے حق مقرر کیے''۔ ❻

اسلام نے ان کی قدر و منزلت کو یہاں تک بڑھایا کہ ان کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا اور آپس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا، البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری

---

❶ سنن ابن ماجه، ابواب النكاح، باب حق المرأة على الزوج: ١٨٥٠۔ ❷ ابن ماجه، ابواب النكاح، باب حق الزوج على المرأة: ١٨٥٢۔ ❸ ترمذي، ابواب المناقب، باب فضل ازواج النبي ﷺ: ٣٨٩٥؛ ابن ماجه، ابواب النكاح، باب حسن معاشرة النساء: ١٩٧٧؛ دارمي: ٢٢٦٠۔ ❹ ترمذي، ابواب الرضاع، باب ما جاء في حق المرأة على زوجها: ١١٦٢۔ ❺ صحيح بخاري، كتاب الصوم، باب حق الجسم في الصوم: ١٩٧٥۔ ❻ صحيح بخاري، كتاب النكاح، باب موعظة الرجل ابنته لحال زوجها: ٥١٩١ وكتاب التفسير، سورة التحريم: ٤٩١٣۔

دی گئی، ارشاد ہوا:

﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۸)

''اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے، جیسا مردوں کا عورتوں پر اور مردوں کو ان پر ایک منزلت حاصل ہے۔''

لیکن یہ منزلت بھی ان کو بے وجہ نہیں دی گئی ہے، یہ اس لیے ہے، تاکہ وہ عورتوں کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں، یعنی وہ گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہیں، یہ نکتہ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اوپر کی آیت میاں بیوی کے خانگی جھگڑوں کے دور کرنے کے سلسلہ میں ہے، گھر کے روزمرہ کے مناقشوں کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں کے قانونی حقوق یکساں ماننے کے ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے، تاکہ وہ اپنے گھر کے نظام کو اچھی طرح چلا سکے۔

اس اعزازی منصب کے لیے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہیں، قرآن پاک نے اس کی مصلحتیں بھی بتا دی ہیں، فرمایا:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۗ ﴾ (٤/ النسآء:٣٤)

''مرد عورتوں کے نگران ہیں، اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے اور اس لیے کہ انھوں نے اپنا مال خرچ کیا۔''

یعنی مردوں کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم و طاقت اور عقل و فراست وغیرہ میں جسمانی و ذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے، طبی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں، اس لیے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃً ملنا چاہیے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دین مہر، نان ونفقہ اور پرورش اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے، اس لیے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے، تاکہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات کی خوشگواری قائم رہے۔

اکثر عورتوں میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے، جو شاید ان کی فطری کمزوری یا عدم تربیت کا نتیجہ ہو، بعض مرد یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ میں سختی اور درشتی سے کام لے کر ان کی یہ ٹیڑھ نکال دیں، آپ ﷺ نے ان کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دے کر نصیحت فرمائی کہ ''عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو، کہ ان کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے ہوئی جس سے اس کے اسی ٹیڑھا پن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو اور اگر

اس کے سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے۔'' ❶ آپ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع وراضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا، فرمایا: ''اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو، کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری اچھی بات بھی نکل آئے گی''۔ ❷ یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے:

﴿ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّیَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء: ١٩)

''اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ سے گزران کرو، اگر تم کو وہ نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور اللہ نے اس میں بہت خوبی رکھی ہے۔''

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی، خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر اور بیرونی مشغولیتوں کا بارگراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات، اور یک جہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے، اپنے لیے خود روزی کمانا اور سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہیں، بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان ونفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو، اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومت وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے، ❸ اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے، انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے، جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لیے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اس کی دولت سے اس کی حیثیت کے مطابق بقدر ضرورت لے لیا کرے، فتح مکہ کے دن ابوسفیان کی بیوی ہند آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں آ کر عرض پرداز ہوئی کہ یارسول اللہ ﷺ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں، لیکن یہ کہ میں ان کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لے لوں، فرمایا: ''تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو، جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو''۔ ❹

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے، جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے، فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور تم

❶ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الوصاۃ بالنسآء: ٥١٨٦؛ مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیة بالنسآء: ٣٦٤٣۔ ❷ مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیة بالنساء: ٣٦٤٥۔ ❸ اس اختیار کی تشریح میں فقہاء مختلف ہیں تفصیلات کیلئے فقہ کی کتابوں میں کتاب النفقہ دیکھنا چاہیے نیز دیکھو نیل الاوطار شوکانی، ج٦، ص: ٢٦٣ مصر۔

❹ صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب اذالم ینفق الرجل…… : ٥٣٦٤۔

میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت باز پرس ہوگی..... مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے، اس سے اس کی پوچھ ہو گی اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی۔'' (بخاری باب: ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ﴾) نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

مرد کو کس عورت کو مارنے کا اختیار دیا گیا ہے

قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے، وہ آیت یہ ہے:

﴿وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ﴾ (٤/ النسآء: ٣٤)

''اور جن بیویوں کے ''نشوز'' کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور خواب گاہوں میں ان سے علیحدگی برتو اور ان کو مارو، تو اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں، تو پھر ان پر راہ مت تلاش کرو۔''

لغت میں ''نشوز'' کے معنی ''اٹھ جانے'' کے ہیں اور عورت کے حق میں اس کے اصطلاحی معنی جو ہیں وہ مفسر ابن جریر طبری کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں:

ومعنى ذالك اذا رأيتم منهنّ ما تخافون ان ينشزن عليكم من نظر الى مالا ينبغي لهنّ ان ينظرن اليه ويدخلن ويخرجن واستربتم بامرهن۔ ❶

''اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم ان عورتوں کی وہ حالت دیکھو جس سے تم کو ان کے ''نشوز'' کا ڈر ہو، یعنی ادھر دیکھنا جدھر ان کو دیکھنا نہیں چاہیے اور وہ آئیں اور نکل جائیں اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے۔''

عن محمد بن كعب القرظي اذا راى الرجل تقصيرها في حقه في مدخلها ومخرجها قال يقول لها بلسانه قد رأيتك منك كذاوكذا فانتهى۔ ❷

''محمد بن کعب قرظی سے ہے کہ جب مرد دیکھے کہ عورت (گھر) سے باہر آنے جانے میں اس کے حق میں قصور کر رہی ہے تو اس سے زبان سے کہے کہ میں نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی، یہ دیکھی تو اب باز آجا۔''

فقہ کی کتابوں میں ہے:

الناشزة هي الخارجة عن منزل زوجها المانعة نفسها منه۔ ❸

''نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے آپ کو اس کے

❶ تفسیر طبری: ٥، ص: ٣٨۔ اصل متن تفسیر میں واستبریتم غلط چھپا ہے۔ ❷ ایضاً۔
❸ عالمگیری، نفقات، ج ١، ص: ٥٤٥۔

سپرد نہ ہونے دے۔‘‘

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بداخلاقی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی جائیں۔

کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پر بلندی چاہے اس کا حکم نہ مانے، اس سے بے رخی کرے اور اس سے بغض رکھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے نشوز کے معنی آپ کھل جاتے ہیں، آیت مذکور پوری یہ ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ ﴾

(٤/ النسآء: ٣٤)

’’مرد عورتوں کے نگران ہیں (ایک) اس لیے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے، اور (دوسرے) اس لیے کہ مرد اپنا مال (ان پر) خرچ کرتے ہیں، تو نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور (شوہر کے) پیٹھ پیچھے (شوہر کے گھربار اور عزت [1] و آبرو کی) حفاظت کرتی ہیں، کہ اللہ نے ان کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے اور جن کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور ان کو خوابگاہوں میں علیحدہ کردو اور ان کو مارو، تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو پھر ان پر راستہ تلاش نہ کرو۔‘‘

اس آیت پاک میں مرد کی ترجیح کی جو دو باتیں بیان کی ہیں، ان کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور ان کے پیٹھ پیچھے ان کے گھربار اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں، اس کے بعد ہے کہ اب جس عورت سے تمہیں ’’نشوز‘‘ کا ڈر ہو تو اس کو پہلے سمجھاؤ، نہ مانے تو خلوت میں اس سے کنارہ کرو، یا اس سے بات کرنا چھوڑ دو، اس پر بھی نہ مانے تو اس کو ذرا مارو، اب بھی اگر کہا مان لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لیے حیلہ اور بہانہ مت ڈھونڈو۔ اب جب اوپر یہ بتایا جاچکا کہ مردوں کو عورتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے، پھر یہ بھی کہا جاسکتا کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور شوہروں کے پیچھے ان کے گھربار، مال و دولت اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تمہیں عورت کے نشوز کا ڈر ہو تو یہ یہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا نشوز یہ ہے، کہ اس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہیں، یعنی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر کے پیچھے اس کے گھربار اور عزت و آبرو

[1] اس آیت کی یہ تفسیر قرآن پاک کے ارشادات اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے۔

کی حفاظت، جو عورت ان دونوں کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہیں کرتی وہی ناشزہ ہے اور ایسی ہی عورت کو تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے۔

''شوہر کی عزت و آبرو کی حفاظت'' کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے، اس کی تصریح احادیث میں موجود ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے اور جب کوئی حکم دے تو وہ مان لے اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو تو وہ اپنی جان اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔'' اپنی جان کی حفاظت سے مقصود عفت و عصمت ہے۔

حجۃ الوداع کے خطبہ میں عورتوں کے حقوق کی نسبت آنحضرت ﷺ کے جو فقرے ہیں، ان میں نشوز کے اس معنی کی پوری تصریح ہے صحیح مسلم میں ہے:

((فاتقوا اللّٰه فی النساء فانكم اخذتموهن بامان اللّٰه ولكم عليهن ان لا يوطئن فرشكم احدًا تكرهونه فان فعلن فاضربوهن ضربًا غير مبرح)) [1]

''عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کہ وہ تمہارے بس میں ہیں، تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی سے نہ روندوائیں، جس کو تم ناپسند کرتے ہو، اگر وہ ایسا کریں تو ان کو اتنا مارو جو تکلیف دہ نہ ہو۔''

ابن ماجہ میں یہ الفاظ ہیں:

((استوصوا بالنساء خيرا فانهن عندكم عوان ليس تملكون منهن شيئًا غير ذالك الا ان يأتين بفاحشة مبينة فان فعلن فاهجروهن فی المضاجع واضربوهن ضربًا غير مبرح فان اطعنكم فلا تبغوا عليهن سبيلاً)) [2]

''عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے بارہ میں میری وصیت کو قبول کرو، وہ تمہارے قبضہ میں ہیں، تم کو اس کے سوا ان پر کوئی اختیار نہیں، مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں، تو اگر ایسا کریں تو ان کو خواب گاہوں میں علیحدہ کر دو اور ان کو اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ نہ ہو، تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو ان پر کوئی راستہ نہ ڈھونڈو۔''

شوہر کے بستر کو روندوانے کا کنایہ اس طرف ہے، کہ ایسے لوگ اس کے گھر میں آنے جانے نہ پائیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو اور ''کھلی بے حیائی'' سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپا نہیں، لیکن بعض نے اس میں بھی توسیع کی ہے، یعنی عورت کی نافرمانی اور بدزبانی اور مشتبہ چال چلن [3] سب کو فاحشہ مبینہ کی

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ: ۲۹۵۰۔ [2] سنن ابن ماجه، ابواب النكاح، باب حق المرأة على الزوج: ۱۸۵۱۔ [3] یہ پیش نظر رہے کہ یہ خانگی سزا صرف مشکوک و مشتبہ حالت میں عورت کی اصلاح کے لیے ہے، اور نہ ثبوت کی صورت میں اس جرم کی سزا سنگساری یا تازیانہ ہے جس کا اجرا قاضی کا فرض ہے۔

تفسیر میں داخل کیا ہے، (تفسیر سورۂ نساء رکوع ۲)

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے اور شرع کی تصریح ہے کہ یہ ''ضرب غیر مبرح'' یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے، بلکہ یہاں تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے۔ ❶ جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہیں آ سکتی، ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے، یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا، جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے، ایاس بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حکم دیا کہ ''اللہ کی بندیوں (اپنی بیویوں) کو مارا نہ کرو'' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہو گئیں تو آپ ﷺ نے مارنے کی رخصت عطا کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں اہل بیت نبوی کے سامنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئیں، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''آل محمد کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹتی رہیں جو اپنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئی تھیں، یہ (یعنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم میں سے اچھے لوگ نہیں۔'' ❷

ایک صحابیہ نے اپنے نکاح کے متعلق آپ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارتا''۔ ❸ یعنی وہ مار پیٹ کیا کرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا۔

ایک صحابی نے آ کر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! میری بیوی بدزبان ہے۔ فرمایا: ''طلاق دے دو۔'' عرض کی، اس سے میری اولاد ہے اور مدت سے میرے ساتھ ہے، فرمایا: ''تو اس کو سمجھایا کرو، اس میں صلاحیت ہوگی تو قبول کرے گی، لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارا نہ کرو''۔ ❹ ایک دوسرے موقع پر فرمایا: ''کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہم بستر ہو''۔ ❺

---

❶ تفسیر طبری، ج ۵، ص:۴۱، مصر۔ ❷ ابوداود، کتاب النکاح، باب فی ضرب النسآء:۲۱۴۶؛ ابن ماجه، کتاب النکاح، باب ضرب النسآء:۱۹۸۵؛ سنن الکبری للنسائی، کتاب عشرة النساء: ۹۱۲۲۔

❸ صحیح مسلم، باب المطلقة البائن: ۳۷۱۲۔

❹ ابو داود، کتاب الطهارة، باب فی الاستنثار: ۱۴۲۔

❺ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ما یکره من ضرب النساء: ۵۲۰۴ ومسلم: ۷۱۹۱۔

اہل قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن وشو کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہل قرابت کا حق ہے، عربوں کے محاورہ میں اس کا نام ’’صلۂ رحم‘‘ ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم میں صلۂ رحم اور حقوق قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے، یہی سبب ہے کہ وحی محمدی ﷺ میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے، قرآن پاک میں کم از کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے اور اس کو انسان کا احسان نہیں، بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ ﴾ (۳۰/ الروم:۳۸)

’’تو قرابت دار کو اس کا حق ادا کر۔‘‘

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآءیل:۲۶)

’’اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کر۔‘‘

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف اللہ کی مرضی کے لیے تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے۔

﴿ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

’’(اور اصل نیکی اس کی ہے جس نے ......) اور مال کو اس کی محبت پر قرابت مندوں کو دیا۔‘‘

والدین کے بعد اہل قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں، فرمایا:

﴿ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱۵)

’’فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے......۔‘‘

ماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اللہ تعالیٰ کے ان خاص احکام میں ہے، جن کا انسان سے عہد لیا گیا:

﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۳)

’’(اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ اللہ ہی کو پوجنا) اور ماں باپ اور رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرنا۔‘‘

سورۂ نحل میں اہل قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى ﴾ (۱۶/ النحل:۹۰)

’’بے شک اللہ انصاف اور حسن سلوک اور قرابتدار کو دینے کا حکم کرتا ہے۔‘‘

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہیں، فرمایا:

﴿ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ ﴾

(۲/ البقرۃ: ۲۱۵)

''کہہ دے اے پیغمبر (ﷺ)! کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ اپنے ماں باپ، قرابت والوں، یتیموں اور غریبوں کے لیے۔''

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہل دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں، ارشاد ہوا:

﴿ وَلَا يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ ﴾

(۲٤/ النور: ۲۲)

''اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشائش والے ہوں وہ قرابت مندوں اور محتاجوں کے دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں۔''

اللہ کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کے بعد تیسری چیز اہل قرابت کے ساتھ نیکی ہے، فرمایا:

﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى ﴾ (٤/ النسآء: ٣٦)

''اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا ساتھی نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والے کے ساتھ نیکی کرنا۔''

حق قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعی اسلام ﷺ اپنی ان تمام محنتوں، زحمتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوت حق میں ان کو پیش آئیں اور اپنے اس احسان و کرم کا جو ہدایت، تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا بدل، معاوضہ اور مزدوری اپنی امت سے یہ طلب فرماتے ہیں، کہ رشتہ داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو اور ان سے لطف و محبت سے پیش آؤ، فرمایا:

﴿ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ (٤٢/ الشورى: ٢٣)

''کہہ اے پیغمبر (ﷺ)! کہ میں تم سے اس پر بجز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ ناتے میں محبت اور پیار کرو۔''

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو وصلِ رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں، اسی لفظ کی دوسری معروف شکل قطع رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہیں، کہ رحم مادری ہی تعلقات قرابت کی جڑ ہے، کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوق محبت و نمانت کی اصلی گرہ ہے، یہ اشتراک کہیں ہم عمری، کہیں ہمدرسی، کہیں ہمسائیگی، کہیں ہم مذاقی، کہیں ہم پیشگی، کہیں ہم وطنی، کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں

ہوتا ہے، اس اشتراک کے عقد محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائیگی واجب ہے، لیکن ان تمام بندھ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن، رحم مادر ہے، یہ ہم رحمی خالقِ فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے، جو متفرق انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دستِ قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے، اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ان لوگوں کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کریں وحی محمدی نے ''فاسق'' کا خطاب دیا ہے اور ان کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے:

﴿ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ ﴾ (۲/ البقرة: ۲۶۔۲۷)

''اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے، جو حکم نہیں مانتے جو اللہ کا عہد باندھ کر توڑتے ہیں اور اللہ نے جسکے جوڑنے کو کہا، اس کو کاٹتے ہیں۔''

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے انسانوں کی اسی فطری گرہ کی تشریح استعارہ کے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحمٰن (اللہ) سے مشتق ہے، اس لیے محبت والے اللہ نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا کہ ''جس نے تجھ کو ملایا، اس کو میں نے ملایا، جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا۔'' [1] اسی مفہوم کو استعارہ کے اور گہرے رنگ میں آنحضرت ﷺ نے یوں ادا فرمایا کہ ''رحم انسانی عرش الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے: جو مجھے ملائے اس کو اللہ ملائے اور جو مجھے کاٹے اس کو اللہ کاٹے''۔ [2] ایک اور موقع پر آنحضرت ﷺ نے حسنِ تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا، ارشاد ہوا کہ ''جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے اللہ کا دامن (اصل میں حقوہ ہے) تھام لیا، اللہ نے فرمایا: ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہو گا جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا، کیا تو اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاؤں، جو تجھ کو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں''۔ [3] یعنی رحم مادر اور اس رحمٰن کے رحم (و کرم) کے درمیان حرفوں کا یہ اشتراک، محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر میں اہلِ قرابت کی ہے۔

رحم اور رحمٰن کے اس جوڑ کی طرف خود قرآن پاک کی ایک آیت میں بھی اشارہ ہے، سورۂ نساء میں فرمایا:

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ ﴾ (٤/ النسآء: ١)

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من وصل وصله الله: ۵۹۸۸، ۵۹۸۹۔

[2] صحیح بخاری، ایضا ومسلم، کتاب البر والصلة: ٦٥١٩۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الادب: ۵۹۸۷ ومسلم، کتاب البر والصلة: ٦٥١٨۔

"اور جس اللہ کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس کا اور رشتوں کا خیال رکھو۔"

اس آیت پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھئے:

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آکر عرض کی کہ یارسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جو مجھے جنت میں لے جائے، فرمایا: "اللہ کی بندگی کرو، کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ، نماز پوری طرح ادا کرو، زکوۃ دو اور قرابت کا حق (صلہ رحم) ادا کرو۔" [1]

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ "جو صلۂ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔" [2] (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک رکا رہے گا، جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہولے گا، یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہیے کہ صلۂ رحمی کرے۔" [3] اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت میں فراخی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے، کیونکہ صلہ رحم کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے، دوسری یہ کہ اللہ کی دی ہوئی عمر میں سے کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے، پہلے کا نتیجہ اللہ کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی اور دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی صورت میں ملتا ہے۔

اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کی جاسکتی ہے، انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اس کے لیے اضمحلال، تکدر اور دلی پریشانی کا سبب ہوتے ہیں، لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کے برتاؤ صلہ رحم اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں، ان کی زندگی میں خانگی مسرت، انشراح اور طمانیت خاطر رہتی ہے، جس کی وجہ سے ان کی دولت اور عمر دونوں میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے، ترمذی میں یہ حدیث ان لفظوں میں ہے: "صلۂ رحم سے قرابت والوں میں محبت، مال میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔" [4]

احادیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلۂ رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلہ رحم کا جواب صلہ رحم سے دے بلکہ یہ ہے کہ جو قطعِ رحم کرتا ہے، اس کے ساتھ صلۂ رحم کیا جائے، [5] یعنی جو قرابت کا حق ادا نہیں کرتے ہیں، ان کا حق ادا کیا جائے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب فضل صلة الرحم: ۵۹۸۳۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب اثم القاطع: ۵۹۸۴۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من بسط له فی الرزق لصلة الرحم: ۵۹۸۵، ۵۹۸۶۔

[4] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی تعلیم النسب: ۱۹۷۹۔

[5] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافی: ۵۹۹۱۔

ہمسایہ کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہیں، جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں، انسانیت اور اس کے تمدن کی بنیاد باہمی اشتراک عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے، اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے، اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے میں سے اس کو بھی کھلائے، اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہو اس کی تیمارداری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی، باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی گرہ میں بندھ کر ایک ہو جائے، ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علیحدہ اور بجائے خود مستقل ہے، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہوا اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو، اسی لیے ہر مذہب نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں، آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے کہ وہی وقت پر اوردن سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اسی سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، اس لیے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک کو دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے، تاکہ برائیوں کا سدباب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے بہشت کا نمونہ ہو اور ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

اسلام نے انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہمسائیگی کے حقوق کی دفعات بنائی ہیں، عربوں میں دوسری قوموں سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائیگی کے حقوق نہایت اہم تھے، بلکہ وہ عزت اور افتخار کا موجب تھے، اگر کسی عرب کے پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دوسرے پڑوسی کے لیے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا اور اس لیے اس کی خاطر لڑنے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا، اسلام نے آکر عربوں کے اس احساس کو چند ترمیموں اور اصلاحوں کے ساتھ اور زیادہ قوی کر دیا۔ وحی محمدی ﷺ نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے، جس کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہیں کہتے، مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے، جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دوکان کے دو شریک، کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسائیگی ہے اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے، ان سب قسموں کے ہمسایوں میں تقدم اس کو حاصل ہے، جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت، یا ہم مذہبی کا، یا کوئی اور دوہرا تعلق بھی ہو، قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ ﴾ (٤/ النسآء: ٣٦)

''(اور اللہ نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ (نیکی کا حکم دیا ہے)۔''

اس ''قریب'' اور ''بیگانہ'' کے معنوں میں اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے، ایک کہتا ہے کہ ''قریب کے'' معنی رشتہ دار وعزیز اور ''بیگانہ'' کے معنی غیر اور اجنبی کے ہیں، دوسرے کی رائے ہے کہ ''نزدیک'' کے معنی ہم مذہب کے ہیں اور ''دور'' سے مطلب دوسرے مذاہب والے ہیں، جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ، ❶ لیکن حقیقت میں یہ اختلاف بے معنی ہے، تعلیم محمدی ﷺ کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسایوں میں ان کو ترجیح دی جائے گی، جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائیگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو، وہ خواہ قرابت اور عزیز داری ہو، یا ہم مذہبی ہو، یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو، بہرحال حق کے ساتھ دوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے۔

اس حکم الٰہی کی تفسیر آنحضرت ﷺ نے مختلف طریقوں سے فرمائی، سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ نے اس کو ایمان کا براہِ راست اثر اور نتیجہ فرمایا، ایک دن صحابہ کے مجمع میں آپ تشریف رکھتے تھے، کہ ایک خاص دلنشین انداز سے فرمایا: ''اللہ کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، اللہ کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، اللہ کی قسم وہ مومن نہ ہوگا''۔ جان نثاروں نے پوچھا: کون؟ یارسول اللہ ﷺ! فرمایا: ''وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں''۔ ❷ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو اللہ اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے''۔ ❸ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ اور روز جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے''۔ ❹

ایک اور موقع پر اس کو تقرب الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا، ارشاد فرمایا: ''اللہ کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہے اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہے۔'' ❺ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تعلیم کی غرض سے ان سے فرمایا کہ ''جبریل علیہ السلام نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ کہیں ان کو وراثت کا حق نہ دلا دیں''۔ ❻ حقیقت میں یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہمسایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے، آنحضرت ﷺ خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے، اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ! میرے دو پڑوسی ہیں، تو میں ان میں سے کس کے پاس بھیجوں؟ فرمایا: ''جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو''۔ ❼

---

❶ ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب اثم من لا یأمن جاره بوائقه: ٦٠١٦۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الادب: ٦٠١٩۔ ❹ ایضاً: ٦٠١٨۔

❺ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی حق الجوار: ١٩٤٤۔ ❻ صحیح بخاری، کتاب الادب: ٦٠١٤۔

❼ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب حق الجوار فی قرب الابواب: ٦٠٢٠۔

اس ہدیہ اور تحفہ کے لیے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں، بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لیے کافی ہیں، کچھ نہ ہو سکے تو گوشت کا شوربا ہی ہو اور وہ زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیوں نہ ہو، اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذر رضی اللہ عنہ کو نصیحت فرمائی کہ ''اے ابوذر! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہو۔'' ❶

ان تحفوں کے بھیجنے بھجانے کا زیادہ موقع عورتوں کو پیش آتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ''اے مسلمانوں کی بیویو! تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کو حقیر نہ سمجھے، اگرچہ بکری کی کھر ہی کیوں نہ ہو''۔ ❷ یہ نصیحت دونوں بیویوں کے لیے ہے، یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے اور نہ دوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو دیکھ کر اس کی حقارت کرے۔ ایک مسلمان کی مروت اور شرافت کا یہ اقتضا نہیں کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف کی پروا نہ کرے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مومن وہ نہیں جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے۔'' ❸

برائی برائی ہے جہاں بھی ہو اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو، لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہاں لازمی طور سے نیکی ہونی چاہیے تھی، تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور برائی کا درجہ عام گناہوں اور برائیوں سے بدرجہا زیادہ ہے، بدقسمت انسان چوری ہر جگہ کر سکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ پڑوس کے مکان میں چوری کرنا کتنا برا ہے، بدکاری ہر جگہ اس سے ممکن ہے، مگر پڑوس کے گھر میں جہاں سے دن رات کی آمد و رفت ہے اور جہاں کے مرد پڑوس کے شریف مردوں پر بھروسہ کر کے باہر جاتے ہیں، اخلاقی خیانت کس قدر شرمناک ہے، اسی لیے توراۃ میں یہ حکم تھا:

''تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے، تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر، تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ نہ کر''۔ (خروج ۲۰۔ ۱۷)

''تو اپنے پڑوسی سے، دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے''۔ (احبار ۱۹۔ ۱۳)

اسلام نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبان حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل ان الفاظ میں فرمائی، جن میں تورات کی طرح صرف ممانعت پر بس نہیں کی ہے، بلکہ اس کو دس گنا زیادہ برا کر کے دکھایا، ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

''زنا حرام ہے، اللہ و رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے، چوری حرام ہے، اللہ و رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس گھروں

❶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب الوصیة بالجار...... : ٦٦٨٨۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب لاتحقرن جارة لجارتها: ٦٠١٧۔

❸ ادب المفرد امام بخاری، باب لا یشبع دون جاره: ١١٢؛ مسند بزار: ١١٩۔

میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرا لے۔“ ❶

دو صحابیہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں، دن کو روزے رکھتیں، صدقہ وخیرات بھی بہت کرتیں، مگر زبان کی تیز تھیں، زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں، لوگوں نے ان کا حال آپ سے عرض کیا تو فرمایا: ”ان میں کوئی نیکی نہیں، ان کو دوزخ کی سزا ملے گی۔“ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے دوسری بی بی کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں اور معمولی صدقہ دے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں، فرمایا: یہ بی بی جنتی ہوگی“۔ ❷

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا: ”تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو۔“ (مرقس ۱۲۔۳۰)

آنحضرت ﷺ نے اپنی تکمیلی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے مانند پیار کرنے پر قناعت فرمائی، بلکہ جو نہ کرے اس کی سب سے بڑی دولت، یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا، ارشاد ہے:

”تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لیے وہی پیار نہ رکھے، جو خود اپنی جان کے لیے پیار رکھتا ہے“۔ ❸

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں، بلکہ اللہ اور رسول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا، فرمایا: ”جس کو یہ پسند ہو کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو پیار کرے، یا جس کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو، تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے“۔ ❹ اسی لیے فرمایا: ”قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں سب سے پہلے وہ دو مدعی اور مدعا علیہ پیش ہوں گے، جو پڑوسی ہوں گے۔“ ❺ انسان کی خوش خلقی اور بدخلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو، چنانچہ ایک دن صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا برا؟ فرمایا: ”جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سنو، تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو اور جب برا کہتے سنو تو سمجھو کہ برا کر رہے ہو“۔ ❻

کوئی پڑوسی اگر برائی کرے تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کرو، مگر اس کی برائی کے بدلہ میں تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو، یہ احسان خود اس کو شرمندہ کرے گا، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یارسول اللہ ﷺ! میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے، فرمایا: ”جاؤ صبر کرو۔“ اس کے بعد پھر شکایت لے کر آئے، پھر یہی نصیحت کی، وہ پھر آئے اور یہ عرض کی، فرمایا: ”جاکر تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو“ (یعنی گھر سے منتقل ہونے کی صورت بناؤ) ان صحابی نے یہی کیا، آنے جانے والوں نے پوچھا بات کیا ہے، انھوں نے حقیقت حال بتائی، سب نے ان کے پڑوسی کو برا بھلا کہا، یہ دیکھ کہ وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ وہ ان کو منا کر پھر گھر میں واپس لایا اور وعدہ کیا کہ وہ آیندہ نہ ستائے گا۔ ❼

---

❶ ادب المفرد امام بخاری، باب حق الجار:۱۰۳۔ ❷ ادب المفرد امام بخاری، باب لا یؤذی جارہ:۱۱۹۔
❸ صحیح مسلم، کتاب الایمان:۱۷۱۔ ❹ مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب الشفعة والرحمة علی الخلق؛ الفصل الثالث: ٤٩٩٠؛ شعب الایمان للبیهقی: ۱۵۳۳۔ ❺ مسند احمد بن حنبل، ج ٤، ص:۱۵۱۔
❻ سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الثناء الحسن: ٤٢٢٢۔ ❼ ادب المفرد بخاری، باب شکایة الجار: ١٢٤، ١٢٥ وابو داود، کتاب الادب، باب فی حق الجوار: ۵۱۵۳۔

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گزار بن گیا تھا، ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ گوشت کا بڑا لوتھڑا لٹکائے جا رہے ہیں، پوچھا کیا ہے؟ عرض کی، امیر المومنین! گوشت کھانے کو جی چاہا تھا تو ایک درہم کا گوشت خریدا ہے، فرمایا، اے جابر! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو، کیا یہ آیت یاد نہ رہی: [1]

﴿ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ﴾ (٤٦/ الاحقاف: ٢٠)

''اور جس دن کافر دوزخ پر پیش ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) تم اپنے مزے اپنی دنیا کی زندگی میں لے جا چکے اور اس سے فائدہ اٹھا چکے۔''

غور کرو کہ گوشت کا وہ لوتھڑا بھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا حصہ نہ ہو، وہ دنیا کی مکروہ لذت قرار پاتی ہے، جسکے مواخذہ کا ان کو ڈر لگتا ہے۔ ہمسایوں میں دوست و دشمن اور مسلم وغیر مسلم کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انھوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا؟ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے سنا ہے کہ ''مجھے جبریل ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حق دار بنا دیں گے۔'' [2]

---

[1] مؤطا امام مالک، کتاب صفة النبی ﷺ، باب ماجاء فی اکل اللحم: ١٧٤٢۔

[2] ابو داود، کتاب الادب، باب فی حق الجوار: ٥١٥٢۔

یتیموں کے حقوق

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایہ محبت سے محروم ہے، جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوش محبت میں لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے، اس کے متروکہ مال واسباب کی حفاظت کرے، اس کی تعلیم وتربیت کی فکر رکھے، عقل وشعور کے پہنچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائیداد اس کو واپس دے اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور ان کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے، یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا۔ عربوں میں روزانہ کے قتل وغارت اور بدامنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی، مگر جیسا کہ چاہیے ان کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا، وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے، کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے، [1] اور نہ سنگدل عربوں میں عام طور سے ان کے ساتھ رحم وشفقت کا جذبہ تھا، قرآن پاک میں ان کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار ہے:

﴿ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِؕ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَۙ ﴾

(۱۰۷/ الماعون:۱_۲)

''کیا تو نے اس کو دیکھا جو انصاف کو جھٹلاتا ہے، سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔''

ایک اور آیت میں ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کر جانا چاہتے ہیں:

﴿ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَۙ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِۙ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّاۙ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّاؕ ﴾ (۸۹/ الفجر:۱۷_۲۰)

''نہیں یہ بات نہیں بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دنیا کے مال ودولت پر جی بھر کے ریجھتے ہو۔''

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم وشفقت اور ان کی امداد وپرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے، توراۃ میں عشر اور زکوۃ کے مستحقین میں دوسرے لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے، کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہوں ''وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں۔'' (استثناء ۱۴_۲۹ و ۲۶_۱۲) انجیل نے ان بیچاروں کی کوئی دادرسی نہیں کی ہے اور نہ کسی تعلیم میں ان کا ذکر کیا ہے، اس مظلوم فرقہ کی اصلی دادرسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دین کامل کی شریعت لیکر دنیا میں آیا، وحی الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کر کے یاد دلا دیا:

[1] تفسیر ابن جریر طبری، سورۃ نساء، ج ٤، ص: ١٧٠۔

﴿ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ...... فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ ﴾ (۹۳/ الضحیٰ:٦ب۹)

''کیا تجھ کو اللہ نے یتیم نہیں پایا، تو اس نے پناہ دی ...... تو یتیم کو نہ دبا۔''

آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں بےبسی کے عالم میں رہے، یتیموں کے متعلق اخلاقی ہدایتیں فرماتے رہے اور قریش کے جفا پیشہ رئیسوں کو اس بےکس گروہ پر رحم و کرم کی دعوت دیتے رہے، چنانچہ مکی آیتوں میں یہ تعلیمات وحی ہوتی رہیں، دولتمندوں کو غریبوں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے، اس گھاٹی کو تم کیونکر پار کر سکتے ہو؟ ظلم و ستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر، بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے:

﴿ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ ﴾ (۹۰/ البلد:۱۴_۱۵)

''یا بھوک والے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو کھلانا۔''

نیکوں اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا کہ یہ وہ ہیں جو:

﴿ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا ﴾ (۷٦/ الدھر:۸)

''اور اس کی محبت کے ساتھ کھانا کسی غریب اور یتیم کو کھلاتے ہیں۔''

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی، سورۂ نساء میں اس بےکس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے، ان کو وراثت کا حق دلایا گیا اور متولی جو جاہلیت میں طرح طرح کی بددیانتی کرتے تھے، ان سے کہا گیا:

﴿ وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:۲)

''اور یتیموں کو ان کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دے دو اور ان کے اچھے مال کو اپنے برے مال سے بدلا نہ کرو اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر ان کا مال کھا جاؤ، یہ بڑے گناہ کی بات ہے۔''

دولتمند یتیم لڑکیوں کو ان کی جائداد پر قبضہ کر لینے کی غرض سے متولی اپنے نکاح میں لے آتے تھے اور بےوالی و وارث جان کر ان کو ستاتے تھے، اس پر حکم آیا:

﴿ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ﴾ (٤/ النسآء:۳)

''اگر تم کو ڈر ہے کہ ان یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو (ان کو چھوڑ اور) عورتوں سے جو تمہیں پسند ہو نکاح کر لو۔''

یتیم بچوں کے مال کو بددیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کر دینا چاہیے اور نہ جب تک ان کو پورا شعور آئے، وہ ان کے سپرد کیا جائے، بلکہ ان کے سنِ رشد کو پہنچنے کے بعد ان کی عقل کو دیکھ بھال کر ان کی یہ

امانت ان کو واپس کی جائے، فرمایا:

﴿ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ ﴾ (٤/ النسآء:٥۔٦)

''اور بے وقوفوں کو اپنے مال جس کو اللہ نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، نہ پکڑا دو اور ان کو کھلاتے اور پہناتے رہو اور ان سے معقول بات کہو اور یتیموں کو جانچتے رہو، جب وہ نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچیں تو ان میں اگر ہوشیاری دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔''

ان آیاتِ پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے، غور کرو کہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کو ناسمجھ یتیموں کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے، وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے، کہ تم اپنا مال ان کو نہ دو' اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سن رشد کے بعد متولیوں کو یتیموں کو مال واپس کر دینے کا حکم ہے، وہاں اس مال کی نسبت یتیموں کی طرف کی گئی کہ ''تم ان کا مال ان کو واپس کر دو''۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہیے جیسی اپنے مال کی اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا تک چن کر واپس کیا جائے، جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے، جس پر تمہارا کوئی حق نہیں، متولیوں کو جو یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلد جلد خرچ کر کے برابر کر دیتے تھے کہ یہ بڑے ہو کر تقاضا نہ کر بیٹھیں، اس بد دیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی:

﴿ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ ﴾ (٤/ النسآء:٦)

''اور اڑا کر اور جلدی کر کے ان کا مال نہ کھا جاؤ کہ کہیں یہ بڑے نہ ہو جائیں۔''

صاحبِ جائداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں، تو ان کے لیے ان یتیموں کی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلافِ اخلاق قرار دیا گیا اور اگر تنگ دست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی:

﴿ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ﴾ (٤/ النسآء:٦)

''اور جو (متولی) بے نیاز ہے، اس کو چاہیے کہ بچتا رہے اور جو محتاج ہے تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے۔''

اور آخر میں یہ جامع تعلیم دی گئی:

﴿ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ ﴾ (٤/ النسآء:١٢٧)

''اور یہ کہ یتیموں کے لیے انصاف پر قائم رہو۔''

سورۂ انعام میں یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی اور جانوروں کی حلت وحرمت میں بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی گناہوں سے بے پروائی دکھا کر جن اصلی روحانی واخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی، ان میں ایک یہ ہے کہ

﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ﴾ (٦/ الانعام:١٥٢)

''اور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچے۔''

سورۂ اسراء کے آٹھ اخلاقی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحب جائیداد کو یتیموں کی جائداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ پھٹکنا چاہیے اور دیانتداری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہیے۔ (سورۂ اسراء)

یہ تو صاحب جائیداد یتیموں کی نسبت تعلیم ہے، جو یتیم غریب ومفلس ہوں، ان کی مناسب پرورش اور امداد عام مسلمانوں کا فرض ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بقرہ، نساء، انفال اور حشر میں بار باران کی پرورش اور ان کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی، والْیَتٰمٰی والمساکین خیرات وصدقات کے بہترین مصرف قرار دیے گئے۔

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح میں بے والی ووارث امت کے سرپرست نے اپنی امت کے ان نیک دلوں کو جو بے والی ووارث یتیموں کے کفیل ہوں، خود اپنے برابر جگہ دی، فرمایا: ''میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا، جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے۔'' ❶ یہ بھی فرمایا کہ ''جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے اور اس کو کھلائے پلائے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا، بشرطیکہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشائش کے لائق نہ ہو۔'' ❷ نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ ''مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جا رہی ہے اور سب سے بدتر گھر وہ ہے، جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۔'' ❸

آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی، وہی دل جو بیکس وناتواں یتیموں کے لیے پتھر سے زیادہ سخت تھے، وہ موم سے زیادہ نرم ہو گئے، ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا، ایک ایک یتیم کے لطف وشفقت کے لیے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے اور ہر ایک اس کی پرورش اور کفالت کے لیے اپنے آغوش محبت کو پیش کرنے لگا، ❹ بدر کے یتیموں کے مقابلہ میں جگر گوشہ رسول فاطمہ بتول رضی اللہ عنہا اپنے

❶ صحيح بخاري، كتاب الادب، باب فضل من يعول يتيمًا: ٦٠٠٥ وصحيح مسلم، كتاب الزهد، باب فضل الاحسان الى......: ٧٤٦٩۔ ❷ ترغيب وترهيب منذري، ج٢، ص: ١٣٢، ١٣٣ بحواله ترمذي: ١٩١٧ (حديث حسن صحيح)۔ ❸ ايضًا، بحواله ابن ماجه: ٣٦٧٩ وادب المفرد، باب خير بيت من يعول يتيمًا......: ١٣٧۔ ❹ صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب عمرة القضاء: ٤٢٥١۔

دعویٰ کو اٹھا لیتی ہے، (1) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے خاندان (2) اور انصار (3) وغیرہ (4) کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لے جا کر دل و جان سے پالتی ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لیے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔ (5)

صحابہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یتیموں کو ان کا حصہ دینے اور ان کے مال و دولت کی تولیت اور نگرانی میں دیانت داری برتنے لگے، بلکہ ان کی جائیدادوں کی حفاظت میں فیاضی اور سیر چشمی کا پورا ثبوت دیا، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعویٰ پیش کیا، مگر وہ دعویٰ ثابت نہ ہو سکا اور آپ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا، وہ یتیم اس پر رو پڑا، آپ کو رحم آیا اور اس مدعا علیہ سے فرمایا کہ ''تم یہ نخلستان اس کو دے دو، اللہ تم کو اس کے بدلہ جنت دے گا۔'' وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا، ابوالدحداح صحابی حاضر تھے، انھوں نے اس شخص سے کہا، کیا تم اپنا یہ نخلستان میرے فلاں باغ سے بدلتے ہو، اس نے آمادگی ظاہر کی، انھوں نے فوراً بدل دیا اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا۔ (6) آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں، مگر اگر یہ سوال کیا جائے، کیا محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا، تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی، عرب پہلی سرزمین ہے، جہاں کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور عرب، مصر، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں، ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن و راحت کے گھر بنائے، ان کے وظیفے مقرر کیے، مکتب قائم کیے، جائیدادیں وقف کیں، (7) اور دنیا میں ایک نئے ادارے کی طرح ڈالی اور قانوناً اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی و سرپرست یتیموں کے سرپرست ہوں، ان کی جائیدادوں کی نگرانی، ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیاہ کا انتظام کریں، (8) اور یہی وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکوں میں کی جاتی ہے اور لندن کے لارڈ میر یا آرفس کورٹ کے حکام مسلمان قاضیوں کے ان فرائض کی نقل کرتے ہیں۔

---

(1) ابو داود، کتاب الخراج والفيء، باب في بيان مواضع قسم الخمس: ۲۹۸۷۔

(2) مؤطا امام مالك، كتاب الزكوٰة باب زكوٰة أموال اليتمٰى: ۵۸۷ وزكوٰة الحلى: ۵۸۴۔

(3) مسند احمد، ج۶، ص: ۲۶۹۔ (4) تذكرة الحفاظ ذهبی ذكر مسروق بن اجدع تابعی، ج۱، ص: ۴۲۔

(5) ادب المفرد امام بخاری، باب فضل من يعول يتيمًا: ۱۳۶۔ (6) استيعاب ابن عبدالبر تذكرة ابوالدحداح، ج۲، ص: ۶۶۳۔ (7) تاریخ اسلام میں یہ واقعات مذکور ہیں۔ (8) حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ((السلطان ولي من لا ولي له)) ابو داود، کتاب النکاح، باب في الولي: ۲۰۸۳ فقہ کی کتابوں میں قاضیوں کے یہ فرائض لکھے ہیں۔ قاضیوں کو جو شاہی فرامین تقرر کے وقت ملتے تھے۔ ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ ان کی تصریح ہوتی تھی۔

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو اوروں نے نکال دیا ہے، اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے اور کسی شریف شریک زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے اور جس مہر و عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہوگئی ہے، وہ اس کو پھر عطا کیا جائے، قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کو صریحًا یہ حکم دیا:

﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ﴾ (٢٤/ النور:٣٢)

''اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کردو۔''

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے، بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس بے کس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور عین اس وقت جب ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہیں اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے، آپ ﷺ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ بیوہ سے شادی کی اور پچیس برس تک اس طرح اس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً عورتوں سے نکاح کیے، جن میں سے آٹھ حضرت سودہ، حفصہ، زینب ام المساکین، ام سلمہ، جویریہ، ام حبیبہ، میمونہ اور صفیہ رضی اللہ عنہن بیوہ تھیں، جن کی کفالت کا بار آپ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا اور اس طرح اپنے پیرووں کے لیے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا۔

یہ تو آپ ﷺ کا عمل تھا، قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے، وہ اس فرقہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا با آسانی کر سکتا ہے، فرمایا:

((السّاعی علی الارملة والمسكين كالسّاعي في سبيل الله. واحسبه قال: كالقائم لا يفتر، وكالصائم لا يفطر)) [1]

''بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے، جیسا اللہ کی راہ میں دوڑنے والا، (اور راوی کہتا ہے کہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ) اور جیسا وہ نمازی جو نماز سے نہیں تھکتا اور وہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔''

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

((الساعی علی الارملة والمسكين كالمجاهد في سبيل الله وكالذي يصوم النهار ويقوم الليل)) [2]

[1] مشكوة، كتاب الادب، باب الشفقة والرحمة على الخلق، الفصل الاول: ٤٩٥١۔

[2] صحيح بخاری، كتاب الادب، باب الساعی علی المسكين: ٦٠٠٧؛ صحيح مسلم، كتاب الزهد، باب فضل الاحسان الى الارملة: ٧٤٦٨۔

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو اوروں نے نکال دیا ہے، اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے اور کسی شریف شریک زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے اور جس مہر و عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہوگئی ہے، وہ اس کو پھر عطا کیا جائے، قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کو صریحاً یہ حکم دیا:

﴿ وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ ﴾ (۲۴/ النور:۳۲)

''اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کردو۔''

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے، بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس بے کس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور عین اس وقت جب ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہیں اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے، آپ ﷺ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ بیوہ سے شادی کی اور پچیس برس تک اس طرح اس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً عورتوں سے نکاح کئے، جن میں سے آٹھ حضرت سودہ، حفصہ، زینب ام المساکین، ام سلمہ، جویریہ، ام حبیبہ، میمونہ اور صفیہ رضی اللہ عنہن بیوہ تھیں، جن کی کفالت کا بار آپ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا اور اس طرح اپنے پیروؤں کے لیے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا۔

یہ تو آپ ﷺ کا عمل تھا، قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے، وہ اس فرقہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا بآسانی کرسکتا ہے، فرمایا:

((السّاعی علی الارملة والمسکین کالسّاعی فی سبیل اللّٰه. واحسبه قال: کالقائم لا یفتر، وکالصائم لا یفطر)) [1]

''بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے، جیسا اللہ کی راہ میں دوڑنے والا، (اور راوی کہتا ہے کہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ) اور جیسا وہ نمازی جو نماز سے نہیں تھکتا اور وہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔''

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

((الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل اللّٰه وکالذی یصوم النهار ویقوم اللیل)) [2]

[1] مشکوة، کتاب الادب، باب الشفقة والرحمة علی الخلق، الفصل الاول: ٤٩٥١۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الساعی علی المسکین: ٦٠٠٧؛ صحیح مسلم، کتاب الزهد، باب فضل الاحسان الی الارملة: ٧٤٦٨۔

”بیوہ اور غریب کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا، اللہ کی راہ کے مجاہد کی طرح ہے اور اس کے برابر ہے، جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔“

ان بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں اور اس لیے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں لیکن ان ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دوسرے نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں، جب تک وہ بڑے ہو کر ان سے علیحدہ نہ ہو جائیں اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہو جائیں، یہ فرمایا: ”میں اور محنت و مشقت کے سبب سے وہ کالی پڑ جانے والی بیوی قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے، وہ حسن و جمال اور جاہ و عزت والی بیوی جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے لیکن اپنے ننھے یتیم بچوں کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے رہے، یہاں تک کہ وہ اس سے علیحدہ ہو جائیں، یا مر جائیں“۔ [1] اسی مقصد کی ایک روایت ابویعلیٰ کی مسند میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح ایک واقعہ کی صورت میں بھی بیان فرمایا کہ ”قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے، میں پوچھوں گا تو کون ہے؟ تو وہ کہے گی کہ میں ایک بیوہ ہوں، جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے“۔ [2]

---

[1] سنن ابو داود، کتاب الادب، باب فی فضل من عال یتامی: ۵۱۴۹۔

[2] حاشیہ سنن ابی داود بتحشیۃ ابی الحسنات محمد بن عبداللّٰہ ابن نور الدین پنجابی، مطبوعہ أصح المطابع لکھنؤ۔

حاجت مندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحب دولت اور بے نیاز ہو، کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دست نگر بننا پڑتا ہے اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے، اس لیے انسانی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجت مند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

قرآن پاک میں دو موقعوں پر ذرا سے فرق سے ایک آیت ہے:

﴿ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝﴾ (۵۱/ الذاریات:۱۹)

''اور جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیے حق ہے۔''

﴿ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝﴾ (۷۰/ المعارج:۲۳۔۲۴)

''اور جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والے اور محروم کے لیے مقررہ حق ہے۔''

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں، لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف ''بھیک منگے'' کے لینا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ اس سے ہر وہ ضرورت مند مراد ہو سکتا ہے، جو تم سے کسی مالی مدد کا خواست گار ہو، محروم کی تشریح میں اہل تفسیر کا اختلاف ہے، بعض اس کو محروم کہتے ہیں، جس کا مال غنیمت میں کوئی حصہ نہیں، کسی نے اس کے ظاہر معنی لیے ہیں کہ جو دولت سے محروم ہو، کوئی متعفف کے معنی لیتا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مصیبت زدہ ہے جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑ گئی ہو اور اب وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہو گیا ہو، اسی معنی کی تائید اہل لغت [1] اور بعض اہل تفسیر کے بیان اور قرآن پاک [2] سے ہوتی ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے، یا عام صدقہ، مفسرین دونوں آیتوں میں دونوں طرف گئے ہیں، مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات میں جس میں مطلق ''حق'' کا بیان ہے، مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے اور معارج میں جس میں مطلق ''حق'' کا نہیں بلکہ ''مقررہ حق'' کا بیان ہے ''زکوٰۃ'' مراد ہو، کیونکہ ''مقررہ حق'' کا مفہوم عام صدقہ پر نہیں، بلکہ زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حاجت مندوں کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو، دونوں طرح سے مدد مسلمانوں کے حقوق میں سے ایک حق ہے۔

قرآن پاک میں دوسرے موقع پر ہے:

﴿ وَاَمَّا السَّاۗىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝﴾ (۹۳/ الضحیٰ:۱۰)

---

[1] دیکھو لسان العرب لفظ محروم و محارف (اس مفہوم کی تائید لسان العرب کے محولہ بالا مقامات پر نہیں ملے گی)۔

[2] تفسیر ابن جریر میں سورۂ ذاریات ج ۲۶ ص:۱۱۲، معارج کی آیت مذکورہ ج ۲۹ ص:۴۵ سورۂ قلم میں اصحاب الجنۃ کے قصہ میں محرومون اور سورۂ واقعہ ج ۲۷ ص:۱۰۳ میں بل محرومون کے معنی میں ملاحظہ فرمائیں۔

''اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکا نہ کر۔''

یہاں ''سوال کرنے والے'' کے معنی اغنی کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہیں، مگر لفظ کا عموم وسعت کو چاہتا ہے، یعنی ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواست گار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی ہو۔ [1] یہاں تک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے، تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے، اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو، بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کرو۔

مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴾ (٤/ النسآء:٨٥)

''جو نیک بات کی سفارش کرے گا تو اس کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہوگا اور جو بری بات کی سفارش کرے گا تو اس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائے گا اور اللہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔''

اگرچہ یہ آیت عبارت کے نظم و نسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ میں ہے، یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقتور قبیلہ کے مقابلہ میں اس کی امداد کی سفارش کی جائے، تو اس نیک کام میں اس کی سفارش کی جائے اور وہ قبول کی جائے، تاہم الفاظ قرآنی کی وسعت ہر نیک کام کی سفارش تک وسیع ہے اور اس میں یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جدوجہد میں جتنا حصہ بھی لیا جائے، حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب میں شریک ہوگا، ایسا ہی برے کام کی جدوجہد میں حصہ لینا اس کے گناہ میں شریک ہونا ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٢)

''اور نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو اور ڈرو اللہ سے، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

غرض یہ ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری، ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا اور جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت میں ہو تو وہ اس کو دینا، ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے، جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہیے، آنحضرت ﷺ نے گویا انہی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

((من كان فى حاجة اخيه كان الله فى حاجته ومن فرج عن مسلم كربة فرج

[1] طبری میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے وَاَمَّا مَنْ سَاَلَكَ مِنْ ذِیْ حَاجَةٍ فَلَا تَنْهَرْ ج ٣٠، ص:١٢٨ از مخشری نے کشاف ج ٢، ص:٦١٦ میں لکھا ہے کہ بعضوں نے اس سائل سے مراد طالب علم لیا ہے۔

الله عنه كربة من كربات يوم القيامة)) ❶

''جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا، تو اللہ اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا اور جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا، تو اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا۔''

ایک دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا:

((والله في عون عبده ما كان العبد في عون اخيه)) ❷

''اللہ اپنے بندہ کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے پاس کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو آپ صحابہ سے فرماتے: ''تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب ملے گا۔'' ❸ ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ ''اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بے کس حاجت مند کی مدد ہی کیا کرو۔'' ❹ یہ بھی فرمایا کہ ''بھولے بھٹکے ہوئے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے۔'' ❺ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ''جو شخص راستہ چلتے میں کوئی کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو خداوند تعالیٰ اس کے اس کام کی قدر کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے۔'' ❻

---

❶ صحيح بخارى، كتاب المظالم، باب لا يظلم المسلم......: ٢٤٤٢؛ صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم: ٦٥٧٨۔ ❷ ترمذى، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فى الستر على المسلمين: ١٩٣٠۔
❸ صحيح بخارى، كتاب الادب، باب تعاون المؤمنين: ٦٠٢٧ وباب قول الله ﴿من يشفع شفاعة حسنة﴾: ٦٠٢٨۔
❹ ايضا باب كل معروف صدقة: ٦٠٢٢۔ ❺ ترمذى، كتاب البر والصلة، باب ماجاء فى صنائع المعروف: ١٩٥٦۔ ❻ ترمذى، كتاب البر والصلة، باب ما جاء فى اماطة الاذى عن الطريق: ١٩٥٨۔

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے، بیماروں اور مریضوں کا ہے، یہ عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبر گیری اور خدمت آپ نہیں کر سکتے، ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دیکھ بھال، خدمت، غم خواری اور تیمارداری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے اور اس فرض کا نام عربی میں ''عیادت'' ہے۔ [1] ان بیماروں کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہیں، یا جن کے ادا کرنے سے ان کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے، ان کو یک قلم معاف یا کم کر دیا ہے اور قرآن نے اس کے لیے ایک کلی اصول بنا دیا ہے:

﴿ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ﴾ (۲۴/ النور:۶۱)

''اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔''

﴿ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ﴾ (۴۸/ الفتح :۱۷)

''نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد میں شریک ہو) اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر۔''

﴿ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى ﴾ (۹/ التوبۃ:۹۱)

''نہ کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر (جہاد کے عدم شرکت کی باز پرس ہے)۔''

بیماروں کے لیے وضو معاف ہے، ﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى ﴾ ''یا تم بیمار ہو تو تیمم کرو'' (۵/ المآئدۃ :۶) اسی طرح ان سے تہجد کی لمبی نمازیں معاف ہیں ﴿ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ﴾ ''اللہ کو معلوم تھا کہ تم میں کچھ بیمار بھی ہوں گے۔'' (۷۳/ المزمل: ۲۰) اسی طرح حج کے احکام میں بھی بیمار کے لیے رعایت فرمائی گئی: ﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا ﴾ ''تو تم میں جو بیمار ہو۔'' (۲/ البقرۃ:۱۹۶) روزہ توڑنے کی اس

[1] عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ المریض کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہیں، یعنی کسی بیمار کو بیماری کی حالت میں دیکھنے کو جانا لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے، بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پرسی کے بھی ہیں اور اس کی تیمارداری غم خواری اور خدمت گزاری کے بھی ہیں۔ بیمار کو بیماری کی حالت میں صرف دیکھنے کو جانا تو عیادت کی معمولی قسم ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی غم خواری کرے، اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی پوری تیمارداری اور خدمت گزاری کرے۔ عرب کا ایک قدیم شاعر جو حجاج کے زمانہ میں تھا کہتا ہے:

ذهب الرقاد فما يحس رقاد　　مما شجاك ونامت العواد

''تجھے جو غم پہنچا اس سے نیند چلی گئی تو نیند معلوم نہیں ہوتی اور عیادت کرنے والے سو گئے۔'' قاعدہ یہ ہے کہ کسی تیماردار اور خدمت گزار اس کی آخری حالت میں شب و روز اس کی خدمت میں جاگتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی کئی کئی راتیں کٹ جاتی ہیں۔ لیکن جب بیمار سے مایوسی ہو جاتی ہے اور وہ موت کے قریب ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے، تو پھر ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے اور وہ سو جاتے ہیں۔ اب اگر ''عیادت'' کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہوتے تو عیادت کرنے والوں کے سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ''عیادت'' کی وسعت میں خدمت گزاری اور تیمارداری سے لے کر بیمار پرسی تک سارے مدارج داخل ہیں اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کو دیکھنے کو جانے ہی کے ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ جب صرف اس کے دیکھنے جانے کا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت اور تیمارداری کا ثواب کتنا ہوگا۔

کو اجازت دی گئی، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر نماز کی رخصت دی گئی، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جب اللہ نے ان سے اپنے فرائض معاف کر دیے تو بندوں کو کس حد تک ان سے اپنے اخلاقی مطالبہ میں کمی کر دینی چاہیے۔

اسلام نے مسلمانوں کی بیماری کی تکلیف کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت میں غم کے بجائے خوشخبری بنا دیا ہے۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے، وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے، اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کرے تو آخرت کے عذاب شدید سے بچانے کے لیے وہ اس کے گناہوں کا معاوضہ بن جاتی ہیں اور وہ پاک وصاف ہو جاتا ہے۔ [1]

آنحضرت ﷺ نے بیماروں کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے، اس کے آداب تعلیم کیے ہیں، اس کی دعائیں سکھائی ہیں اور اس کا ثواب بتایا ہے، فرمایا: ''جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کرے گا اللہ اس کے غم کو ہلکا کرے گا۔'' [2] اور یہ بھی فرمایا کہ ''ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں، جن میں ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اس کی عیادت کرے۔'' [3] صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حضور نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا تھا، جن میں سے ایک بیمار کی عیادت ہے۔ [4] ارشاد ہوا کہ ''جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لیے بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے ہیں۔'' [5] یہ بھی آیا ہے کہ ''جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ واپسی تک جنت کے میوے چنتا رہتا ہے''۔ [6] فرمایا کہ ''جب کوئی کسی کی عیادت کے لیے جائے تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اس کو تسلی اور دلاسا دے اور اس کو شفا پانے کے لیے اللہ سے دعا کرے۔'' [7] آنحضرت اور آپ کی تعلیم سے صحابہ کرام کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے، بلکہ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان کی بھی تفریق نہ تھی، آپ ﷺ نے یہودیوں کی عیادت فرمائی ہے۔ [8] منافقوں کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں، [9] اور اسی سے علما نے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے۔ [10] حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جب زخمی ہوئے تو آپ نے ان

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب ثواب المؤمن فیما یصیبه: ٦٥٦٢ تا ٦٥٦٨؛ سنن ابی داود، کتاب الجنائز، باب الامراض المکفرة للذنوب: ٣٠٨٩۔ [2] ابو داود، کتاب الادب، باب فی المعونة للمسلم: ٤٩٤٦۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الامر باتباع الجنائز: ١٢٤٠۔ [4] ایضًا: ١٢٣٩۔

[5] سنن ابی داود، کتاب الجنائز، باب فضل العیادة: ٣٠٩٨۔ [6] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل عیادة المریض، بطریق مختلفة: ٦٥٥١، ٦٥٥٤۔ [7] سنن ابی داود، کتاب الجنائز: ٣١٠٤۔

[8] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی: ١٣٥٦۔ [9] ابو داود، کتاب الجنائز، باب العیادة: ٣٠٩٤۔ [10] مجمع البحار علامه طاهر فتنی لفظ عیادة، ج٣، ص: ٦٩٥۔

کا خیمہ مسجد میں نصب فرمایا، تاکہ بار باران کی عیادت کی جا سکے۔ [1] رفیدہ رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ تھیں جو ثواب کی خاطر زخمیوں کا علاج اوران کی خدمت کیا کرتی تھیں، ان کا خیمہ بھی اسی مسجد میں رہتا تھا، تاکہ لڑائیوں کے مسلمان زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی کریں۔ [2] غزوات اور لڑائیوں میں بھی بعض ایسی بیبیاں فوج کے ساتھ رہتی تھیں جو بیماروں کی خدمت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ [3] آپ ﷺ نے اپنے پیروؤں کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ ''بھوکے کو کھلاؤ، قیدی کو چھڑاؤ اور بیمار کی عیادت کرو۔'' [4]

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل مؤثر و دلکش طرز ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا، کہ ''اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو میری عیادت تو نے نہ کی، وہ کہے گا، اے میرے پروردگار! تو، تو سارے جہان کا پروردگار ہے، میں تیری عیادت کیونکر کرتا؟ فرمائے گا: کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا بندہ بیمار رہا، مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا، تو مجھے اس کے پاس پاتا''۔ [5] تعلیم کی یہ طرز ادا، بیمار پرسی، بیماروں کی تیمارداری اور غم خواری کی کیسی دل نشین تلقین ہے اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرہانے کھڑا، اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے اور اس کے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں، جو ان بیماروں کی خدمت کر کے اللہ کا قرب پاتے ہیں۔

---

[1] سنن ابی داود، کتاب الجنائز، باب فی العیادة مرارًا: ۳۱۰۱۔

[2] سیرة ابن هشام، غزوة بنی قریظة، ج ۲، ص: ۷۰ وادب المفرد بخاری، باب کیف اصبحت: ۱۱۲۹ واصابہ ابن حجر وغیرہ میں حضرت رفیدہ رضی اللہ عنہا کا حال پڑھیے۔

[3] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة النساء: ٤٦٨٢۔ [4] مسند احمد، ج ٤، ص: ٣٩٤۔

[5] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل عيادة المريض: ٦٥٥٦۔

غلاموں کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتواں طبقوں میں غلاموں کی بھی ایک جماعت ہے، ہم کو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے، یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے، قوی اور فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے، یعنی خود بادشاہ بن کر عیش و راحت، سیر و تفریح اور حکومت و شہنشاہی کے کام کیے اور مفتوح افراد سے کان کنی، کاشتکاری اور محنت و مزدوری کے مشقت والے کام لیے، ہندوؤں میں اچھوت قومیں اسی کی یادگار ہیں، مصریوں میں قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی، رومیوں میں غیر رومی اسی غلامی اور مشقت و محنت کے کاموں میں مصروف رکھے جاتے تھے اور عربوں میں بھی ان کے ساتھ یہی برتاؤ تھا، بلکہ عربوں میں قبائلی نظام ہونے کے سبب سے ہر وہ شخص جو کسی قبیلہ سے وابستہ نہ تھا، وہ مظلوم ہر قبیلہ کے آدمیوں کے ظلم و ستم کا تختہ مشق تھا، کیوں کہ اس کو اپنی حفاظت کے لیے کسی قبیلہ کی قوت حاصل نہ تھی، چنانچہ اسلام کے آغاز میں ظالم قریشیوں نے جن لوگوں پر سب سے زیادہ ستم ڈھائے وہ یہی تھے۔ اسلام زیردستوں کی مدد اور کمزوروں کی حمایت میں اٹھا تھا، نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے جس معاہدہ فضول میں شرکت کی تھی اور جس کو نبوت کے بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے، وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ان زیردستوں کی حفاظت اور حمایت کی جائے، اسی لیے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسوں سے پہلے، قریش کے غلاموں اور کنیزوں نے لبیک کہا، چنانچہ زید بن حارثہ، خباب بن الارت، بلال حبشی، یاسر یمنی، عمار، صہیب رومی، ابوفکیہہ، عامر بن فہیرہ اور سالم رضی اللہ عنہم غلاموں میں اور لبینہ، زنیرہ، نہدیہ، ام عبیس اور سمیہ رضی اللہ عنہن لونڈیوں میں سب سے پہلے اسلام کے آغوش میں آئیں اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے سوا جو آنحضرت ﷺ کے سایہ میں پرورش پا رہے تھے، سب نے اسلام کی محبت اور الفت میں سخت سے سخت کڑیاں جھیلیں اور بعض نے اسی راہ میں اپنی جانیں بھی دیں۔ اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جزو بنا لیا تھا، غلاموں کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا، سورۂ بلد میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی، جن کاموں کو ''گھاٹی'' بتایا گیا ہے، ان میں ایک ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ﴾ گردن سے غلامی کی رسی کھولنا بھی ہے۔ چنانچہ مکہ کی پرخطر زندگی میں بھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دوسرے اہل ثروت مسلمانوں نے بہت سے غلاموں کو کافروں سے خرید خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ مدینہ آکر اس تحریک نے اور فروغ پایا، ﴿تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ﴾ یعنی گردن کو آزاد کرنا۔ بہت سی فروگزاشتوں کا کفارہ قرار پایا اور غلاموں کے آزاد کرنے کے لیے بہت سی ترغیبات کا اعلان کیا گیا، صحابہ نے اپنے پیغمبر کی اس آواز پر لبیک کہا اور چند روز میں غلاموں کی دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی، حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے ہیں، اسلام کے بعد سو غلام آزاد کیے [1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے صرف ایک قسم کے کفارہ

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حکم عمل الکافر اذا اسلم:۳۲۶۔

میں چالیس غلام آزاد کیے ❶ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے تیس ہزار غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا کی۔ ❷ شرک کی ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اس کے بندوں کے ساتھ نیکی کی جائے، ان بندوں میں سرفہرست جن لوگوں کے نام ہیں، ان میں یہ مظلوم فرقہ بھی ہے، فرمایا:

﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔـا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ﴾ (٤/ النسآء:٣٦)

''اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور عزیز پڑوسی اور بے گانہ پڑوسی کے ساتھ اور پہلو کے رفیق کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور اس کے ساتھ جس کے تمہارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں اور اللہ غرور اور فخاری کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے، لیکن اسلام نے اس کی بھی ممانعت کر دی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''کوئی آقا اپنے غلام کو عبد نہ کہے، بلکہ فتائی میرا جوان کہے اور اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ ''وہ اپنے آقاؤں کو رب نہ کہیں، بلکہ مولیٰ کہیں۔'' ❸ اس طرح ان ذلت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کر دیا اور فرمایا کہ ''یہ جن کو تم غلام کہتے ہو یہ بھی تمہارے بھائی ہیں، جن کو اللہ نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے، پس جس کو اللہ نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے، تو اس کو وہ کھلاؤ جو تم کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو اور اس کو اتنا کام نہ دے دو، جو اس پر بھاری ہو جائے اور جو بھاری کام بھی دے تو اس کے کام میں خود بھی شریک ہو کر اس کی مدد کرے۔'' ❹

حضور ﷺ کے اس حکم پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی تھی، ❺ ان بے خانمان افراد کو ان کے آقاؤں کے گھروں کا غلام بنا کر نہیں، بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا کر رکھا، کہ جس غلام کو جو آزاد کرے گا وہ اسی کے علاقہ مندوں (موالی) میں شمار ہوگا، ❻

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الهجرة: ٦٠٧٣ تا ٦٠٧٥۔ ❷ یہ دونوں تعدادیں امیر اسماعیل نے شرح بلوغ المرام کتاب العتق ج ۲ ص: ۲۳۵ میں نقل کی ہیں۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب العتق، باب کراهية التطاول على الرقيق: ٢٥٥٢۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الادب باب ما ينهى من السباب: ٦٠٥٠۔

❺ صحیح بخاری، کتاب الادب باب ماینهى من السباب: ٦٠٥٠۔

❻ حدیث میں ہے: ((انما الولاء لمن اعتق)) ''ولاء کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے۔'' مسلم، کتاب العتق، باب بیان ان الولاء ..... ٣٧٧٩ دوسری حدیث میں: ((او انتمى الى غير مواليه فعليه لعنة الله)) الخ ''جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے تو اس پر اللہ کی لعنت۔'' امام نووی شرح میں لکھتے ہیں بل هو لحمة كلحمة النسب یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولاء کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے (صحیح مسلم، کتاب العتق، باب تحریم تولی العتیق ..... ٣٧٩٤)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں اپنے فوجی افسروں کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں، ان کو ان کے قدیم آقاؤں کے خاندانوں میں شمار کرو، جو ان کا حق ہو وہ ان کا ہو اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنا لیں۔ [1] ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں، بلکہ اسلام کا سردار اور مملکتوں کا بادشاہ بنا دیا، اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے، جس کی تفصیل آیندہ جلد میں اپنے مناسب موقع پر آئے گی۔

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ مطبوعہ مصر، ص: ۲۳۵۔

مہمان کے حقوق

موجودہ نظامِ تمدن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریسٹورانوں نے اپنے سر لے لی ہے، مگر گزشتہ نظامِ تمدن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدن کے خمیر میں داخل ہے اور مغربی تمدن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے، ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے، اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلہ اخلاق کی ہے، آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کریں گے، تو کل وہ ہمارے ساتھ کرے گا، گزشتہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں، لیکن اہل عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا، مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا، اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھا دیا۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا ذکر سورۂ ذاریات کی ان آیتوں میں آیا ہے:

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝﴾

(۵۱/ الذاریات: ۲۴۔۲۸)

"(اے پیغمبر ﷺ) ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے؟ کہ جب (یہ لوگ) ان کے پاس آئے تو (آتے ہی) سلام علیک کی، ابراہیم نے سلام کا جواب دیا (اور دل میں کہا کہ یہ) لوگ (تو کچھ) اجنبی (سے معلوم ہوتے) ہیں، پھر جلدی سے اپنے گھر جا کر (ایک) موٹا تازہ بچھڑا (یعنی اس کا گوشت بھنوا کر مہمانوں کے لیے) لائے اور ان کے سامنے رکھا تو (انھوں نے تامل کیا، ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں (اس پر بھی انھوں نے کھانے سے انکار کیا تب) تو ابراہیم ان سے جی ہی جی میں ڈرے، انہوں نے (ان کی یہ حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ (کسی طرح کا) اندیشہ نہ کریں اور ان کو ایک ہوشیار فرزند کی خوشخبری بھی دی۔"

اس حکایت سے آدابِ مہمان داری کے متعلق حسب ذیل نتیجے نکالے جاسکتے ہیں:

① مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتدا باہمی سلام سے ہونا چاہیے۔

② مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہیے، کیوں کہ "روغان" کے معنی سرعت کے ہیں۔

③ روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں، اس لیے مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر ان کی نگاہ بچا کر کرنا چاہیے، کیوں کہ اگر مہمانوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ

ہمارے لیے کچھ سامان کیا جا رہا ہے، تو وہ از راہِ تکلف اس کو روکیں گے، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل وعیال سے یہ نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو، بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے۔

④ کسی بہانے سے تھوڑی دیر کے لیے مہمانوں سے الگ ہو جانا چاہیے، تا کہ ان کو آرام کرنے یا دوسرے ضروریات سے فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لیے ان سے الگ ہو گئے۔

⑤ مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہیے، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا۔

⑥ کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے، ان کو کھانے کا حکم نہیں دینا چاہیے، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہا کہ آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے؟ یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ کھایئے۔

⑦ مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہیے، کیوں کہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں، وہ کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، لیکن ان کی خواہش یہی ہوتی ہے، کہ مہمان نہ کھائے یا کم کھائے، تا کہ وہ کھانا ان کے اور ان کے اہل وعیال کے کام آئے، اسی لیے جب ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا اور ان کے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں۔

⑧ نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہیے، اسی لیے ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوفزدہ نہ ہونا چاہیے، کیوں کہ ہم لوگ کھا پی نہیں سکتے، بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولد کی بشارت دینے آئے ہیں۔

سورۂ حجر میں حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان فرشتوں کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام وآسائش کے ساتھ میزبان، مہمان کی عزت وآبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے، اس لیے کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے، کیوں کہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے، اسی لیے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوط علیہ السلام نے کہا:

﴿ قَالَ إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِىْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر: ۶۸۔ ۶۹)

"کہا یہ میرے مہمان ہیں تو (ان کے بارے میں) مجھ کو فضیحت نہ کرو اور اللہ سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔"

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے مکارم اخلاق میں مہمان نوازی کو بہ

تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمان کامل کا ایک جزو قرار دیا اور فرمایا کہ ''جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے اور جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کے ساتھ دے''۔ کہا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ''ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے، اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا۔'' 1 نیز فرمایا کہ ''جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے۔'' 2

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: ''کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو؟'' انھوں نے کہا: بے شک، فرمایا: ''ایسا نہ کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو، کیوں کہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے، تمہاری آنکھ کا حق ہے، تمہارے مہمانوں کا حق ہے اور تمہاری بی بی کا حق ہے۔'' 3 ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک شب کی مہمانی تو واجب ہے، پھر اگر مہمان کسی کے یہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض ہے، چاہے وہ لے لے، چاہے چھوڑ دے۔'' 4

چونکہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لیے بہر حال یک گونہ تکلیف کا باعث ہے اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے، وہاں مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوان کرم سے حد ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے، چنانچہ احادیث میں تصریح کر دی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے ہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہیے، کیوں کہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوگی اور اس پر بار پڑے گا۔ 5 اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہو جائے گی، جس کو خود غیور اور خوددار مہمان پسند نہ کرے گا۔

---

1 بخاری، کتاب الادب، باب من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الآخر فلا یؤذ جارہ: ٦٠١٨، ٦٠١٩۔

2 بخاری، کتاب الادب، باب اکرام الضیف و خدمته ایاہ بنفسه: ٦١٣٨۔

3 بخاری، کتاب الادب، باب حق الضیف: ٦١٣٤۔ 4 ابن ماجه، کتاب الادب، باب حق الضیف: ٣٧٧٧۔

5 بخاری، کتاب الادب، باب اکرام الضیف و خدمته ایاہ بنفسه: ٦١٣٥۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا، ایک ایک خون کا بدلہ کئی پشتوں تک جا کر لیتے تھے، اس طرح خاندانوں میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا اور اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔ آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے اور وہ دین کا رشتہ تھا، جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملا دیا، دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا اور خاندانی وقبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی ان کے اندر پیدا کر دی، جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا اور باہمی دشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلا دیا، کہ وہ حقیقت میں بھائی بھائی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۰۲۔۱۰۳)

”اے مسلمانو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ تم مرو لیکن مسلمان اور اللہ کی رسی سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے، تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، پھر تم بھائی بھائی ہو گئے۔“

مسلمانوں کے اس باہمی میل ملاپ اور محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی روئے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا تو ان دشمنوں کو باہم ملا کر ایک نہیں کر سکتا تھا:

﴿ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾ (۸/ الانفال: ۶۳)

”اور اللہ نے مسلمانوں کے دل ملا دیے، اگر تو زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر دیتا، تب بھی تو ان کے دلوں کو ملا نہ سکتا، لیکن اللہ نے ملا دیا، بے شک وہ (ہر مشکل پر) غالب آنے والا ہے اور مصلحت جاننے والا ہے۔“

تو اب مسلمانوں کو یہ چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کریں اور سب مل کر اللہ کے دین کی رسی کو جو ان کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے اور باہم مضبوط پکڑیں اور باہم اختلاف پیدا کر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں، کیوں کہ اس رسی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب مل کر اس کو پکڑے رہیں، فرمایا:

﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ﴾ (۸/ الانفال: ۴۶)

''اور اللہ اور رسول کا کہا مانو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، (کہ ایسا ہوگا تو) ہمت ہار دو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

یہی باہمی اتفاق و اتحاد ملتِ اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ، اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مسلمانوں میں باہم الفت و محبت ہو، اب اگر اتفاق سے ان میں اختلاف پیش آ جائے، تو اس کے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ دونوں اللہ و رسول کے حکم کی طرف رجوع کریں:

﴿ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ ﴾ (٤/ النسآء:٥٩)

''تو اگر تم (مسلمانوں) میں کسی بات میں جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔''

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو صلح پر مجبور کریں اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدل و انصاف سے ان میں صلح کرا دیں:

﴿ وَإِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ فَآءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ﴾

(٤٩/ الحجرات:٩۔١٠)

''اگر مسلمانوں کے دو گروہ لڑ پڑیں، تو ان میں صلح کرا دو، پھر اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے، تو ظلم کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع ہو، تو اگر وہ رجوع کر لے تو ان میں عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، اللہ منصفوں کو دوست رکھتا ہے، مومن تو آپس میں بھائی ہی ہیں، تو اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو۔''

آیت کے اخیر ٹکڑے نے بتایا کہ باہم مسلمانوں میں بھائی بھائی کا رشتہ ہے، یہ رشتہ جنگ و خونریزی کے بعد بھی نہیں کٹتا، انہی آیتوں کے تحت میں وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا)) [1]

''تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جا سکتی ہے، لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیونکر کی جائے؟ فرمایا: ''اس طرح کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے۔''

کیسا ہی بڑے سے بڑا کافر اور سخت سے سخت دشمن ہو، جس وقت اس نے کلمہ شہادت پڑھا اور شریعت اسلامی کو قبول کیا دفعتہً ہمارا مذہبی بھائی ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ ۗ ﴾ (٩/ التوبة:١١)

[1] صحيح بخاري، كتاب المظالم، باب أعن أخاك ظالما أو مظلوما: ٢٤٤٣۔

''تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کرلیں اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے مذہبی بھائی ہیں۔''

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے، تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہو گیا، اگر اس کے باپ کا نام و نسب نہیں معلوم تو کوئی حرج نہیں، وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی ہے، فرمایا:

﴿ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵)

''تو اگر تم ان کے باپوں کے نام نہ جانو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور علاقہ مند۔''

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے، تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کا بھائی قرار دے کر اس کے جذبہ رحم کی تحریک فرماتا ہے:

﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۸)

''تو اگر قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔''

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے، کیونکہ

﴿ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۲)

''کیا تم میں کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔''

یتیموں کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا، متولیوں کا فرض ہے اور اگر وہ ان کو اپنے اندر شامل کر کے نیک نیتی کے ساتھ ان کو اپنے کنبہ کا جزو بنالیں اور ملا جلا کر خرچ کریں، تو یہ بھی درست ہے، کیونکہ یہ ان کے بھائی ہیں، جن کی خیر خواہی ان کا فرض ہے، فرمایا:

﴿ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۰)

''اور اگر تم ان کو اپنے میں ملا لو تو یہ بھی جائز ہے، کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔''

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر کریں، وہ یوں کہتے ہیں:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ ﴾ (۵۹/ الحشر:۱۰)

''اے ہمارے پروردگار! ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے معاف کر۔''

ایک مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی برائی ہے، جس کے دور کرنے کے لیے اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگنی چاہیے اور کہنا چاہیے:

﴿ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (۵۹/ الحشر:۱۰)

''اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رہنے دے، اے ہمارے پروردگار! تو مہربان رحم والا ہے۔''

مسلمانوں کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم وشفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں، اللہ نے مدح فرمائی:

﴿ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٩)

''وہ (مسلمان) آپس میں رحم وشفقت رکھتے ہیں۔''

مسلمان کی یہ صفت ہونی چاہیے کہ وہ دوسرے مسلمان سے جھک کر ملے اور نرمی کا برتاؤ کرے۔

﴿ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴾ (٥/ المآئدة:٥٤)

''مسلمانوں سے جھکنے اور نرمی کرنے والے۔''

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت، محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبانِ فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے: ''مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو، تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔'' [1] صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا: ''سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں، کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔'' [2] مقصود یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک جسم ہے اور اس کے سارے افراد اس کے اعضاء ہیں۔ بدن کے ایک عضو میں اگر کوئی تکلیف ہو یا دکھ درد ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اور اس دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، یہی مسلمانوں کا حال ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے مسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہیے۔

ایک دوسری تمثیل میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار، کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔'' [3] بخاری میں ہے کہ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا، کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے، اس تمثیل میں آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ ''جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط ہو کر ناقابل تسخیر حصن و حصار بن جاتی ہے، اسی طرح جماعت

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم:٦٠١١ وصحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تراحم المؤمنین وتعاطفهم وتعاضدهم:٦٥٨٦۔ [2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، ایضا: ٦٥٨٩۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب تعاون المؤمنین بعضهم بعضا: ٦٠٢٦ وصحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، ایضا: ٦٥٨٥۔

اسلامیہ ایک قلعہ ہے، جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مسلمان ہے، یہ قلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے، جب تک اس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے، جب یہ اینٹ اپنی جگہ سے کھسک جائے گی، تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آ جائے گی۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ”ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کو بے مدد چھوڑے اور نہ اس کی تحقیر کرے...... انسان کے لیے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے، مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو۔“ ❶ یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، ابوداؤد میں ہے کہ فرمایا: ”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے تو وہ نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے، جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہے گا، تو اللہ اس کی ضرورت پوری کرے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا۔“ ❷

ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا: ”جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا۔ اور جو کسی تنگ دست پر آسانی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کرے گا اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پردہ رکھے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے، جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔“ ❸

فرمایا ”مسلمان وہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔“ ❹ یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے، دوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے اچھا مسلمان کون ہے؟ فرمایا: ”جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔“ ❺ یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتا، وہی سب سے بہتر مسلمان ہے۔

جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ جو ایک مشہور صحابی تھے، کہتے ہیں کہ ”میں نے رسول اللہ ﷺ سے تین باتوں پر بیعت کی، نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔“ ❻ کئی روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مسلمان کو گالی دینا اللہ کی نافرمانی (فسوق) ہے اور اس سے لڑنا (قتال) اللہ کا انکار (کفر) ہے۔“ ❼ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے، اب جو

---

❶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم ظلم المسلم و خذله......: ٦٥٤١۔ ❷ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب المؤاخاة: ٤٨٩٣۔ ❸ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی المعونة للمسلم: ٤٩٤٦۔
❹ صحیح بخاری، کتاب الایمان: ١٠۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب ای الاسلام افضل: ١١؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، بیان تفاضل الاسلام: ١٦١۔ ❻ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ: الدین النصیحة: ٥٧۔ ❼ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب خوف المؤمن ان یحبط عمله......: ٤٨ وکتاب الادب باب ما ینهی عن السباب واللعن: ٦٠٤٤۔

اس کے خلاف کرتا ہے وہ اللہ کے حکم کو نہیں مانتا اور یہ ایک معنی میں اللہ کا انکار ہی ہے، چنانچہ اسی لیے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے، جو کافروں کے لیے مخصوص ہے، فرمایا: ''کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے، الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے''۔

﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا۝ ﴾ (٤/ النسآء:٩٣)

''اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے گا، تو اس کا بدلہ دوزخ ہے، وہ اس میں پڑا رہے گا اور اللہ اس پر خفا ہوا اور لعنت کی اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا۔''

حجۃ الوداع کے نہایت اہم خطبہ میں آپ نے پہلے لوگوں کو چپ کرایا، پھر فرمایا: ''دیکھو میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔'' 1 ایک اور موقع پر فرمایا کہ ''جو ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں۔'' 2 جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے، فرمایا: ''سب سے بڑا ربا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے۔'' 3 اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو جس میں اس کی آبرو جانے کا ڈر ہو، تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے، ارشاد ہوا: ''جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑ دے گا، جس میں اس کی عزت پر حرف آتا ہو اور اس کی آبرو جاتی ہو، تو اللہ بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا تو اللہ بھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا۔'' 4

اگر دو مسلمانوں میں کسی ناراضی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے، تو آنحضرت ﷺ نے تین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ ''کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے، ملاقات ہو تو وہ ادھر منہ پھیر لے اور یہ ادھر منہ پھیر لے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے کہ جو پہلے سلام کی ابتدا کرے۔'' 5 ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''آپس میں کینہ نہ رکھو، حسد نہ کرو اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو، اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ اور کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے۔'' 6 ایک مسلمان کے لیے اس کی عزت و آبرو سے بڑھ کر معاملہ اس کے ایمان کا ہے، قرآن نے کہا کہ جب تم کو کوئی اپنے

---

1 صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الانصات للعلماء: ١٢١ وکتاب الدیات: ٦٨٦٧، ٦٨٦٩۔

2 صحیح بخاری، کتاب الدیات ایضا: ٦٨٧٤ وکتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ من حمل علینا......: ٧٠٧٠۔

3 سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی الغیبۃ: ٤٨٧٦۔ 4 ایضا، باب الرجل یذب عن عرض اخیہ: ٤٨٨٤۔

5 صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الھجرۃ: ٦٠٧٧ وسنن ابی داود کتاب الادب، باب فی ھجرۃ الرجل اخاہ: ٤٩١١۔ 6 صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماینھی عن التحاسد والتدابر: ٦٠٦٥۔

اظہارِ اسلام کے لیے سلام کرے تو اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں:

﴿ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰٓ إِلَيْكُمُ السَّلَـٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ﴾ (٤/ النسآء:٩٤)

''اس کو جو تمہاری طرف سلامتی کا کلمہ ڈالے، یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔''

مقصد یہ ہے کہ جو کوئی اپنے کو مسلمان کہے یا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے، کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہیں، ایک لڑائی میں ایک صحابی نے ایک کافر کو زد میں پاکر حملہ کیا، اس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا مگر اس پر بھی ان صحابی نے اس کو قتل ہی کر دیا، یہ خبر آنحضرت ﷺ تک پہنچی، آپ نے ان کو بلا کر دریافت کیا، انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، آپ ﷺ نے کس بلیغ انداز میں فرمایا، ''تم اسکے لا الہ الا اللہ کے ساتھ کیا کرو گے''۔ ایک روایت میں ہے کہ فرمایا: ''کیا تم نے اسکا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا؟'' ❶

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ ''مومن کو لعنت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا اس کے قتل کے برابر ہے۔'' ❷ یہ بھی فرمایا کہ ''جو کوئی اپنے بھائی کو اے کافر کہے، تو وہ کفر دو میں سے ایک پر لوٹے گا۔'' ❸ یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے۔ جان، ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے، ارشاد ہوا کہ ''جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے گا تو اللہ اس کے لیے دوزخ واجب اور جنت حرام کرے گا۔'' ایک شخص نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی؟ فرمایا: ''درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو۔'' ❹

فرمایا: ''ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں، سلام کا جواب دینا، اس کے چھینکنے پر اللہ تم پر رحمت کرے کہنا، اس کی دعوت کو قبول کرنا، بیمار ہو تو عیادت کرنا اور مر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ چلنا۔'' ❺ یعنی یہ کم سے کم حقوق ہیں، جن سے دو مسلمانوں کے درمیان خوش خلقی اور حسنِ تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ ''جب کوئی مسلمان اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے، تو وہ جب تک واپس نہ ہو جنت کی روش پر ہوتا ہے۔'' ❻ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو کوئی ایمان واخلاص کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے، یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھتا ہے اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے، تو اس کو ثواب کی دو (۲) رتی (قیراط) ملتی ہے، جن میں سے ہر رتی احد کے پہاڑ برابر ہوگی۔'' ❼ یعنی یہ رتی

---

❶ پہلی روایت صحیح بخاری، کتاب المغازی: ٤٢٦٩ اور کتاب الدیات: ٦٨٧٢ میں ہے، دوسری روایت کے لیے دیکھو فتح الباری کتاب الدیات شرح حدیث مذکور، ج ١٢، ص: ١٧٢۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما ینھی من السباب واللعن: ٦٠٤٧۔ ❸ ایضا، باب من اکفر اخاہ ......: ٦١٠٣؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حال ایمان من قال لاخیہ......: ٢١٥۔ ❹ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم......: ٣٥٣تا٣٥٧۔ ❺ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی العطاس: ٥٠٣٠۔ ❻ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فی فضل عیادۃ المریض: ٦٥٥١تا٦٥٥٤۔ ❼ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب اتباع الجنائز: ٤٧۔

دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہوگی، بلکہ یہ اس پیمانہ سے ہوگی، جس کا ایک ذرہ اپنی بڑائی میں پہاڑ کا حکم رکھتا ہے۔ یہ تمام حقوق جن کے جزئیات کا احاطہ نہیں ہوسکتا، اس برادرانہ الفت ومحبت کے فروغ ہیں، جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ''تم میں سے کوئی کامل مومن نہ ہوگا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔'' [1] الغرض ملّت اسلامیہ کی جماعت کا ہر رکن دوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے، اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے، ابوداؤد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس کے نقصان کو دور کرتا ہے اور اس کے پیچھے میں اس کی حفاظت کرتا ہے۔'' [2] دیکھئے کہ آنحضرت ﷺ نے جماعت اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی، اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیواریں ایسی شکستہ نہ رہیں، جیسی آج ہیں، ہر جماعت انہیں اصولوں پر دنیا میں بنی ہے اور آئندہ بھی بنے گی۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه:۱۳۔ [2] سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی النصیحة والحیاطة:٤٩١٨ تیسرے فقرہ کے مطلب میں شارحین کا اختلاف ہے۔

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے، تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے، اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے، کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے، اس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ اور باخبر کرے اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن پاک نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

﴿ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۳)

''اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔''

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا، انسانیت کا فرض ہے، جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے، اس لیے ارشاد ہوا:

﴿ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ (۵/ المآئدۃ:۸)

''اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف نہ کرو، عدل اور انصاف (ہر حال میں) کرو کہ یہ بات تقویٰ کے قریب ہے۔''

ہر قسم کا برا سلوک اور بے رحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے، اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لیے آمادہ رہتا ہے، یہ آیت مبارکہ انسان کے اسی مادہ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وكونوا عباد الله اخوانا)) [1]

''آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سب مل کر اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔''

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں:

((لا تناجشوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وكونوا عباد الله اخوانا)) [2]

''ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، نہ ایک دوسرے پر حسد کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔''

اس حدیث پاک میں انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے، جس پر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الھجرۃ: ۶۰۷۶۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب یایھا الذین امنوا اجتنبوا ..... ۶۰۶۶۔

فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعتہً جنت بن جائے، فرمایا:

((من لا یرحم لا یرحم)) ❶

''جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔''

جو بندوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر اللہ رحم نہیں کرتا، یا یہ کہ جو دوسرے پر رحم نہیں کرتا دوسرا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا، مستدرک حاکم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔'' ❷ یہ حدیث رحمۃ للعالمین کی تعلیم کی شانِ رحمت کو کتنی عمومیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا، اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملے گا۔'' ❸ اس فیض کے عموم میں انسانیت کی قید بھی نہیں ہے، ایک دفعہ آپ ﷺ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا، جس نے ایک جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا، کہ اس کو اس کے اس کام پر ثواب ملا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا جانوروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے؟ فرمایا: ''ہر تر جگر کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے۔'' یعنی ہر اس ہستی کے ساتھ جس میں زندگی کی تری ہے، نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے۔ ❹ اس ثواب کے دائرہ میں ہر وہ ہستی شریک ہے جو زندگی سے بہرہ ور ہے۔

جامع ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: ''جہاں بھی ہو اللہ کا خیال رکھو، برائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو مٹا دو گے اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ۔'' ❺ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے پانچ باتیں گنائیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ ((واحبَّ للناس ما تُحب لنفسك)) یعنی ''تم لوگوں (ناس) کے لیے وہی چاہو جو تم اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے۔'' ❻ الناس کا لفظ عام ہے جس میں تمام انسان داخل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ دل میں نہ ہو، انسان پورا مسلمان نہیں بنتا۔

کیونکہ دوسروں کے لیے وہی چاہنا جو اپنے لیے چاہا ہو اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے، ایک اور حدیث میں یہ تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ''تم اپنے بھائی کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو''۔ بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے اور ایک عام انسان بھی، تورات اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ ''تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو۔'' ❼ اسلام

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠١٣۔

❷ مستدرك حاكم، كتاب البر والصلة، ج٤، ص: ١٥٩۔ ❸ صحيح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠١٢۔ ❹ ايضا: ٦٠٠٩۔ ❺ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی معاشرة الناس: ١٩٨٧۔ ❻ جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب من اتقى المحارم فهو أعبد الناس: ٢٣٠٥۔

❼ عهد نامه جديد مرقس، ١٢، ص: ٣٠۔

میں پڑوسیوں کے حقوق کا بیان علیحدہ باب میں گزر چکا ہے۔ ❶ اس پر یہاں ایک نظر ڈال لینی چاہیے کہ صحابہ کرام نے اس تعلیم کی پیروی میں یہودی اور عیسائی پڑوسیوں کا حق بھی مسلمان پڑوسیوں ہی کی طرح مانا ہے۔

صدقہ وخیرات کے باب میں گو فقرا اور مساکین میں مسلمانوں کی ترجیح ایک قدرتی باب ہے، تاہم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں نامسلمان ذمی مسکینوں کے حق کو بھی تسلیم کیا، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ایک بڈھا جو اندھا بھی تھا، ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی، اس نے کہا، جزیہ ادا کرنے اور اپنی ضرورت پوری کرنے اور اپنی عمر کے سبب سے بھیک مانگتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے اور اپنے گھر سے اس کو کچھ دیا، پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ اس کو اور اس جیسے لوگوں کو دیکھو، اللہ کی قسم! ہم انصاف نہیں کریں گے، اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور اس کے بوڑھے ہونے پر اس کی مدد چھوڑ دیں، قرآن میں صدقہ کی اجازت فقرا اور مساکین کے لیے ہے، فقرا تو وہی ہیں جو مسلمان ہیں اور یہ لوگ مساکینِ اہل کتاب میں ہیں، ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔ ❷

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دیئے جا سکتے ہیں، آنحضرت نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا، ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا، امام مجاہد نے مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کرنے کو ثواب کا کام بتایا، ابن جریج محدث کہتے ہیں کہ قرآن نے ❸ ''اسیر'' کے کھلانے کو ثواب بتایا ہے اور ظاہر ہے کہ صحابہ کے قبضہ میں مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے، ابو میسرہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ اور عمرو بن شرحبیل رضی اللہ عنہ صدقہ فطر سے عیسائی راہبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ❹ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا، ❺ اور خود حضور نے بعضوں کو ان کے مشرک والدین کے ساتھ صلہ رحمی کی اجازت دی۔ ❻ تفسیر کی روایتوں میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جب مذہبی اختلاف کی بنا پر غریب مشرکوں کی مدد سے کنارہ کرنے لگے تو یہ آیت اتری: ❼

﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۲)

---

❶ دیکھیے جلد ہذا۔ ❷ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف بهامشه الجامع الصغير للامام محمد، ص: ۷۲، مصر۔ ❸ ۷۶/ الدهر:۸۔ ❹ كتاب الاموال امام ابو عبيدة، ص: ۶۱۳، ۶۱۴۔

❺ صحيح بخارى، كتاب الجمعة، باب يلبس احسن ما يجد:۸۸۶۔ ❻ صحيح مسلم، كتاب الزكوة، باب فضل النفقة والصدقة على الاقربين:۲۳۲۵۔ ❼ تفسير طبرى، ج ۳، ص:۵۸۔

''ان کو راہ پر لے آنا تیرے اختیار کی بات نہیں، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے، راہ پر لے آتا ہے اور جو بھلائی سے خرچ کرو وہ تمہارے ہی لیے ہے۔''

یعنی تم کو تمہاری نیکی کا ثواب بہرحال ملے گا۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

((لا یؤمن احدکم حتی یحب للناس ما یحب لنفسه وحتی یحب المرء لا یحبه الا لله عزوجل)) [1]

''تم میں سے کوئی اس وقت پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ آدمی کو صرف اللہ کے لیے پیار نہ کرے۔''

اس حدیث میں محبتِ انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کر دی گئی ہے۔

[1] مسند امام احمد، ج۳، ص:۲۷۲۔

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف ومحبت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا، اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے، اس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی، اہل عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے، وہ جانوروں کو اندھادھند مار کر گرا دیتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم ان کو کھاؤ اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے، دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا، جو رک جاتا وہ ہار جاتا، یہ سب جانور دوست واحباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے، یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی، ان واقعات کا ذکر اشعار عرب میں موجود ہے، ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مر جاتا، تو اس کی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھتے تھے اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مر جاتا ایسے جانور کو بلیہ کہتے تھے، اسلام آیا تو اس نے اس سنگ دلی کو مٹا دیا، عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا اور عام حکم دیا کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے، 1 ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مرغی کو کھول دیا اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لے کر اس کے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جاندار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے، اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا گزر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے، جو لوگ ایسا کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان کو ملعون قرار دیا ہے، 2 اس سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکی کاٹ کر کھاتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں آ کر یہ حالت دیکھی تو فرمایا: ''اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے وہ مردار ہے۔'' 3 یہ ایک خاص صورت تھی، لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی ان کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی۔ 4 بلاضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا۔ 5 ایک حدیث میں ہے کہ ''کسی نے اگر کنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا تو اللہ اس کے متعلق اس سے باز

---

1 ترمذی، ابواب الصید، باب ماجاء فی کراهیة اکل المصبورة:۱٤۷۳۔

2 بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب مایکره من المثلة والمصبورة والمجثمة:٥٥١٤، ٥٥١٥۔

3 ترمذی، ابواب الصید باب ماجاء ماقطع من الحی فهو میت:١٤٨٠۔

4 بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب مایکره من المثلة والمصبورة والمجثمة:٥٥١٥۔

5 مستدرك حاکم، کتاب النکاح، ج٢، ص: ١٨٢۔

پرس کرے گا۔" صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا: "یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے، یہ نہیں کہ اس کا سر کاٹ کے پھینک دے۔" ❶ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا اور وہ درندہ بھی نہیں ان کا مارنا جائز نہیں، سنن نسائی میں ہے کہ "جو شخص کنجشک کو بلاضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن اللہ کے یہاں فریاد کرے گی کہ فلاں نے مجھ کو بلاضرورت مارا ہے، اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔" ❷ جو جانور کوئی نقصان نہیں پہنچاتے یا ان سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے، ان کا مارنا بھی جائز نہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ ❸

جو جانور ضرورۃً مارے یا ذبح کیے جاتے ہیں، ان کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے، اس لیے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقے سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو، تم میں ہر شخص اپنی چھری کو تیز کر لے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے۔" ❹ ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ یارسول اللہ! میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر رحم آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں، فرمایا: "اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو اللہ تم پر رحم کرے گا۔" ❺ یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر جانوروں کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی۔ ❻ کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے، کنکر پتھر یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا نہ دشمن شکست کھا سکتا ہے، البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے۔ ❼ مطلب یہ کہ بلاضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں، جانوروں کے ساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں، ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اہل عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے، اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔ چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپ ﷺ نے فرمایا: "اس پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور اس کو کھانا پانی کچھ نہ دیا اور آخر وہ اسی طرح بندھی بندھی مرگئی۔" ❽ بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں، اس لیے وہ اس معاملے میں بہت زیادہ گناہگار ہیں،

---

❶ نسائی، کتاب الضحایا، باب من قتل عصفورا...: ٤٤٥٠؛ دارمی: ١٩٧٨؛ احمد، ٢/ ١٦٦۔

❷ نسائی، کتاب الضحایا، من قتل عصفورًا: ٤٤٥١۔

❸ ابوداود، کتاب الادب، باب فی قتل الذر: ٥٢٦٧؛ ابن ماجہ: ٣٢٢٤۔

❹ مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب الامر باحسان الذبح والقتل: ٥٠٥٥۔

❺ مسند احمد، ج٣، ص: ٤٣٦۔ ❻ نسائی، کتاب الضحایا، باب النهی عن الذبح فی الظفر: ٤٤٠٨ وباب فی الذبح بالسن: ٤٤٠٩؛ بخاری، کتاب الذبائح والصید، باب الخذف والبندقة: ٥٤٧٩۔

❼ بخاری، ایضًا: ٥٤٧٩، ٤٨٤١۔ ❽ بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب: ٣٣١٨۔

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ جانوروں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو، اگر اللہ ان کو معاف کر دے تو سمجھو کہ اس نے تمہارے بہ کثرت گناہ معاف کر دیئے۔'' ❶ ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے، آپ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے، جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولھا ایسی جگہ جلایا ہے، جہاں زمین میں یا درخت پر چیونٹیوں کا سوراخ تھا، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ ''یہ کس نے کیا ہے؟'' ان صاحب نے کہا، یا رسول اللہ! یہ میں نے کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''بجھاؤ بجھاؤ۔'' ❷ (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو، یا جل نہ جائیں)

ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا، انھوں نے پہلے اپنا سامان اس جگہ سے ہٹایا، پھر تمام چیونٹیوں کو آگ سے جلا دیا، اس پر اللہ نے ان کو وحی کے ذریعہ سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں جلایا، ❸ یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی، جس نے کاٹا تھا، تمام چیونٹیوں کا قصور نہ تھا، ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے، چڑیا فرط محبت سے ان کے گرد منڈلانے لگی، رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کے لیے گئے ہوئے تھے، واپس آ کر یہ حالت دیکھی تو فرمایا: ''اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اس کو بے قرار کیا ہے، اس کے بچوں کو چھوڑ دو۔'' صحابہ کرام نے چیونٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا، دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا تو فرمایا: ''آگ کی سزا دینا صرف اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے۔'' ❹

اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے، بعینہٖ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجب ثواب ہے، اسی عدم واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کے لیے پانی کے جو حوض بنائے ہیں ان پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آ جاتے ہیں، اگر میں ان کو پانی پلا دوں تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا: ''ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کے ساتھ حسن سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔'' ❺

ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک شخص راستہ میں جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ گئی، اتفاق سے اس کو ایک کنواں مل گیا اور اس نے کنوئیں میں اتر کر پانی پی لیا، کنوئیں سے نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے اور کیچڑ چاٹ رہا ہے، اس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کر کے اس پر ترس کھایا اور کنوئیں میں اتر کر پانی لایا اور اس کو پلایا، اللہ کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا اور اللہ نے اس کو بخش دیا۔'' صحابہ کرام نے اس واقعہ کو سنا تو بولے کہ یا رسول اللہ! کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے؟ فرمایا: ''ہر

❶ مسند احمد، ۲/ ٤٤١، ٤٤٢۔ ❷ مسند ابن حنبل، ج ۱، ص: ۳۹٦ عن عبداللہ بن مسعود۔
❸ بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب۔ ❹ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی کراھیة حرق العدو بالنار: ۲٦۷۵۔ ❺ ابن ماجه، ابواب الادب، باب فضل صدقة الماء: ۳٦۸٦۔

ذی حیات کے ساتھ حسن سلوک کرنا موجب ثواب ہے۔'' 1 صرف جانداروں ہی تک نہیں بلکہ نباتات تک کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا موجب بتایا اور فرمایا کہ ''جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے، یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس کو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ یعنی ثواب کا کام ہے۔'' 2 اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے، یعنی:

① جو جانور جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اس سے وہی کام لینا چاہیے، چنانچہ فرمایا: ''ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا، بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہوں، صرف کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔'' 3 نیز فرمایا کہ ''اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ، اللہ نے ان کو تمہارا فرماں بردار صرف اس لیے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے تمہارے لیے اللہ نے زمین کو پیدا کیا ہے، اپنی ضرورتیں اسی پر پوری کرو۔'' 4 اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے، اس لیے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکالیف ہوتی ہے، صرف سفر کی حالت میں اس پر سوار ہونا چاہیے۔

② جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے، چنانچہ فرمایا کہ ''جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانے میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ اور جب قحط کے زمانے میں سفر کرو تو ان کو تیزی کے ساتھ چلاؤ۔'' 5 تاکہ قحط کی وجہ سے ان کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے، اس سے وہ جلد نجات پائے، ایک بار آپ ﷺ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا، فرمایا: ''ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، ان پر سوار ہو تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو اور ان کو کھاؤ تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ۔'' 6

ایک بار آپ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لیے گئے، اس میں ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر بلبلایا اور آب دیدہ ہو گیا، آپ اس کے پاس گئے اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: ''یہ کس کا اونٹ ہے؟'' ایک انصاری نوجوان نے آ کر کہا کہ میرا یا رسول اللہ! فرمایا: ''اس جانور کے بارے میں جس کا اللہ نے تم کو مالک بنایا ہے، اللہ سے نہیں ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو۔'' 7

---

1 بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠٠٩۔

2 بخاری، کتاب الحرث والمزارعة، باب فضل الزرع والغرس اذا كل منه: ٢٣٢٠۔

3 بخاری، کتاب الحرث والمزارعة، باب استعمال البقر للحراثة: ٢٣٢٤۔

4 ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الوقوف علی الدابة: ٢٥٦٧۔

5 مسلم، کتاب الامارة، باب مراعاة مصلحة الدواب فی السیر والنهی عن التعریس فی الطریق: ٤٩٥٩، ٤٩٦٠۔

6 ابو داود، کتاب الجهاد، باب ما یؤمر به من القیام علی الدواب والبهائم: ٢٥٤٨۔ 7 ایضًا: ٢٥٤٩۔

③ جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔ ❶

④ جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا، ❷ کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں۔

پچھلے صفحوں پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے، تا کہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا نرم ہے اور کس طرح رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے۔

❶ ابوداود، كتاب الجهاد، باب النهى عن الوسم فى الوجه والضرب فى الوجه: ٢٥٦٤۔

❷ ابو داود، كتاب الجهاد، باب فى التحريش بين البهائم: ٢٥٦٢۔

فضائلِ اخلاق

اخلاق حسنہ کے جزئیات اس کثرت سے ہیں، کہ ان کا احاطہ بھی مشکل ہے، قدیم حکمائے اخلاق نے ان کی دو قسمیں کی ہیں، ایک امہات اخلاق اور دوسری فروع اخلاق، امہات اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہیں، جو دوسرے اخلاق کی اصل و مرجع ہیں اور جن میں کمی بیشی سے اخلاق کی مختلف قسمیں پیدا ہوتی ہیں اور جن کے اعتدال سے فضائل اخلاق کا وجود ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتیں ہیں، قوت علمیہ، قوت شہوانیہ، قوت غضبیہ، قوت علمیہ کے اعتدال کا نام حکمت، قوت شہوانیہ کے اعتدال کا عفت اور قوت غضبیہ کے اعتدال کا شجاعت ہے اور انہی کے عدم اعتدال کو رذائل کہتے ہیں، پھر ان دونوں قسموں کے اختلاف مدارج سے اچھے اور برے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور میں آتے ہیں۔ یہ تقسیم محض فلسفیانہ ہیں، یا یوں کہیے کہ علمی اور نظری ہیں، لیکن اسلام کے پیشِ نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہیں، بلکہ عملی ہے، کیونکہ اس کا منشا انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہیں، بلکہ انسان کو فضائلِ اخلاق کا عامل بنانا اور رذائلِ اخلاق سے عملاً بچانا ہے، اس لیے اس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں، بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا اور برے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لیے اپنی تعلیم میں اس نے اہلِ فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے اور نہ یہ طریقہ انبیا علیہم السلام کی تعلیم اور تربیت کا ہے۔

اسلام کی ہر شے میں خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے، مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور وہ برا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے، گو یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اس میں عقلی خوبیاں اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اس میں عقلی برائیاں اور خلق اللہ کا نقصان بھی ہوتا ہے، اس بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمیں ہیں، وہ اخلاق جن کو اللہ پسند فرماتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے، رذائل ہیں، ہم نے اوپر ''اخلاق اور محبتِ الٰہی'' کے عنوان میں وہ آیتیں لکھ دی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔

جن اوصاف کو اللہ پسند فرماتا ہے ان کو ابھی ہم نے اصطلاح میں فضائل کا نام دیا ہے، یہ فضائل بہت سے ہیں اور قرآن پاک اور احادیثِ شریفہ میں جا بجا ان کی تصریح ہے، لیکن ان کے بیان میں اخلاق شرعی کے مصنفوں نے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی ہے، اسی لیے ان کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہیں مقرر ہوئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ فضائل میں سب سے پہلے اس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہیے، جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسولوں اور پیغمبروں کی توصیف اکثر کی گئی ہو اور مسلمانوں کو اس سے متصف ہونے پر کتاب

الٰہی اور پیام نبوی میں زیادہ زور دیا گیا ہو اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہو۔

گو اس معیار کو سامنے رکھ کر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے اور غور وفکر کرنے والوں میں اس بارہ میں اختلاف بھی ممکن ہے، لیکن جہاں تک میری تلاش اور محنت کو دخل ہے، اس میں کامیابی کی کوشش کروں گا۔

فضائل کی مختصر فہرست

جن فضیلتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جن کو گنا کر اس نے اپنے اچھے بندوں کی توصیف کی ہے، یا ان اوصاف والوں کے لیے اپنی بخشش اور بخشائش کا وعدہ فرمایا ہے، قرآن پاک اور احادیث نبوی ﷺ میں جابجا ان کی تفصیل ہے، جیسے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۱۔۱۱)

''ایمان والے مراد کو پہنچ گئے، جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو بے کار باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں سے اور اپنی (شرعی) باندیوں سے، کہ ان پر کوئی الزام نہیں، تو جو اس کے سوا کے خواہاں ہوں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں اور وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں، یہی اصلی وارث ہیں، جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

ان آیتوں میں جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہیں، نکمی اور بیکار باتوں سے کنارہ کشی، عصمت اور پاک دامنی، امانت داری اور ایفائے عہد، ایک دوسری جگہ ہے:

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

’’اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الٰہی) پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت کے ساتھ رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور غریبوں کو اور مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کو چھڑانے میں دیا اور نماز کھڑی کی اور زکوٰۃ دی اور اپنے قول کو جب انھوں نے اقرار کر لیا پورا کرنے والے اور مصیبت میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے ہل چل کے وقت ثابت قدم رہنے والے۔‘‘

ان آیتوں میں جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہیں وہ یہ ہیں، سخاوت، قول وقرار کو پورا کرنا اور مشکلوں میں ثابت قدمی۔ سورۂ آل عمران میں ہے:

﴿ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۷)

’’ثابت قدم رہنے والے اور سچ بولنے والے اور (اللہ کی) فرماں برداری کرنے والے اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے۔‘‘

اس آیت میں ثابت قدمی، سچائی اور فیاضی کو سراہا گیا ہے، اسی سورہ میں ان متقیوں کا حال ہے جو اللہ کی مغفرت اور آسمان وزمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہوں گے۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۳٤)

’’جو خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں (اللہ کے نام) خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو روکتے اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔‘‘

اس اوپر کی آیت میں فیاضی، عفو ودرگزر اور احسان کی تعریف کی گئی ہے، سورۂ معارج میں ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۙ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۙ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۚ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓي اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاۗءَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَاۗىِٕمُوْنَ ۙ ﴾ (۷۰/ المعارج:۲٤۔۳۳)

’’اور جن کے مال میں مانگنے والے اور مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے اور جو روز جزا کو سچ مانتے ہیں اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ ان کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں اور شرعی باندیوں سے کہ اس میں ان پر کوئی ملامت نہیں۔ جو اس کے علاوہ چاہیں وہ حد سے آگے بڑھنے والے ہیں اور

جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔"

ان آیتوں میں سخاوتِ نفس، عفت و عصمت، امانت داری، ایفائے عہد اور سچی گواہی کو ایک مومن کی ان فضیلتوں میں شمار کیا ہے، جو اس کے جنت میں جانے کی سبب ہوئی ہیں۔

سورۂ احزاب میں ان مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے، جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشائش اور بڑی مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے:

﴿ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳۵)

"اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے والیاں، صبر کرنے والے اور صبر کرنے والیاں اور عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں اور صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والیاں۔"

ان میں سچائی، صبر، عاجزی اور عصمت و عفت کے اوصاف کا ذکر ہے۔

سورۂ فرقان میں اللہ کے اچھے بندوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے:

(۱) ﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۶۳)

"اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں، جو زمین میں ہولے چلتے ہیں اور جاہل جب ان سے (جہالت کی) باتیں کریں تو وہ کہیں سلامت رہیے۔" [1]

(۲) ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۶۷)

"اور جب وہ خرچ کریں تو نہ تو فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں اور دونوں کے بیچ کی راہ ہو۔"

﴿ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۸)

"اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان نہیں لیتے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔"

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۷۲)

---

[1] یا سلام کہیں۔

''اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ بے ہودہ مشغلہ کے پاس سے گزریں تو شریفانہ وضع سے گزر جائیں۔''

پہلی آیت میں عاجزی اور فروتنی اور بردباری، دوسری آیت میں اعتدال اور میانہ روی اور تیسری میں عدم ظلم اور عفت اور چوتھی میں سچائی اور متانت وسنجیدگی کی تعریف کی گئی ہے، سورۂ رعد میں وہ صفتیں بتائی گئی ہیں جو عقبیٰ میں کام آئیں گی:

﴿ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ ﴾ (۱۳/ الرعد: ۲۲)

''جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور قول کو توڑتے نہیں اور جس کے جوڑنے کو اللہ نے کہا ہے اس کو جوڑے رکھتے ہیں اور اپنے مالک سے ڈرتے ہیں اور بری طرح حساب ہونے سے سہمے رہتے ہیں اور جنھوں نے اپنے مالک کی خوشی کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو ان کو دیا اس سے چھپے اور کھلے (اچھے کاموں میں) خرچ کیا اور برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں، انہی کے لیے پچھلا گھر ہے۔''

اس ایفائے عہد سے وہ عہد بھی مراد ہو سکتا ہے جو بندہ اپنے اللہ سے کرتا ہے اور اس سے وہ عہد بھی سمجھا جا سکتا ہے جو اللہ کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے اور جس کے جوڑنے کا حکم ملا ہے، وہ اہل قرابت اور حق داروں کے حقوق ہیں، ان دو کے سوا ان آیتوں میں ان کی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگوں سے بھلائی کرتے ہیں، یا یہ کہ بھلائی کر کے برائی کو دھو دیتے ہیں:

﴿ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (۲۸/ القصص: ۸۳)

''اس پچھلے گھر کو ہم ان کے لیے کریں گے جو زمین میں غرور اور فساد کرنا نہیں چاہتے اور آخر انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔''

یعنی غرور ونخوت نہیں کرتے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ ﴾

(۴۲/ الشوریٰ: ۳۷)

''اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو

معاف کردیتے ہیں۔''

یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہیں ہوتے اور معاف کردیتے ہیں۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۲)

''بیشک اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔''

عدل وانصاف کی فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا چاہیے کہ وہ اللہ کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۵)

''بیشک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

اس پیار اور محبت کے استحقاق میں ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے۔

حدیثوں میں جن اخلاقی فضیلتوں کا بیان ہے وہ متفرق طور سے پچھلے صفحوں میں گزر چکی ہے اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی۔

صدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیوں کے سرفہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال میں سچائی ہے۔ اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجہ کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتیں آ جاتی ہیں۔

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کا دل اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں۔ اسی کا نام صدق یا سچائی ہے، جو سچا نہیں اس کا دل ہر برائی کا گھر ہو سکتا ہے اور جو سچا ہے اس کے لیے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے، کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، یا رسول اللہ! مجھ میں چار بری خصلتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بدکار ہوں، دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں، تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں، چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں، ان میں سے جس ایک کو فرمایئے آپ کی خاطر سے چھوڑ دوں، ارشاد یہ ہوا کہ ''جھوٹ نہ بولا کرو۔'' چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا اور پھر بدکاری کے لیے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گزرا کہ صبح کو جب آنحضرت ﷺ پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی؟ تو کیا جواب دوں گا اگر ہاں کہوں گا تو شراب اور زنا کی سزا دی جائے گی۔ اگر نہیں کی تو عہد کے خلاف ہوگا۔ یہ سوچ کر ان دونوں سے باز رہا، جب رات زیادہ گزری اور اندھیرا خوب چھا گیا تو چوری کے لیے گھر سے نکلنا چاہا تو پھر اسی خیال نے اس کا دامن تھام لیا کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہوں گا۔ ہاں کروں گا تو ہاتھ کٹیں گے اور نہیں کرتا تو بدعہدی ہوتی ہے، اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا۔ صبح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوا اور عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بری خصلتیں مجھ سے چھوٹ گئیں، یہ سن کر آنحضرت ﷺ مسرور ہوئے۔ [1]

یہ روایت سند کی رو سے کتنی ہی کمزور ہو، مگر نتیجہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے، سچائی کی عادت انسان کو بہت سی برائیوں سے بچاتی ہے، جو سچا ہوگا وہ ہر برائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا وہ راستباز ہو گا، راست گو ہوگا، ایماندار ہوگا، وعدہ کو پورا کرے گا، عہد کو وفا کرے گا، دلیر ہوگا، دل کا صاف ہوگا، ریاکار نہ ہوگا، اس کے دل میں نفاق نہ ہوگا پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اس کی شان نہ ہوگی، خوشامدی نہ ہوگا، سب کے بھروسہ کے قابل ہوگا، لوگوں کو اس کے قول و فعل پر اعتبار ہوگا، جو کہے گا، کرے گا غرض جس پہلو سے دیکھئے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی اصلی بنیاد قرار پائے گی۔ صدق صفاتِ ربانی میں سے بھی سب سے بڑی صفت ہے، اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہوسکتا ہے، قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں اللہ آپ فرماتا ہے:

[1] اس قصہ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورۂ ن میں کتبِ سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا ماخذ نہیں معلوم ہوا۔ (تفسیر فتح العزیز، پارہ: ۲۹، ص: ۳۳)۔

﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴾ (٤/ النساء:٨٧)

''اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے بات میں۔''

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴾ (٤/ النسآء:١٢٢)

''وعدہ کیا اللہ نے سچ اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچا بات میں۔''

اللہ سچا ہے اس لیے اسی کی ساری شریعت سچی ہے فرمایا:

﴿ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴾ (٦/ الانعام:١٤٦)

''اور ہم ہیں سچے۔''

﴿ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۣ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ ﴾ (٣/ آل عمران:٩٥)

''کہہ (اے پیغمبر) اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو۔''

﴿ وَالَّذِيْ جَاۗءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (٣٩/ الزمر:٣٣)

''اور جو سچائی کو لے کر آیا اور اس سچائی کو سچ مانا وہی تو پرہیزگار ہیں۔''

اس آخری آیت میں ''سچائی'' سے مراد اللہ کی شریعت یا کتاب ہے۔ مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ پرہیزگاروں کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ ہوتے ہیں، ہر سچی بات کو قبول کرتے ہیں اور اپنے ہر قول اور عمل میں سچائی کو پیش کرتے ہیں۔

اہل ایمان کا یہ حال ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسولوں کے وعدوں کو سچا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں:

﴿ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٢٢)

''اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا۔''

چونکہ رسول، اللہ سے علم پاتے ہیں، اس لیے وہ بھی سچے ہوتے ہیں:

﴿ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ (٣٦/ یٰسٓ:٥٢)

''اور پیغمبروں نے سچ کہا۔''

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبروں کا سب سے پہلا وصف ہے، کیوں کہ ان کی ساری باتیں دعوے، دلیلیں اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہوں تو ان کی پیمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے، اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبروں کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے، سب سے پہلے تو خود ملت حنیف کے داعی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس سے متصف فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ڛ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴾ (١٩/ مریم:٤١)

''اور کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔''

ایک اور پیغمبر حضرت ادریس علیہ السلام کو بھی اللہ نے اس سے نامزد کیا ہے:

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴾ (۱۹/ مریم:۵٦)

''اور کتاب میں ادریس علیہ السلام کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔''

حضرت مریم علیہا السلام جنہوں نے اللہ کی باتوں کے سچ ماننے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ اس وصف سے ممتاز ہوئیں۔ فرمایا گیا:

﴿ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۷۵)

''اور ان (عیسیٰ علیہ السلام) کی ماں بڑی سچی تھیں۔''

حضرت یوسف علیہ السلام جو خواب کی تعبیر میں ایسے سچے نکلے، بندوں کی زبان سے صدیق کہلائے:

﴿ يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ ﴾ (۱۲/ یوسف:٤٦)

''یوسف! اے بڑے سچے!''

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے باپ سے صبر و شکر کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا، تو اللہ سے صادق الوعد (وعدہ کا سچا) خطاب پایا:

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴾

(۱۹/ مریم:٥٤)

''اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کر، بے شبہ وہ وعدہ کا سچا اور بھیجا ہوا نبی تھا۔''

اللہ کی خوشنودی والی جنت جن لوگوں کو ملے گی ان میں وہ بھی ہوں گے، جو دنیا میں دوسری صفتوں کے ساتھ سچائی اور راستبازی سے ممتاز تھے:

﴿ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۷)

''صبر کرنے والے اور سچے۔''

اللہ نے جن لوگوں کے لیے اپنی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کیے ہیں، ان میں اسلام و ایمان اور اللہ کی فرمانبرداری کے بعد پہلا درجہ سچوں اور راستبازوں کا ہے۔ فرمایا:

﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳۵)

''بے شک اسلام قبول کرنے والے مرد اور عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور عورتیں اور فرمانبردار مرد اور عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں۔''

﴿ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِيمًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۳۵)

''اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑی مزدوری رکھی ہے۔''

اس سچائی کے کاروبار کا صلہ دوسری زندگی میں ملے گا اور وہ وہاں ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی، قیامت کی نسبت ہے:

﴿ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۱۱۹)

''یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو ان کا سچ کام آئے گا۔''

اس امتحان میں جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا، اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا فرمائے گا، چنانچہ فرمایا:

﴿ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۲۴)

''تاکہ اللہ سچے اترنے والوں کو ان کی سچائی کا عوض دے۔''

اسلام میں سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم پر حکم دیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو، سچوں ہی کی جماعت سے علاقہ و رابطہ رکھو اور انہیں کی صحبت میں رہو کہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے بنو۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے دو ساتھیوں نے جو تبوک کے سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ جا سکے تھے، ہر قسم کی تکلیفیں سہہ کر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا، اس کی طرف اشارہ کر کے اللہ فرماتا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۱۱۹)

''اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔''

اہل تفسیر کے نزدیک یہاں ان سچوں سے مراد آنحضرت ﷺ اور وہ بڑے بڑے صحابی ہیں، جن کی سچائی کا بارہا امتحان ہو چکا تھا۔ مگر بہر حال آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے بعد بھی یہ آیتِ کریمہ اپنی لفظی وسعت کے سبب سے ہر دور کے مسلمانوں کو سچوں کی معیت اور صحبت کی دعوت دیتی ہے۔ سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں، مگر اسلام کی نگاہ میں اس کے بڑے وسیع معنی ہیں، جن کے لحاظ سے اس کے اندر اکیلے قول ہی نہیں، بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں اور قرآن و حدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں۔ بات میں سچائی، ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی اور دینداری کے مقامات اور مراتب میں سچائی، لیکن ذرا معنی میں وسعت دیجیے تو اس کی تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آجاتی ہیں، یعنی زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی۔

زبان کی سچائی

سچی زبان سے جو بولا جائے، وہ سچ بولا جائے اور منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے، جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے، وعدہ کو پورا کرنا اور عہد اور قول و قرار کو نباہنا بھی اسی قسم میں داخل ہے اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے، اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنی ہے، سورۂ احزاب میں ایک آیت ہے:

﴿ لِّيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِن شَاءَ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۲٤)

''تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے۔''

اس آیت پاک میں صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے بیان کے مختلف پیرایوں میں ظاہر فرمایا ہے، صفوان بن سلیم تابعی سے مرسلاً روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا مسلمان نامرد بھی ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ''ہوسکتا ہے۔'' پھر پوچھا، کیا بخیل بھی ہوسکتا ہے؟ جواب دیا: ''ہوسکتا ہے۔'' پھر دریافت کیا، کیا جھوٹا بھی ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ''نہیں۔'' ❶ کئی صحابی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''مومن ہر خصلت پر پیدا ہوسکتا ہے، لیکن خیانت کاری اور جھوٹ پر'' (نہیں) ❷ مطلب یہ ہے کہ مومن میں ہر برائی ہوسکتی ہے، مگر خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہیں ہوسکتی ہے کہ یہ ایمان کے جوہر کے سراسر خلاف ہے، اسی لیے ارشاد ہوا: ''کسی بندہ کا ایمان پورا نہیں ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے، یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی اگر چہ وہ حق ہی پر کیوں نہ ہو۔'' ❸ ان روایتوں کی معنوی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے، جو صحاح کی اکثر کتابوں میں ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس میں چار باتیں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک بات ہو، تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، جب تک وہ اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے جھوٹ بولے، جب کوئی قرار کرے تو پورا نہ کرے، جب جھگڑے تو حق کے خلاف کہے۔'' ❹ یہی روایت اس طرح بھی ہے کہ ''منافق کی علامتیں تین ہیں۔ جب کہے تو جھوٹ

❶ موطا امام مالک، کتاب الکلام، باب ماجاء في الصدق والكذب: ١٨٦٢۔ ❷ عن ابی امامة عند مسند أحمد، ج ٥، ص: ٢٥٢ وعن سعد بن ابی وقاص عندالبزار: ١٠٢ وابی یعلی: ٧١١ والطبرانی فی الکبیر والبیهقی فی السنن، ١٠/ ١٩٧ وفی الشعب: ٤٨٠٩ وعن ابن عمر عند البیهقی فی الشعب: ٤٨١١ وقد روی مرفوعًا وموقوفًا۔ ❸ مسند احمد عن ابی هریرة، ج ٢، ص: ٣٥٢ وطبرانی، نیز مسند ابی یعلی عن عمر بن الخطاب، یہ حدیثیں حافظ منذری کی ترغیب وترهیب جلد دوم باب الترغیب فی الصدق، ص: ١٩٢، ١٩٣ سے لی گئی ہیں۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ٣٤ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ٢١٠ وابو داود، کتاب السنة، باب الدلیل علی الزیادة الایمان: ٤٦٨٨ وترمذی، ابواب الایمان، باب ما جاء فی علامة المنافق: ٢٦٣٢ ونسائی، کتاب الایمان، باب علامة المنافق: ٥٠٢٣۔

بولے، جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو بے ایمانی کرے۔'' ❶ صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے: ''اگر چہ وہ نمازی اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتا ہو۔'' ❷

ان روایتوں سے یہ پوری طرح معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے، یعنی صدق کی راہ سے ایمان اور نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے اور جھوٹ کی راہ سے نفاق اور برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا جاتا ہے اور سچ بولتے بولتے وہ صدیق ہو جاتا ہے اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے اور بدکاری دوزخ کو لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔'' ❸

دل کی سچائی

صدق کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے اور اس حیثیت سے صدق اور اخلاص دونوں ایک ہی چیز بن جاتے ہیں اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لیے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی تہ سے نہیں نکلا، منافق رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آ کر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے اور آپ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی، لیکن چونکہ یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ ﴾ (٦٣/ المنافقون: ١)

''اور اللہ جتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔''

یعنی اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں، زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، لیکن ان کا یہ اقرار اور ان کی یہ گواہی ان کے دل کا اقرار اور گواہی نہیں، ان کے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے، اگر ایسا نہ ہو تو اسی کا نام نفاق ہے، جس کی برائی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ''قیامت کے دن اللہ کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولت مند پیش ہوں گے اور ہر ایک اپنے علم و دولت اور جان بازی کے کارنامے بیان کرے گا، لیکن ان کارناموں کو سن کر اللہ کہے گا کہ تم جھوٹ بکتے ہو اور فرشتے بھی یہی کہیں گے۔'' ❹ یہ

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات الایمان: ٣٣ وکتاب الادب، باب قول اللّٰه: یاایھاالذین امنوا اتقوا اللّٰه وکونوا مع الصادقین: ٦٠٩٥ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ٢١١۔

❷ صحیح مسلم، ایضًا: ٢١٣، ٢١٤۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الادب، ایضًا: ٦٠٩٤۔

❹ ترمذی، ابواب الزھد باب الریاء والسمعة: ٢٣٨٢۔

کارنامے اگرچہ غلط بیان نہیں کیے گئے تھے، تاہم چونکہ ان میں اخلاص نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کیے گئے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹ کہا، کہ ان کے ان کارناموں کی حقیقی غرض اللہ کی خوشنودی نہ تھی، بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی، جس کا اللہ کے یہاں کوئی معاوضہ نہیں۔

عمل کی سچائی

عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو، یا یوں کہیے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہوں، مثلاً: ایک شخص نماز میں خشوع وخضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اس کا مقصود صرف نمائش ہے، تو یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے، لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھ کر باریک ہے، ایک شخص نمائش کے لیے ایسا نہیں کرتا، تاہم ظاہری طور پر اس کی نماز سے جو خشوع وخضوع ظاہر ہوتا ہے، اس کے باطن میں وہ خشوع وخضوع نہیں ہے، اس لیے اس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے، اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال میں صادق نہیں، اس لیے زبان کی سچائی اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے، اسی لیے جن مسلمانوں نے غیر متزلزل ایمان کے بعد اللہ کی راہ میں جان ومال سے جہاد کیا، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے، اللہ نے فرمایا:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝ ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۵)

’’مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک (وشبہ) نہیں کیا اور اللہ کے راستے میں اپنی جان ومال سے جہاد کیا یہی سچے لوگ ہیں۔‘‘

یہ سچے اس لیے ٹھہرے کہ ان کا یہ عمل ان کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہوا، زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا، عمل سے اس کی تصدیق کر دی۔ اس صدق عمل کے کئی مرتبے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے، اس میں کسی قسم کا ضعف وتردد نہ پیدا ہو، مثلاً: ایک شخص احکام الٰہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے، لیکن جب اس کی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہو جاتا ہے، اس لیے ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہیں کہہ سکتے، اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے جو مومن کامل ہو، منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اتر سکتے، کیونکہ عدم یقین کی بنا پر وہ دل کے بودے ہوتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ فَاَوْلٰى لَهُمْ۝ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۫ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۫ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ۝ ﴾

(۴۷/ محمد:۲۰۔۲۱)

''اور سچے مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی سورت نازل ہو، پھر جب کوئی سورہ اترتی ہے، اس میں لڑائی کا تذکرہ ہو تو (اے پیغمبر ﷺ!) جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے، تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوف زدہ) دیکھ رہے ہیں، جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو، تو ان پر تف ہو، (رسول کی) فرماں برداری چاہیے اور صاف و صحیح جواب دینا چاہیے اور جب بات ٹھن جائے پھر یہ لوگ اللہ سے سچے رہیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔''

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدقِ عملی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول و قرار کیا جائے اور جس قول و قرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے، اس کو وقت پڑنے پر پورا کر بھی دکھایا جائے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزمِ صادق کرلے اور اس میں کسی قسم کا ضعف نہ ہو، لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اس میں ضعف ظاہر ہو، اس لیے صحابہ کرام میں جن لوگوں نے عزم صادق کے ساتھ عملاً اپنے عزم کو پورا کر دکھایا ہے، اللہ نے ان کو سچا کہا ہے۔ چنانچہ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا، اس کی تلافی کے لیے انہوں نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جان بازی کے جوہر دکھاؤں گا، چنانچہ اس کے بعد غزوۂ احد میں شریک ہوئے اور نیزے، تلوار اور تیر کے تقریباً اسی زخم کھا کر شہادت حاصل کی، ایفائے عزم کی یہ بہترین مثال تھی، اس لیے خداوند تعالیٰ نے ان کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی: [1]

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۙ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۲۳۔۲٤)

''مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کے ساتھ انہوں نے (جان نثاری کا) جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے سو (بعض تو) ان میں سے ایسے تھے جو اپنی پوری کر گئے، (یعنی شہید ہوئے) اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو (شہادت کے) منتظر ہیں اور انہوں نے (اپنی بات میں) ذرا سا بھی تو ردو بدل نہیں کیا، تا کہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا ان کو معاف کر دے، [2] بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

صدق عملی کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف، دل کا ہر

[1] بخاری، کتاب الجہاد، باب قول اللہ عزوجل: من المؤمنین رجال ..... : ٤٧٨٣ ۔

[2] یعنی ان منافقوں کو توبہ کی توفیق ہو اور وہ آگے چل کر سچے مومن بن جائیں تو خدا ان کو معاف فرمادے۔

ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق وصداقت کا پورا مظہر ہو جائے، قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدیق کہا ہے، ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہیں، عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار اور یقین کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، بعض بعض صحابیوں کے حالات میں اس کیفیت کا ذکر آتا ہے، ایک بار ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ میں اللہ پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہوں۔ آپ نے کہا کہ ''سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟'' بولے میرا دل دنیا سے پھر گیا ہے، اس لیے رات کو جاگا کرتا ہوں، (نماز) اور دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہوں (روزہ) گویا میں علانیہ عرش الٰہی کو دیکھ رہا ہوں، گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہل جنت باہم مل جل رہے ہیں، گویا میں دوزخیوں کو واویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ ''تم نے جان لیا، اسی پر قائم رہو۔'' [1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی خاص صحبتوں میں ان کو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا، ایک بار حضرت حنظلہ اسیدی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس سے روتے ہوئے گزرے، انہوں نے پوچھا، حنظلہ کیا بات ہے؟ بولے: میں منافق ہو گیا، ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہوتے ہیں اور آپ ﷺ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو گویا ہم ان کو علانیہ دیکھ لیتے ہیں، لیکن جب پلٹ کر بال بچوں اور دنیوی کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں تو سب بھول جاتے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے، اب دونوں بزرگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور یہ واقعہ بیان کیا، ارشاد ہوا کہ ''اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے تم سے تمہاری مجلسوں میں مصافحہ کرتے، یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آجاتی ہے۔'' [2]

قرآن پاک کی اس آیت میں گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، فرمایا:

﴿ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ ﴾ (۱۰۲/ التکاثر: ۵)

''ہرگز نہیں اگر تم کو یقینی علم ہوتا (تو تم سے یہ غفلت نہ ہوتی)''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پختہ یقین سے اس کے نتائج الگ نہیں ہو سکتے۔

سچائی کی اسی اعلیٰ ترین قسم کا تذکرہ قرآن پاک کی ان آیتوں میں ہے:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ

---

[1] اسد الغابة تذكرة حارث بن مالك، ج١، ص: ٣٤٦۔

[2] ترمذي، ابواب صفة القيامة، باب حديث حنظلة: ٢٥١٤۔

اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''نیکی یہی نہیں کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی تو ان کی ہے جو اللہ اور روزِ آخرت اور فرشتوں اور (آسمانی) کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور مال اللہ کی حبّ پر رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا اور (غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں (دیا) اور نماز پڑھتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور جب (کسی بات کا) اقرار کرلیا تو اپنے قول کے پورے اور تنگی اور تکلیف میں اور ہل چل کے وقت میں ثابت قدم رہے، یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے اور یہی ہیں پرہیزگار۔''

ان آیتوں میں جن کو صادق کہا گیا ہے، ان کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے ہیں، اول ان کے ایمان کا کمال، دوسرے ان کے نیک عمل اور تیسرے جانچ میں ان کا ہر طرح پورا اترنا اور جو لوگ علم اور عمل کے ان تمام فضائل کے درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں، ان کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا، صدیق کہتے ہیں [1] جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبہ کمال ہے، چنانچہ آیت ذیل میں نبی کے بعد ہی صدیق کا نام لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہم راہی کا ذریعہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت ہے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ۝﴾ (٤/ النسآء:٦٩)

''اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (جنت میں) ان (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیے، یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور (دوسرے) نیک بندے اور یہ لوگ (کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں۔''

سورۂ حدید میں ایمان کامل اور جانی و مالی جہاد کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ڰ﴾ (٥٧/ الحدید:١٩)

''اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی صدیق ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اس کامل ایمان کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے، جس سے عمل کبھی جدا نہیں ہوسکتا، یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ ''انسان سچ بولتے بولتے صدیق ہوجاتا ہے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے صداقت پر مضبوطی سے قائم

[1] الصدیق الذی یصدق قولہ بالعمل (مجمع البحار فتنی، ج۳، ص:۳۰٤) ''صدیق وہ ہے جس کے قول کی تصدیق عمل سے ہو۔''

رہنے کی ضرورت ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے، زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی اور جب ان تینوں میں کوئی مسلمان کامل ہو تو وہ کامل راست باز اور صادق ہے۔

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے، سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر دینے کے ہیں اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں، اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کا خیال کیے بغیر کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کو دینا، دوسرے کے لیے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا، اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرہ میں ڈال دینا، اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا، دوسروں کو بچانے کے لیے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں جن کے امتیاز کے لیے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنوں کو گھیرے اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیموں کو محیط ہے اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں کے کچھ اوصاف بتائے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳)

''اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے کچھ (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔''

بعض اہل تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں، (تفسیر ابن جریر طبری جلد اول تفسیر آیت مذکور) بلکہ یہاں جس طرح روزی کی تخصیص نہیں کی گئی، کہ کیا دی گئی، پھل کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز، اسی طرح اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دینے کی صورت کی بھی تعیین نہیں کی گئی، اللہ نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے، اس کو اس میں سے اس شخص کو دینا چاہیے جس کو یہ نہیں ملا، یا ضرورت سے کم کم ملا ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو جو ملا ہے، اس میں سے کچھ ان کو دینا جو اس سے محروم رہے ہیں، یا جو اس کے محتاج ہیں، متقیوں کی نشانی ہے اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح میں سخاوت اور فیاضی ہے۔ [1]

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رکن، نماز اور زکوٰۃ ہیں، زکوٰۃ کی اصلی روح یہی سخاوت اور فیاضی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں اس اخلاقی تعلیم کی حیثیت بالکل بنیادی ہے، یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوقِ الٰہی کی بنیاد ہے، اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندوں کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے، جب تک کسی میں یہ وصف پیدا نہ ہوگا، اس میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا جذبہ

[1] تفسیر ابن جریر طبری، ج ۱، ص: ۸۰، تفسیر آیت مذکور۔

نہ ہوگا، اسی لیے اسلام نے زکوۃ کو فرض کر کے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے، سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایتاء (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے، سورۂ بقرہ میں خصوصیت کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید پر تاکید آئی ہے اور کہیں کہیں اس کو جہاد کی ایک کڑی بنا دیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ ﴾ (٢/ البقرة:٢٥٤)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے کچھ خرچ کرو جو ہم نے تم کو دیا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خریدنا ہے، نہ دوستی ہے، نہ سفارش ہے اور کافر ہی ہیں ظالم۔''

اس آیت پاک کا آخری ٹکڑا (اور کافر ہی ہیں ظالم) غور کے قابل ہے، اس ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے کہ جو شخص روزِ جزا کے فائدہ کا خیال نہ کر کے اللہ کی راہ میں اپنی کوئی چیز خرچ نہیں کرتا وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے، یا یہ کہ وہ کافرِ نعمت ہے، جو اللہ کی روزی کی نعمت پا کر اس کے شکرانہ میں اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں نہیں دیتا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پر تاثیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرنے پر ابھارا ہے کہ اے لوگو! اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں اللہ کی رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خرید و فروخت سے حاصل ہو سکتا ہے، نہ دوستی و محبت سے اور نہ سعی و سفارش سے، کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمہاری نہیں، بلکہ میری ہی دی ہوئی ہے، خرچ کر کے اللہ کی رحمت اور دوستی کو خرید لو کہ اس دن یہی کام آنے والا ہے۔

اللہ کی راہ میں جو سخاوت کی جائے ضرور ہے کہ اس میں خلوص نیت ہو، اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنون احسان بنانا ہو اور نہ اس کا اُلاہنا دینا ہو، خود رسول کو فرمایا: ﴿ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۝ ﴾ (٧٤/ المدثر:٦) ''اور احسان نہ کر (احسان نہ دھر) کہ زیادہ بدلہ چاہے۔'' اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا اس کی مزدوری اللہ دے گا اور قیامت کے غم و ملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا، ارشاد ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝ ﴾ (٦/ البقرة:٢٦٢)

''جو اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر اس کے خرچ کے پیچھے نہ تو احسان دھرتے ہیں اور نہ الاہنا دیتے ہیں، ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس دھری ہے اور نہ ان کو ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی دنایت ظاہر ہوتی ہے، فرمایا گیا:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۷)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا اچھی چیزیں خرچ کرو، اس میں سے بری چیز کے دینے کا قصد نہ کرو کہ تم دیتے ہو، حالانکہ تم اب اس کو لینے والے نہیں، مگر یہ کہ آنکھ اس کے لینے میں میچ لو۔''

مطلب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو، اس کا دینا بھی پسند کرو، جب تک ایسا نہ کرو گے اخلاق کا وہ جوہر جس کا نام نیکی اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آ سکتا، صاف فرمایا:

﴿ لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴾

(۳/ آل عمران:۹۲)

''ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے، جب تک تم اس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو پسند ہے اور جو بھی تم خرچ کرو اللہ جانتا ہے۔''

یعنی اللہ دل کے حال سے خبردار ہے، کس نیت سے اور کس طرح کا مال تم دے رہے ہو، اس کی حقیقت اوروں سے چھپی رہے تو چھپی رہے، مگر اس سب دلوں کے حال جاننے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے اور اسی لیے وہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے اور اس طرح نیکی کے کام جو کچھ تم دیتے ہو اس کا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملے گا، دنیا میں تو اس طرح کے جماعتی کاموں کی مضبوطی اور جہاد اور محتاجوں کی مدد میں جو کچھ دیتے ہو، اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے، جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو اور دین میں تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملے گا جو کرے گا، فرمایا:

﴿ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۲)

''اور جو بھی تم نیکی سے خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی لیے ہے اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کے لیے اور جو بھی تم خرچ کرو، وہ تم کو پورا دے دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کی جائے گی۔''

اور اسی لیے کہ دنیا میں جو کچھ دے گا، وہ آخرت میں اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے:

﴿ مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۴۵)

''کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گنا کرے۔''

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴾

(۵۷/ الحدید:۱۱)

''کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو وہ اس کو اس کے واسطے دونا کرے اور ہے اس کے لیے عزت کی مزدوری۔''

آگے چل کر پھر فرمایا:

﴿ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴾

(۵۷/ الحدید:۱۸)

''بے شک خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں اور قرض دیتے ہیں اللہ کو اچھا قرض، ان کو دونا دیا جائے گا اور ان کے لیے عزت والی مزدوری ہے۔''

کہیں حکم کی صورت میں ہے:

﴿ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ (۷۳/ المزمل:۲۰)

''اور اللہ کو اچھا قرض دو۔''

قرض حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لیے فرمایا کہ وہ خلوص سے دیا جائے اور اس کے بدلہ میں لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو، نہ اس پر احسان دھرا جائے، نہ اس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو، بنی اسرائیل سے اللہ نے جن باتوں کا عہد لیا تھا اور ان کو قرآن میں مسلمانوں کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے، ان میں نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ کا ذکر ہے اور اس کے بعد آخری بات یہ ہے:

﴿ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۲)

''اور (اگر) تم اللہ کو اچھی طرح کا قرض دیتے رہے۔''

تو ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

﴿ لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۱۲)

''تو میں تم سے تمہاری برائیاں اتاروں گا اور تم کو ان باغوں میں داخل کروں گا، جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو بدوی ایمان لائے اور خوش نیتی کے ساتھ کار خیر میں خرچ کرتے تھے، اللہ نے ان کی تعریف فرمائی:

﴿ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ۭ ﴾ (۹/ التوبة:۹۹)

''اور بعضے بدوی ایسے ہیں، جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں اور ٹھہراتے ہیں جس کو خرچ کرتے ہیں، اللہ سے نزدیک ہونا اور رسول کی دعا لینا۔''

اللہ نے ایسے سخی داناؤں کو خوشخبری دی:

﴿ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۭ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

(۹/ التوبة:۹۹)

''ہاں! وہ ان کے حق میں نزدیکی کا سبب ہے، ان کو اللہ اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

متقی سخیوں کے لیے اللہ نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کی طرف جھپٹ کر جانے کی منادی کی ہے:

﴿ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۳۳۔۱۳٤)

''اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین، تیار ہوئی ہے پرہیز گاروں کے واسطے جو خوشی اور تکلیف (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں۔''

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کی جو اللہ کی راہ میں کیا جائے ایک مثال دی ہے، جس سے یہ اچنبھا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گنا کیونکر ہوگا، دور ہو جاتا ہے، فرمایا:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرة:۲٦۱)

''ان کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ایک دانہ کی سی ہے، جس سے سات بالیں اگتی ہیں، ہر بال میں سو دانے ہوتے ہیں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے اور اللہ کشائش والا ہے سب جانتا ہے۔''

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑوں دانے بن جاتا ہے، ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے سینکڑوں دانے پیدا کر لیتا ہے، اللہ گنجائش اور کشائش والا ہے، اس کے ہاں ایک کا سو بن جانا کچھ مشکل نہیں ہے اور وہ جانتا بھی ہے کہ کس نے کتنی اچھی نیت سے یہ دیا ہے، اسی رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی جو اللہ کی خوشنودی کے

لیے اچھی نیت سے اپنا مال دیتے ہیں، ایک اور مثال دی ہے:

﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۵)

''اوران کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہنے کے لیے اور اپنے کو پکا کرنے کو دیتے ہیں، ایک باغ کی سی ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو، اس پر مینہ پڑا تو اس نے اپنا پھل دوگنا دیا اور اگر مینہ نہیں پڑا تو اوس ہی پڑی اور اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے''

اس مثال میں ٹیلہ کی اونچی صالح زمین سے اچھی نیت، بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا اور پھل سے ثواب مراد ہے، تو جیسے باغ کسی اچھی زمین میں پانی سے اور وہ نہ ہو تو ذرا سی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے، ایسے ہی اچھی نیت سے اللہ کی راہ میں جو دیا جائے، وہ ایک کے بدلہ میں سو ہو جاتا ہے اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے، اس لیے ہماری نیتوں کے بھید سے بھی آگاہ ہے۔

اس دادو دہش اور جود وسخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورۂ واللّیل میں بیان کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝﴾ (۹۲/ الیل:۵۔۷)

''تو جس نے (راہ الٰہی میں) دیا اور پرہیز کیا اور اچھی بات کو مانا، تو ہم اس کے لیے (نیکی کی) سچ بات کا راستہ آسان کریں گے۔''

﴿ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝﴾ (۹۲/ اللیل:۱۷۔۲۱)

''اور اس (دوزخ کی آگ) سے وہ پرہیزگار بچایا جائے گا، جو اپنا مال پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے، بلکہ اپنے پروردگار برتر کی خوشی کے لیے اور وہ خوش ہو جائے گا۔''

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہ الٰہی میں دینے کی عادت، اطاعت وعبادت، یا نیک کاموں کے کرنے کی روح پیدا کر دیتی ہے، جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا ہے، یہ اس نیک عادت کا کتنا بڑا فائدہ ہے، دوسری آیت کہتی ہے کہ ایسے متقی پر جو داد و دہش کا عادی ہے، دوزخ کی آگ حرام ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس جود وسخا کا سبب دنیاوی ناموری یا کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو۔ بلکہ مقصود صرف اللہ ہو اور یہ ہو کہ مال ودولت کے میل سے اس کا دامنِ دل پاک ہو جائے، تو اللہ بھی اس کے عمل کا وہ

بدلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا، اس دوسری آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اس سے دل میں پاکیزگی آتی ہے۔

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے، جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے، دنیا کی اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے، اسی لیے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلوں کے اسی میل کو دھونا چاہا اور جود و سخا اور داد و دہش کی برملا تعریف اور جمع مال، حرص و طمع اور بخل کی بہت مذمت کی اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیروؤں کے دلوں سے مال و دولت کی محبت ہمیشہ کے لیے جاتی رہے:

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ ﴾

(۱۰۳/ الهمزة:۱۔۳)

''پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے عیب کرنے والے پر جس نے دولت اکٹھی کی اور اس کو گن گن کر رکھا، سمجھتا ہے کہ اس کی یہ دولت اس کو سدا رکھے گی۔''

ایک اور آیت میں مال کی محبت پر کافروں کو طعنہ دیا ہے:

﴿ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ ﴾ (۸۹/ الفجر:۲۰)

''اور تم مال و دولت سے بہت ہی محبت رکھتے ہو۔''

یہی محبت، سچائی اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر میں نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی اور میرا مال خرچ ہو جائے گا، اسی وسوسۂ شیطانی کو اللہ نے انفاق (اللہ کی راہ میں دینا) کے سلسلہ میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

﴿ الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ ۖ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرة:۲۶۸)

''شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہے اور تمھیں بے حیائی کی بات (بخل) کو کہتا ہے اور اللہ تم سے اپنی طرف سے گناہوں کی بخشائش اور فضل و کرم کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ کشائش والا ہے، جاننے والا ہے۔''

قرآن کی اصطلاح میں دین و دنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے، یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے علم اور عمل کا ہر بند خزانہ کھل جاتا ہے، حکمت کا یہ خزانہ اس وقت تک کسی کو نہیں ملتا جب تک اس کے دل سے دنیا کے مال و دولت کی محبت جاتی نہ رہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس اوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا:

﴿ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ ﴾

(۲/ البقرة:۲۶۹)

”وہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہے اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی اس کو بڑی دولت ملی۔“

یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا، کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائیں گے، اس کا سراسر دھوکا ہے اور اللہ کا یہ وعدہ کہ دینے سے اس کے فضل و کرم کا دروازہ کھلے گا، درست ہے، بہت بڑی دانائی کی بات ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ مال و دولت کی محبت ایک آزمائش ہے، اس آزمائش میں پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے، پھر فرمایا جو بخالت اور لالچ سے بچا وہی مراد کو پہنچا، کیونکہ ہر اونچے مقصد کے لیے پہلی شرط جان و مال کی بازی لگانا ہے، جس کے پاؤں اس بازی میں ٹھہر گئے وہی بامراد ہوا اور جس کے اکھڑ گئے وہ نامراد رہا:

﴿ إِنَّمَآ أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللَّهُ عِندَهُۥٓ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنفِقُوا خَيْرًا لِّأَنفُسِكُمْ ۗ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ إِن تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ ۝ ﴾

(٦٤/ التغابن:١٥ـ١٧)

”تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو جانچ ہے اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری ہے، تو اللہ سے ڈرو، جتنا ہو سکے اور (اس کی باتوں کو) سنو اور مانو اور (راہ الٰہی) خرچ کرو، اپنے لیے بھلائی کرو اور جو اپنی جان کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں، اگر اللہ کو قرض دو اچھا قرض، تو وہ اس کو تمہارے لیے دونا کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور اللہ (نیکی کی) قدر پہچانتا ہے اور (برائی کا بدلہ لینے میں) بردبار ہے۔“

ان آیتوں میں انفاق اور کارِ خیر میں دینے کو کامیابی کی کنجی جو کہا گیا ہے، وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف بحرف مطابق ہے، قوموں کی ترقی کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنی دولت کو اچھے کاموں میں لگاتی ورافراد میں بانٹتی رہیں، یعنی جماعت کے کاموں اور کمائی کے ناقابل یا کمائی سے محروم افراد کی مدد میں اپنا سرمایہ خرچ کرتے رہیں، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی اور تمول کی برائیوں سے لوگ بچے رہیں گے اور بخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کاموں کے کرنے سے ہچکچایا نہ کریں گے اور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اس کے دو قسم کے بیہودہ خطرے ہیں:

① میری چیز ہے، میں دوسروں کو کیوں دوں۔

② دوسروں کو دوں گا، تو میرے کمی ہو جائے گی، جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہوگی۔

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونوں وسوسوں کا خاتمہ کر دیا ہے، اس نے یہ بتایا اور اپنے

پیرووں کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت میں میرا تیرا کسی کا نہیں، وہ صرف اللہ کا ہے، وہی اس کا مالک اسی کی چیز ہے اور اسی کی راہ میں دی جانی چاہیے:

﴿ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾

(۵۷/ الحدید:۱۰)

''اور تم کو کیا ہوا ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔''

بخل کی برائی میں کہا:

﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۸۰)

''اور نہ سمجھیں وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جس کو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے، بلکہ یہ ان کے حق میں برا ہے، قیامت کے دن ان کے گلے میں اس کا طوق ڈالا جائے گا، جس کا بخل کیا تھا اور آسمانوں کی اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔''

ذرا ذرا سے فرق سے قرآن پاک میں بیسیوں جگہ یہ آیت ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۰۹)

''اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔''

اسی طرح بیسیوں مقام پر تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہے:

﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲)

''آسمانوں اور زمین کی ملکیت (یا بادشاہی) اُسی کی ہے۔''

منافقوں نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کریں، تاکہ جو مسلمان اکٹھے ہو گئے ہیں، وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائیں، اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اس سازش کی خبر اپنے رسول کو دی اور ساتھ ہی منافقوں کے اس زعم باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ ان کے دینے سے ہوگا، تردید کی، فرمایا:

﴿ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴾ (۶۳/ المنافقون:۷)

''وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول کے پاس جو لوگ ہیں ان پر خرچ نہ کرو، تاکہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں [1] اور اللہ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے اور لیکن

[1] (یا) یہاں تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔

منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔"

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغ نبوی ﷺ کی کل چل رہی ہے، ان کے بل بوتے سے ہے، اللہ نے فرمایا، یہ سارا خیال غلط ہے، آسمان اور زمین کے خزانہ میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے، وہ جہاں سے جس کو چاہے جو چاہے دے دے، دوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا، فرمایا:

﴿ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ (٤٢/ الشورىٰ: ١٢)

"اسی کے پاس ہیں آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں، پھیلا دیتا ہے روزی جس کیلئے چاہے اور ناپ دیتا ہے، وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے۔"

یہ حقیقت ظاہر کی کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونوں انسان کی جانچ کے دو برابر کے راستے ہیں، اگر ایک میں انسان کی فیاضی، مال کے عدم محبت، ایثار اور جذبہ شکر کا امتحان ہے، تو دوسرے میں انسان کی قناعت پسندی بے طمعی اور جذبہ صبر کی آزمائش ہے، فرمایا:

﴿ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ڏ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ڏ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝﴾ (٨٩/ الفجر: ١٥۔١٦)

"سو آدمی جو ہے جب اس کا مالک اس کو جانچے پھر اس کو عزت دے اور نعمت دے، تو وہ کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے عزت دی اور جب اس کو جانچے تو اس کی روزی اس پر تنگ کرے، تو کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا، یہ کوئی بات نہیں۔"

غرض روزی کی کشائش اور تنگی دونوں اللہ کے کام ہیں اور مصلحت سے ہیں، دولت مند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھی میں کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی، یا مجھی کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چاروں طرف سمٹی آ رہی ہے، مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لیے کافی ہے، مگر کم نگاہ لوگ ادھر دیکھتے نہیں، قرآن نے اس انسانی جبلت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچ کر اس کی غلطی بتائی ہے:

﴿ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۡ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ ۭ بَلْ هِىَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۭ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (٣٩/ الزمر: ٤٩۔٥٢)

''سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آ لگے تو ہم کو پکارے، پھر جب ہم اپنی طرف اس کو کوئی نعمت دیں تو کہے کہ یہ تو مجھے علم پر ملا ہے، ❶ (اللہ فرماتا ہے) بلکہ یہ تو جانچ ہے، مگر بہتیرے اس کو نہیں سمجھتے۔ یہی بات ان کے پہلوں نے کہی تھی، ❷ تو ان کو ان کی یہ کمائی کام نہ آئی اور جو کمایا تھا اس کی برائیاں ان پر پڑیں اور جو ان میں سے گناہ گار ہیں، ان پر بھی ان کی کمائی کی برائیاں پڑنے والی ہیں، وہ تھکا نہیں سکتے، کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی روزی جس کے لیے چاہتا ہے، پھیلاتا ہے، (اور جس کو چاہتا ہے) ناپ کر دیتا ہے، اس میں ایمان والوں کے لیے البتہ نشانیاں ہیں۔''

ہر جاندار کی روزی اللہ کے ذمہ ہے، اس کا یقین انسان کو آ جائے تو سخاوت اور فیاضی کا ہر راستہ اس کے لیے آسان ہو جائے، اسلام نے انسانوں کو یہی یقین دلایا ہے، اللہ نے فرمایا:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾ (۱۱/ ھود:٦)

''اور کوئی چلنے والا نہیں زمین میں، مگر یہ کہ اس کی روزی اللہ پر ہے، وہ جانتا ہے جہاں اس کو ٹھہرنا ہے، (یعنی دوزخ یا بہشت) اور جہاں اس کو سونپا جاتا ہے، (یعنی قبر) سب (علم الٰہی) کھلی کتاب میں موجود ہے۔''

دوسرا یقین یہ آئے کہ ہماری روزی میں سے جو کچھ دوسرے کو مل جاتا ہے، وہ تقدیر میں اسی کا حصہ تھا، اس لیے درحقیقت وہ ہمارا تھا ہی نہیں، اسلام نے اپنے پیروؤں کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جوہر پیدا کرنے کے لیے ان یقینیات کو مسلمانوں کے ریشہ میں رچا دینا چاہا ہے، وہی سب کو روزی پہنچاتا ہے، اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے:

﴿ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ ﴾ (۲۷/ النمل:٦٤)

''اور تم کو کون روزی دیتا ہے، آسمان سے اور زمین سے، اللہ کے ساتھ کوئی اور اللہ بھی ہے۔''

روزی دینا اسی کا کام ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝ ﴾ (٥١/ الذاریت:٥٨)

''بے شبہ اللہ جو ہے وہی روزی دینے والا ہے، زور آور مضبوط۔''

احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے طرح طرح کے پر اثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے،

---

❶ اس کا ایک مطلب تو اہل تفسیر نے یہ لیا ہے کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا اور دوسرا یہ کہ دولت کے حصول کے طریقوں کا مجھے ہنر معلوم تھا، اس دوسرے مطلب کی تائید سورۂ قصص میں قارون کے قصہ والی آیت سے ہوتی ہے۔ (دیکھو روح المعانی، ج ٢٤، ص: ١١)۔

❷ چنانچہ قارون کو جب راہ الٰہی میں خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی تو اس نے بھی یہی کہا تھا، ﴿ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ ﴾ (۲۸/ القصص:٧٨) ''قارون نے کہا: یہ دولت تو مجھے ایک ہنر سے ملی ہے، جو میرے پاس ہے۔''

فرمایا: ''تم باندھو نہیں، ورنہ تم پر باندھا جائے گا۔'' ❶ یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منہ بند کرو گے اور دوسروں کو نہ دو گے، تو اللہ بھی اپنی تھیلی کا منہ تم سے بند کر لے گا اور تم کو نہیں دے گا۔'' ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا: ''تم میں سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے؟'' لوگوں نے کہا، ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے، فرمایا: ''تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال ہے۔'' ❷ ایک دفعہ آپ نے قرآن پاک میں یہ آیت پڑھی ﴿ اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ ﴾ (۱۰۲/ التکاثر:۱) ''تم کو مال و دولت کا اور نازونعمت کی بڑھوتری نے غفلت میں ڈال دیا۔'' پھر فرمایا: ''آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا مال! میرا مال! اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلا یا یا کھالیا تو اس کو فنا کر چکا اور پہن لیا تو اس کو پرانا کر چکا۔'' ❸

فرمایا: ''اے ابوذر! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس احد پہاڑ برابر سونا ہو اور تیسرے دن تک اس میں سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے، مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑوں، میں کہوں گا کہ اس کو اللہ کے بندوں میں ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو۔'' پھر فرمایا: ''ہاں جن کے پاس یہاں زیادہ ہے، ان ہی کے پاس وہاں قیامت میں کم ہوگا، لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے داہنے بائیں، آگے پیچھے بانٹ دو۔'' ❹

فرمایا: ''رشک دو ہی پر روا ہے، ایک اس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے، تو وہ ہاتھوں سے اس کو صحیح مصرف (حق) میں لٹا رہا ہے، دوسرے اس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اس کے مطابق بتا رہا ہے اور سکھا رہا ہے۔'' ❺

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے اور اس میں دنیا جس کا مصرف صحیح نہ ہو، یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو اسراف اور فضول خرچی ہے، جس کی برائی قرآن پاک میں آئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے، اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان میں آئے گی۔

یہ بھی سخاوت نہیں کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے اور جب موت سامنے آ کر کھڑی ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو ہتھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کاموں میں لٹا جاؤں، قرآن پاک نے آدمی کی اس بے بسی کا نظارہ کس پر اثر انداز میں کھینچا ہے اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے:

❶ صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب الحث علی الانفاق: ۲۳۷۶۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ماقدم من ماله فهوله: ٦٤٤٢۔ ❸ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ الهاکم التکاثر: ۳۳٥٤۔ حدیث حسن صحیح۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی ﷺ: ما یسرنی ان عندی…… : ٦٤٤٤۔
❺ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحکمة: ۷۳۔

﴿ وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ فَیَقُوۡلَ رَبِّ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ۝ ﴾ (۶۳/ المنافقون:۱۰)

''اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو موت آنے لگے، تو کہے کہ اے میرے مالک! تو نے مجھے تھوڑی مہلت اور نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیکوں میں سے ہو جاتا۔''

اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿ وَلَنۡ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ وَاللّٰهُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝ ﴾

(۶۳/ المنافقون:۱۱)

''اور اللہ ہرگز کسی کو مہلت اور نہ دے گا جب اس کا وقت آ جائے اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو۔''

اس لیے جو کچھ کرنا ہے وقت پر کرنا چاہیے، ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا صدقہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا: ''یہ کہ تم صدقہ کرو اور تم تندرست ہو، مال کی خواہش ہو اور جینے کی بھی امید ہو اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آ جائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دو اور فلاں کو اتنا دو، حالانکہ وہ تو اب (تمہارے بعد) فلاں کا ہو ہی چکا۔'' [1]

فرمایا: ''اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لیے بہتر اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لیے برا ہے۔'' [2]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب بیان ان افضل الصدقۃ: ۲۳۸۲۔

[2] ایضا، باب بیان ان الید العلیا : ۲۳۸۸۔

عفت و پاکبازی

عفت و پاکبازی ان ساری اخلاقی خوبیوں کی جان ہے، جن کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے، اسی لیے اسلام نے اس کو ان اخلاقی محاسن میں گنایا ہے، جو مسلمانوں کے چہرہ کا نور ہیں، چنانچہ سورۂ مومنون میں مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہیں، ان میں اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۵۔۷)

''اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرم گاہوں کی پاسبانی کرتے ہیں، مگر اپنی بیبیوں یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ (باندیوں) سے، تو ان پر کچھ الزام نہیں، لیکن جو اس کے علاوہ کے طلب گار ہوں، تو وہی لوگ حد سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔''

سورۂ معارج میں مسلمانوں کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے، ان میں ایک عفت اور پاکبازی بھی ہے، فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج:۲۹)

''اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔''

جن مسلمانوں کے لیے اللہ نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے، ان میں وہ بھی ہیں، جو عفیف اور پاک دامن ہیں:

﴿ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳۵)

''اور اپنی شرم گاہوں کی پاسبانی کرنے والے مرد اور پاسبانی کرنے والی عورتیں۔''

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوگا کہ عفت اور پاک دامنی کے لیے قرآن کی اصطلاح ''حفظ فروج'' ہے، حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہیں اور فروج اپنے معنی میں ایک مجازی استعمال ہے، کتنے لفظ ہیں، جو شرم کے قابل لفظوں سے بچاؤ کے لیے پہلے پہل مجاز کے طور پر بولے گئے، مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے مفہوم میں بالکل ہی بے پردہ ہو گئے، فروج کے اصلی معنی دو چیزوں کے درمیان خلا کے ہیں اور اسی لیے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہیں جدھر سے دشمنوں کے حملہ کا ڈر ہو، اس بنا پر یہ انسانوں کے اعضاء میں سے اس خلا کا نام ہے جو ان کے دونوں پاؤں کے بیچ میں ہے اور جدھر سے دشمنوں کی آمد کا خطرہ ہر وقت لگا ہو اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاسبانی اور نگرانی کی ضرورت ہو، اس طریقہ تعبیر سے اندازہ ہوگا کہ عفت و پاکبازی کا جو تخیل ان لفظوں کے اندر پیوست ہے، وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند ہے۔

عفت و پاکبازی کے لیے قرآن کا دوسرا لفظ احصان ہے، جو حصن سے بنا ہے، جس کے معنی قلعہ یا

محفوظ مقام کے ہیں، اس سے حِصَانٌ، اِحْصَانٌ، مُحْصِنٌ اور مُحْصَنٌ الفاظ بنائے گئے ہیں، پہلا لفظ قرآن میں نہیں آیا، مگر عربوں کے اشعار میں آیا ہے، اس کے معنی پاک دامن عورت کے ہیں، دوسرے کے معنی حفاظت میں لینے، یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں، یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے، دو دفعہ حضرت مریم علیہا السلام کی عصمت و پاک دامنی کے بیان میں، ماضی معروف کے صیغہ میں:

﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ﴾ (٦٦/ التحریم:١٢)

''اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔''

﴿ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ (٢١/ الانبیآء:٩١)

''اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔''

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ شوہر نے اس کو اپنے نکاح میں لا کر اپنی حفاظت میں لے لیا، لونڈیوں کے بیان میں ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح میں آ کر بدکاری کریں تو ان کی سزا کیا ہے، فرمایا:

﴿ فَاِذَآ اُحْصِنَّ ﴾ (٤/ النسآء:٢٥)

''تو جب وہ نکاح کی قید میں آ چکیں۔''

اسی سے اس کا فاعل مُحْصِنٌ (حفاظت میں لانے والا) اور اسم مفعول مُحْصَنَةٌ (حفاظت میں لائی گئی) نکاح کے سلسلہ میں قرآن میں آیا ہے:

﴿ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ﴾ (٤/ النسآء:٢٤)

''حفاظت میں لانے والے نہ مستی نکالنے والے۔''

﴿ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ ﴾ (٤/ النسآء:٢٥)

''حفاظت میں آنے والیاں نہ مستی نکالنے والیاں۔''

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے، صرف حیوانی خواہش کا دفع کرنا نکاح کا مقصد نہیں، اسی لیے قرآن پاک میں اس کے علاوہ مُحْصَنٰتٌ (حفاظت میں رکھی ہوئی بیبیاں) دو معنوں میں آیا ہے، ایک بیاہی عورتوں کے معنی میں، جیسے:

﴿ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ ﴾ (٤/ النسآء:٢٤)

''اور بیاہی عورتیں، (یعنی جو عورتیں کسی کے نکاح میں ہیں وہ دوسرے مرد پر حرام ہیں)۔''

دوسرے شریف آزاد بی بیوں کے معنی میں جیسے:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ ﴾ (٤/ النسآء:٢٥)

''اور جس کو تم میں سے مسلمان شریف و آزاد بیویوں کے نکاح کا مقدور نہ ہو، (تو مسلمان باندی سے نکاح کرے)۔''

عورتوں کی عصمت کے بیان میں قرآن پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے:

﴿ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ ﴾ (٤/ النساء:٣٤)

''پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں۔''

یعنی اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں اپنی عزت وآبرو کی پوری حفاظت کرتی ہیں۔

اسلام میں عفت اور پاکبازی کا وہ رتبہ ہے کہ وہ نبوت ورسالت کا لازمی جزو ہے، نبی، نبی کے سلسلہ نسب اور نبی کے اہل بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں حضرت مریم علیہا السلام کی نسبت یہود نے جو بہتان باندھا تھا، قرآن نے اس کی تردید کی اور ان کی عصمت اور پاک دامنی کی شہادت دی اور دو موقعوں پر اس شہادت کی تصریح کی:

﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ﴾ (٦٦/ التحريم:١٢)

''اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔''

﴿ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ (٢١/ الانبياء:٩١)

''اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے جس پاکبازی کا ثبوت دیا، اس کی گواہی خود عزیز مصر کی بیوی نے دی:

﴿ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ﴾ (١٢/ يوسف:٣٢)

''اور میں نے اس کو اس سے چاہا تو وہ بچا رہا۔''

اللہ نے فرمایا میں نے ایسا اس لیے کیا:

﴿ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ (١٢/ يوسف:٢٤)

''تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور کریں، وہ بے شبہ ہمارے چنے بندوں میں تھا۔''

معلوم ہوا کہ خدا کے چنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتوں سے پاک رکھے جاتے ہیں، حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تعریف میں فرمایا گیا:

﴿ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ (٣/ آل عمران:٣٩)

''اور سردار ہوگا اور اپنی قوت شہوانی پر ضبط رکھتا ہوگا اور نبی ہوگا صالحوں میں سے۔''

اسلام میں اہل بیت نبوی ﷺ کی زندگی، جس عفت، عصمت اور پاک بازی کی تصویر تھی، غیب کے دانائے راز نے اس کی گواہی ان لفظوں میں دی:

﴿ أُولَٰٓئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ۖ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴾ (۲۴/ النور:۲۶)

''یہ لوگ تہمت سے پاک ہیں، ان کے لیے بخشائش ہے اور عزت والی روزی۔''

عفت و پاک دامنی کے خلاف کا نام قرآن کی زبان میں فَاحِشَةٌ [1] آیا ہے، جس کے معنی بہت بڑی برائی کے ہیں، جیسے

﴿ إِلَّآ أَن يَأْتِينَ بِفَٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ﴾ (۴/ النسآء:۱۹)

''مگر یہ کہ وہ عورتیں کھلی برائی کریں۔''

﴿ وَٱلَّٰتِى يَأْتِينَ ٱلْفَٰحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ ﴾ (۴/ النسآء:۱۵)

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو کھلی برائی کریں۔''

اس برائی کا مشہور عربی نام زنا ہے، قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں مسلمانوں کو اس برائی سے روکا گیا ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا۟ ٱلزِّنَىٰٓ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ فَٰحِشَةً وَسَآءَ سَبِيلًا ﴾ (بنیٓ اسرآئیل:۳۲)

''اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک یہ بڑی برائی اور برا چلن ہے۔''

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے، وہ بلاغت کی جان ہے، یہ نہیں فرمایا کہ ''تم زنا نہ کرنا'' بلکہ یہ کہا کہ ''تم زنا کے قریب نہ جانا''۔ اس طرز ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعل بد ہی سے بچنے کی تاکید کی، بلکہ اس سے قریب ہو کر گزرنے کی بھی ممانعت کی، اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے، اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے، کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے یا بے حیائی کے ارادہ سے دیکھنا، تنہائی میں ملنا جلنا، بے وجہ اس کے بدن کو چھونا، یا اور کسی طرح سے اس کی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا، یا دوسرے غیر شریفانہ حرکات کرنا، ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے۔

اسی لیے اسلام نے ان ساری باتوں کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہیں، حرام قرار دیا، مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے، مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو اپنی نظریں نیچی رکھیں:

﴿ قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا۟ مِنْ أَبْصَٰرِهِمْ وَيَحْفَظُوا۟ فُرُوجَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا يَصْنَعُونَ ﴾ (۲۴/ النور:۳۰)

''اے پیغمبر ﷺ! ایمان والوں سے کہہ دے کہ وہ ذرا اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے بڑی ستھری بات ہے، اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

---

[1] اس کا یہ منشا نہیں کہ قرآن میں ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے بلکہ وہ لغت کی رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے۔

عورتوں کی ذرا سی بے باکی بھی مردوں کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے، اس لیے ان پر شرافت کی چند پابندیاں عائد کی گئی ہیں، مثلاً: یہ کہ وہ بھی نگاہیں نیچی رکھیں، غیروں کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائیں، اپنے زیوروں کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں، اسی لیے زمین پر ہولے چلیں، یا جھنکار کے زیور نہ پہنیں، سینہ کا پردہ رکھیں، باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں، باہر نکلنے میں خوشبو نہ ملیں، بیچ راستہ سے کترا کر کنارہ کنارہ پر چلیں، مرد اور عورت راستہ میں باتیں نہ کریں، مرد و عورت مل جل کر نہ بیٹھیں، کسی سے کوئی تنہائی میں نہ ملے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے، یہ تمام باتیں درحقیقت ﴿لا تقربوا الزنی﴾ زنا کے قریب بھی نہ ہو کی شرح ہیں، فرمایا:

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (۲۴/ النور: ۳۱)

''اور اے پیغمبر ﷺ! ایمان والی بیبیوں سے کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگار کھول کر نہ دکھائیں، مگر جو طبعاً کھلا رہتا ہے [1] اور اپنی اوڑھنی اپنے گریبانوں (یعنی سینوں کے مقام) پر ڈال لیں اور اپنا سنگار نہ کھولیں، مگر اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے، یا اپنے شوہر کے باپ، یا اپنے بیٹوں، یا اپنے شوہر کے بیٹوں، یا اپنے بھائیوں، یا اپنے بھتیجوں، یا اپنے بھانجوں، یا اپنی عورتوں، [2] یا اپنے غلاموں یا اپنے ان مرد نوکروں کے آگے جن کو غرض نہیں، یا ان لڑکوں کے آگے جو عورتوں کے ستر کے رمز سے ابھی آگاہ نہیں اور نہ مسلمان عورتیں اپنے پاؤں سے دھمک دیں کہ جس سنگار کو وہ چھپاتی ہیں، اس کا پتہ لگ جائے اور تم سب مل کر اے مسلمانو! اللہ کے آگے توبہ کرو، شاید تم بھلائی پاؤ۔''

اور حسب ذیل ادب گو پیغمبر کی بیویوں کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے، مگر عام عورتوں کے لیے اس میں پیروی کا نمونہ ہے:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۚ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى﴾

(۳۳/ الاحزاب: ۳۲۔۳۳)

---

[1] جیسے آنکھوں کا سرمہ، ہاتھوں کی مہندی (یا) انگلیوں کی انگوٹھی، اس لیے چہرہ، ہتھیلیاں اور قدم ستر میں داخل نہیں۔

[2] یعنی سہیلیاں اور خادمائیں اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے۔ (روح المعانی، جزء ثامن عشر، ص: ۱۲۹)۔

''اے پیغمبر ﷺ کی بیویو! تم نہیں ہو جیسی ہر کوئی عورت، اگر تم (اللہ کا) ڈر رکھو، سو تم دب کر (مردسے) بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے، وہ خواہش کرے، ❶ اور نیک بات کہو اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو اور جیسے نادانی کا پہلے زمانہ میں دستور تھا ویسے اپنے کو بناؤ سنگار کر کے دکھاتی نہ پھرو۔'' ❷

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَدْخُلُوا۟ بُيُوتَ ٱلنَّبِىِّ إِلَّآ أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۳)

''اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں اس کے بدوں کہ تم کو اجازت دی جائے (کھانے کی دعوت کے لیے) داخل نہ ہو۔''

گویا حکم یہاں خاص واقعہ سے متعلق ہے، مگر حکم کا منشا نبی ﷺ کے گھروں کے ساتھ خاص نہیں، چنانچہ عفت و پاک دامنی ہی کے سلسلہ میں سورۂ نور میں اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھروں کی نسبت بھی ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَدْخُلُوا۟ بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا۟ وَتُسَلِّمُوا۟ عَلَىٰٓ أَهْلِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ ﴾ (۲٤/ النور:۲۷)

''اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں نہ جایا کرو، جب تک خبر نہ کر لو اور ان گھر والوں کو سلام نہ دے لو، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں، شاید تم یاد رکھو۔''

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زنانہ مکان سے کوئی چیز مانگے تو چاہیے کہ پردہ کے اوٹ سے مانگے، یہ نہیں کہ دھڑ دھڑا کر اندر گھس جائے، چنانچہ کاشانہ نبوی ﷺ کے تعلق سے حکم ہوتا ہے:

﴿ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَٰعًا فَسْـَٔلُوهُنَّ مِن وَرَآءِ حِجَابٍ ۚ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ۚ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۳)

''اور جب تم مانگنے جاؤ ان بیویوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردہ کی اوٹ سے، اس میں تمہارے اور ان کے دلوں کی بڑی ستھرائی ہے۔''

یہ حکم گو شان نزول کے لحاظ سے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے سلسلہ سے ہے، مگر اس میں عام مسلمان گھروں کے لیے بھی حسن ادب کا ایک نمونہ ہے۔

مسلمان عورتیں جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لیں، تاکہ ان کی زیبائش و آرائش کا ہر نقش راہ چلتوں کی آنکھوں سے اوجھل رہے اور یہ پہچان ہو کہ یہ عزت والی شریف بی بیاں ہیں، ان کو چھیڑنا تو کجا ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے، فرمایا:

---

❶ یعنی تم سے جرأت کر کے تمہارا خواہاں ہو۔

❷ التبرج: اظهار والزينة للناس الاجانب (لسان العرب، ج۱، ص: ۱۸۵)۔

﴿ يَأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۞ لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۞﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۹۔۶۰)

''اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنے اوپر تھوڑی سے اپنی چادریں نیچی لٹکا لیں، اس سے یہ ہوگا کہ وہ پہچان پڑیں گی (کہ یہ شریف ہیں) تو ان کو ستایا نہ جائے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اگر اس پر بھی منافق اور جن کے دلوں میں (بے حیائی کا) روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے نہ رکیں، تو ہم تجھے ان پر بھڑکائیں گے پھر وہ نہ رہنے پائیں گے اس شہر میں تیرے ساتھ مگر تھوڑے دن۔''

ان آیتوں میں اشارہ مدینہ کے بعض شریروں اور منافقوں کی طرف ہے، جو مسلمان بی بیوں کو جو خاص خاص ضرورتوں کے لیے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں چھیڑتے تھے اور جب انہیں اس پر ڈانٹا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ان کو لونڈی سمجھتے تھے، اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو دو حکم دیے، شریروں کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئیں تو انہی کافی سزا دی جائے، بلکہ ان کو شہر بدر کیا جا سکتا ہے اور مسلمان بی بیوں کے لیے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے باہر نکلیں تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہوں اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتوں سے اپنی پوشاک و وضع الگ رکھیں، اس کے لیے صورت یہ بتائی کہ جب گھروں سے نکلنے لگیں تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لیں، جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس، زیور اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ جائیں اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانوں کی بیبیاں ہیں، جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے لونڈیوں سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا، [1] اور لوگ اس کی کمائی کھاتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے، مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبداللہ بن ابی بن سلول اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا، مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ میں وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے، عورتیں بناؤ سنگار کر کے گھر سے باہر نکلا کرتی تھیں، سینوں کی پوشش کا لحاظ نہیں کرتی تھیں، بدکار عورتیں شراب کی محفل میں ساقی گری کرتی تھیں اور گریبان کھلا رکھتی تھیں کہ جو چاہے دست درازی کر سکے [2] اور نشان کے لیے اپنے گھروں پر جھنڈیاں لگاتی تھیں، اسلام نے آ کر ان مراسم کی اصلاح

[1] تفسیر طبری، تفسیر سورۃ نور، ج۱۸، ص: ۹۳ مصر وسنن ابی داود، کتاب الطلاق، باب فی تعظیم الزنا: ۲۳۱۱۔ [2] سبعہ معلقہ میں طرفہ کے قصیدے کا یہ شعر پڑھیے

رحيب قطاب الحبيب منها رقيقة بجس الندامىٰ بغضة المتجرد

(شرح المعلقات السبع، مطبعہ دار الکتب العربیۃ مصر، ص: ۵۸)

کی، بدکاری کے انسداد اور عفت و پاکبازی کے خیالات پھیلانے کے لیے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے، چنانچہ اس پر یہ آیت اتری:

﴿ وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (۲۴/ النور:۳۳)

''اور تمہاری لونڈیاں اگر کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہیں تو ان سے دنیا کی زندگی کے عارضی فائدہ کے لیے زبردستی بدکاری نہ کروایا کرو اور جو ان کو اس پر مجبور کرے گا تو ان کی بے بسی کے پیچھے اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔''

اس لیے اسلام نے اس کو حرام کمائیوں میں سے قرار دیا ہے، ❶ اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لیے یہ اچھا نہیں سمجھا ہے کہ ایسی پیشہ ور عورتوں کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے، کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب و ہوا زہر آلود ہو جاتی، سنن ابی داود ❷ میں ہے کہ ایک صحابی نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا اور رسول اللہ ﷺ سے اس کی اجازت چاہی، وحی الٰہی نے ان کی اس درخواست کا یہ جواب دیا:

﴿ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۡ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (۲۴/ النور:۳)

''بدکار مرد، بدکار ہی عورت یا مشرکہ عورت سے نکاح کرے گا اور بدکار عورت سے بدکردار ہی مرد یا مشرک نکاح کرے گی، ایمان والوں پر یہ حرام ٹھہرایا گیا ہے۔''

اس آیت میں انسانی فطرت کی تصویر ہے، کہ بدکار عورتوں کو اپنے قبضہ میں لانے کے لیے نکاح کا خیال بدکار ہی مردوں کے دل میں آ سکتا ہے، اسی لیے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا:

﴿ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ ﴾
(۲۴/ النور:۲۶)

''گندی عورتیں، گندے مردوں کے لیے ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔''

اسی لیے کسی بدکار مرد کا کسی عفیفہ سے اور کسی پاکباز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت میں پسندیدہ نہیں، بلکہ بعض علما کے نزدیک سرے سے جائز نہیں، ❸ اور ان کی دلیل سورۂ نور کی اوپر والی آیت کے علاوہ اس حدیث سے ہے جس کو ابوداود اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

❶ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب تحریم ثمن الکلب، وحلوان الکاهن ومهر البغی...... : ۴۰۰۹ تا ۴۰۱۴۔

❷ سنن ابی داود، کتاب النکاح، باب فی قوله: الزانی لا ینکح...... : ۲۰۵۱۔ ❸ جمہور کے نزدیک زانی کا غیر زانیہ سے، یا زانیہ کا غیر زانی سے قانوناً نکاح درست ہے لیکن اخلاقاً پرہیز کے قابل ہے اور اس آیت سے اس کی جو حرمت بظاہر سمجھی جاتی ہے، اس سے مراد اس کی برائی ہے، یا یہ کہ اہل ایمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسوں سے نکاح کریں یا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نے فرمایا: ''جس پر زنا ثابت ہو اور اس کی سزا اس کو دی گئی ہو اس کا نکاح ایسے ہی سے کیا جائے۔'' ❶

غرض اہلِ ایمان جن کی شان ستھرائی اور پاک بازی ہے، ان کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصور نہیں آنا چاہیے، چنانچہ سورۂ فرقان میں اللہ نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے، ان کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں، جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے، جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے اور جو بدکاری نہیں کرتے، فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ ﴾ (٢٥/ الفرقان:٦٨)

''اور جو اللہ برحق کے ساتھ کسی اور اللہ کو نہیں پکارتے اور کسی ایسی جان کا جس کو اللہ نے منع کیا ہے خون نہیں بہاتے اور بدکاری نہیں کرتے۔''

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے، جس کا انکار سراسر کفر ہے، اس کے بعد جو دو باتیں ہیں، ان میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری عزت وآبرو سے۔

قرآن پاک میں اس عفت وعصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں، جن کا بیان اوپر آیا ہے اور جو حقیقت میں ﴿ لاتقربوا الزنی ﴾ بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ۔ کی تشریحیں ہیں، ان کی مزید تشریح رسول اللہ ﷺ نے اپنے عام احکام اور مواعظ میں بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک صحابی کو فرمایا: ''کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب معاف ہے، مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہیں۔'' ❷ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا ایک دفعہ باریک کپڑوں میں سامنے آئیں تو فرمایا: ''اے اسماء! جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہیں۔'' ❸ حکم دیا کہ مخنث زنانخانوں میں نہ جانے پائیں، ❹ فرمایا: ''کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو کہ اس کے

(۞۞ گزشتہ سے پیوستہ) ﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ﴾ (٢٤/ النور:٣٢) اور ﴿ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ﴾ (٤/ النسآء:٣) سے منسوخ ہے یا مخصوص ہے، لیکن بعض صحابہ اور علما کا مسلک یہ ہے کہ زانی مرد کا عفیف عورت سے اور عفیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے بلکہ اگر زن وشوہر میں سے کوئی اس برائی کا مرتکب ہو تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے گا، چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں یہی فیصلہ کیا، (روح المعانی، ج ١٨، ص:٧٩) ابوداود (کتاب النکاح:٢٠٥١) کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے بعض فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ زن وشوہر میں کفو ہونا شرط ہے اور چونکہ عفیف بدکار کا کفو نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ نکاح فریقین میں سے جو عفیف ہے اس کے اعتراض کے بعد قائم نہیں رہ سکتا، ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی ہو، توبہ کرنے کے بعد جائز ہے (دیکھو احکام القرآن، ج ٣، ص:٢٦٥، ٢٦٦ وجصاص رازی وتفسیرات احمدیہ ملا جیون وتفسیر کبیر رازی ج ٦، ص:٣٢٨ وبعد بھامشہ تفسیر ابی سعود اور روح المعانی تفسیر آیت مذکورہ، ج ١٨، ص:٦٧ تا ٧٩)۔ ❶ ابو داود، كتاب النكاح، باب في قوله: الزاني لا ينكح الا زانية: ٢٠٥٢؛ احمد، ٢/ ٣٢٤۔ ❷ ترمذي، كتاب الاستئذان، باب ماجاء في نظرة الفجاءة: ٢٧٧٦، ٢٧٧٧۔ ❸ ابو داود، كتاب اللباس، باب فيماتبدي المرأة من زينتها: ٤١٠٤۔ ❹ ابو داود، كتاب الادب، باب الحكم في المخنثين: ٤٩٢٩، ٤٩٣٠۔

اہل خانہ کی بے ستری ہو۔'' ❶ فرمایا کہ ''عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے۔'' ❷ سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوشبو پاس سے گزرنے والوں میں تحریک پیدا کرے گی، یہ بھی ارشاد ہوا کہ ''عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ کنارہ چلے۔'' ❸ تاکہ مردوں کی بھیڑ بھاڑ اور دھکوں سے بچے، یہ بھی تاکید فرمائی کہ ''کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکیلا نہ جائے۔'' ❹ کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے، یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے، اگر کسی کے دروازے بند نہ ہوں یا ان پر پردہ پڑا نہ ہو اور کوئی اندر گھس گیا، تو اس کی ذمہ داری خود گھر والوں پر ہے۔ ❺

یہ ساری ہدایتیں اسی لیے دی گئی ہیں کہ مسلمان گھروں کی معاشرت عفت اور پاک دامنی کی تصویر ہو۔

لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتوں پر بس نہیں کہ بلکہ ان کے لیے جو سوسائٹی کی عزت و حرمت کو خطرہ میں ڈالیں، شرعی ثبوت کے بعد دنیا میں قانونی سزا بھی مقرر کی، تاکہ اس کا خوف لوگوں کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے:

﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾

(۲٤/ النور:۲)

''بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والے مرد ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔''

احادیث میں بیان ہے مردوں اور عورتوں (یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی) میں سے جو بدکاری میں پکڑ کر آئیں ان کو سنگسار کرنے کا بھی حکم ہے، اس جرم میں عورتوں کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے، اس لیے قرآن پاک میں ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتوں سے جن باتوں پر بیعت لی جائے، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کریں گی، فرمایا:

﴿ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ ﴾

(٦٠/ الممتحنۃ:١٢)

''اور وہ بدکاری نہ کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو مار ڈالا کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں بہتان باندھ کر لایا کریں گی۔''

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے، لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور سے عورتوں سے لی گئی، حالانکہ یہ کام مردوں کا تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی

---

❶ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی الاستئذان قبالۃ البیت:۲۷۰۷۔

❷ ابو داود، کتاب الترجل، باب فی طیب المرأۃ للخروج: ٤١٧٣ تا ٤١٧٥۔

❸ ابو داود، کتاب الادب باب فی مشی النساء مع الرجال فی الطریق:٥٢٧٢۔

❹ مسلم، کتاب السلام، باب تحریم الخلوۃ بالاجنبیۃ والد خول علیھا: ٥٦٧٣ تا ٥٦٧٧۔

❺ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی الاستئذان قبالۃ البیت:۲۷۰۷۔

طرف اشارہ ہو، ❶ یا یہ بات بھی عدم قتل کے عموم میں داخل ہو اور ہاتھ پاؤں کے بیچ میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے، جاہلیت میں ایک عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی، جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ ان میں سے کس کا لڑکا ہے، بعض عورتیں دوسرے کے بچہ کو اپنا بنا کر اپنے شوہروں کے سر تھوپتی تھیں، یہ ساری باتیں عفت اور پاک دامنی کے خلاف تھیں، اس لیے ان سے باز رکھا گیا اور خاص طور سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں، فتح مکہ کے وقت آپ نے قریشی بیویوں سے، ❷ اور مدینہ میں انصاری عورتوں سے بھی اس پر عہد لیا، ❸ بلکہ مسلمان مردوں سے ان باتوں کا عہد لیا گیا اور صحابہ نے آنحضرت ﷺ سے ان پر بیعت کی۔ ❹ دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لیے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش کرے، اگر نہ پیش کر سکے تو اس کو ایک شریف خاتون کے جھوٹ بدنام کرنے کے جرم میں اسی کوڑے مارے جائیں گے اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہو گی اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے اور گواہ نہ ہوں تو مرد قسم کھائے، ورنہ عورت قسم کھائے کہ یہ الزام غلط ہے اور اگر دونوں اپنے دعووں پر قائم رہیں، تو اسلام میں دستور یہ رہا ہے کہ اپنے دعویٰ کی سچائی پر قائم رہنے کی بنا پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا ہے۔ ❺

اسلام کی نظر میں حقوق اللہ میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے اور حقوق عباد میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناحق جان لینا ہے اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے وہ کسی کی عفت و پاک بازی کے پردہ کو چاک کرنا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ ''تم کسی کو اللہ کا شریک بناؤ حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا۔'' بولے، اس کے بعد؟ فرمایا: ''یہ کہ اپنے لڑکے کو اس خوف سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گا۔'' بولے، اس کے بعد؟ فرمایا: ''یہ کہ اپنے پڑوسی کی بی بی کے ساتھ زنا کرو۔'' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کیلئے یہ آیت نازل فرمائی: ❻

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۸)

❶ مفسرین میں صاحب روح المعانی کا بھی ادھر خیال گزرا ہے۔ (ج:۲۸، ص:۷۰) ❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، فتح مکہ اس باب میں یہ روایت نہیں ملی، البتہ یہ غزوۃ الحدیبیہ: ۴۱۸۲ کی روایت سے یہ بات ثابت ہے۔

❸ تفسیر طبری، سورۃ الممتحنۃ، ج۲۸، ص: ۴۹۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الایمان: ۱۸۔

❺ اس کی تفصیل سورۂ نور میں ہے، اس کے بعد نکاح توڑنے یا ٹوٹ جانے کا حکم نہیں مگر شروع سے عمل درآمد اسی پر رہا ہے، بخاری، کتاب الطلاق، باب اللعان: ۵۳۰۸، ۵۳۰۹۔ ❻ بخاری، کتاب الادب، باب قتل الولد خشیۃ ان یاکل: ۶۰۰۱۔

''اور جو اللہ کے ساتھ (کسی) دوسرے معبود کو نہ پکاریں اور ناحق (ناروا) کسی شخص کو جان سے نہ ماریں کہ اس کو اللہ نے حرام کر رکھا ہے اور نہ زنا کے مرتکب ہوں۔''

حدیث میں اپنے لڑکے کے مار ڈالنے اور پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت اس لیے کی گئی ہے کہ یہ دونوں جرم اپنی نوعیت میں بھی حد درجہ شرم کے قابل اور افسوس ناک ہیں کہ جن سے یہ امید نہیں ہو سکتی، ان سے یہ فعل ظہور میں آیا اور انسانی اعتماد واعتبار کو صدمہ پہنچا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پیتا ہے، چور جس وقت چوری کرتا ہے اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے لوٹتا ہے تو مسلمان نہیں رہتا۔'' [1] کیونکہ ایمان نام یقین کا ہے اور اللہ پر اور اللہ کے احکام پر یقین رکھ کر اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتا، اس حالت میں ہوتا یہ ہے کہ مجرم کے ایمان کا چراغ جذبات کی آندھی میں گل ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر جب اس کا نشہ ہرن ہوتا ہے، تو سب کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے۔

اسلام میں زانیوں کی سزا بعض حالتوں میں سو (۱۰۰) کوڑے مارنا اور بعض حالتوں میں سنگسار کرنا ہے، لیکن ان کو آخرت میں جو عذاب دیا جائے گا وہ اس سے بہت زیادہ سخت اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے، ایک روحانی خواب میں رسول اللہ ﷺ کو بہت سے لوگوں کے اخروی عذاب کی دردناک صورتیں دکھائی گئیں، ان میں بدکاروں کے عذاب کی صورت ان کے فعل قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا، جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا اور اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس میں بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتیں تھیں، جب اس آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اس کے اندر سے نکل آئیں گے، لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے، [2] یہ عالم برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا۔

اس کے بخلاف پاک باز اور پاک دامن لوگوں کے فضائل بھی نہایت مؤثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ ''قیامت کے دن جبکہ اللہ کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص وہ ہوگا، جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا، لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔'' [3]

یہ تو وہ شرف ہے جو پاک بازوں کو آخرت میں حاصل ہوگا، لیکن پاک بازی کی دنیوی برکتیں بھی کچھ کم نہیں، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے زمانہ قدیم کے تین آدمیوں کا قصہ بیان کیا ہے، جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے، کہ دفعتاً پانی برسنے لگا، تینوں نے پانی سے بچنے کے لیے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، سوئے اتفاق

[1] بخاری، کتاب الحدود، باب الزنا وشرب الخمر: ۶۷۷۲۔ [2] بخاری، کتاب الجنائز: ۱۳۸۶۔
[3] بخاری، کتاب الحدود، باب فضل من ترك الفواحش: ۶۸۰۶۔

سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منہ بند ہو گیا، اب نجات کی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمالِ صالحہ کے واسطہ سے اللہ سے دعا کریں، چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا، ان میں پاک باز آدمی کی دعا یہ تھی: ''خداوندا! میری ایک چچازاد تھی جس سے میں بہت محبت رکھتا تھا، میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، لیکن جب تک میں اس کو سو دینار نہ دے دوں وہ راضی نہ ہوئی، میں نے سو دینار کما کر جمع کیے اور اس کو دے کر اپنی خواہش نفسانی پوری کرنی چاہی، لیکن اس نے کہا کہ اللہ سے ڈرو، میں فوراً رک گیا، اللہ تعالیٰ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے صرف تیری مرضی کے لیے ایسا کیا ہے تو اس پتھر کو ہٹا لے، چنانچہ وہ سرک گیا۔'' [1]

یہ روایت عفت و پاکبازی کو ان اعمال میں شمار کرتی ہے، جن سے اللہ کا قرب ملتا اور دعا کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

---

[1] بخاري، كتاب الادب، باب اجابة دعاء من بر والديه: ٥٩٧٤ـ

دیانتداری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملوں میں جو اخلاقی جوہر، مرکزی حیثیت رکھتا ہے، وہ دیانتداری اور امانت ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایمان دار ہو اور جس کا جس کسی پر جتنا حق ہو اس کو پوری دیانت سے رتی رتی دے دے، اسی کو عربی میں امانت کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے نوع انسانی کے سپرد کیا ہے، امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۷۲)

''ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا، بے شبہ وہ ظالم اور ناداں ہے۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک الٰہی امانت ہے، جو ہم انسانوں کے سپرد ہوئی ہے، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کریں، اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو خائن ٹھہریں گے۔

اللہ کا فرشتہ جو اللہ کا پیغام لے کر اس کے خاص بندوں پر اترتا تھا، امانت سے متصف ہوتا تھا، تاکہ بندوں کے لیے جو حکم اللہ کی جانب سے آئے وہ کمی وبیشی کے بغیر اللہ کا اصلی حکم سمجھا جائے، اسی لیے قرآن میں اس فرشتہ کا نام ''الامین'' رکھا گیا ہے:

﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴾ (۲٦/ الشعرآء:۱۹۳)

''اس پیغام کو لے کر امانت والی روح اتری۔''

﴿ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۱)

''اس کا کہا مانا جاتا ہے، وہاں امانت والا ہے۔''

اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت سے یہ کہا:

﴿ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴾ (۲٦/ الشعراء:۱۷۸)

''میں تمہارے لیے امانت دار قاصد ہوں۔''

یعنی اللہ سے جو پیغام مجھے ملا ہے وہ بے کم وکاست تم کو پہنچاتا ہوں، اس میں اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہیں ہے۔

ہمارے رسول اکرم ﷺ کو نبوت سے پہلے مکہ والوں کی طرف سے ''امین'' کا خطاب ملا تھا، کیونکہ

آپ ﷺ اپنے کاروبار میں دیانت دار تھے اور جو لوگ جو کچھ آپ ﷺ کے پاس رکھواتے تھے وہ آپ جوں کا توں ان کو واپس کرتے تھے۔

نیک عمل مسلمانوں کی صفت یہ بتائی گئی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۸)

''اور جو اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔''

بعضے روایتوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کے پاس رہتی تھی، فتح مکہ کے وقت وہ اس کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی اس پر یہ آیت اتری:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ﴾ (٤/ النسآء:٥٨)

''بے شبہ تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دیا کرو۔''

اس حکم کے مطابق یہ امانت ان کو واپس کی گئی، انہوں نے سبب پوچھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ نے یہی حکم دیا ہے۔ وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ [1] بہر حال یہ واقعہ صرف شان نزول کا حکم رکھتا ہے اور معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا، اسی لیے اہل تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانتِ الٰہی بھی داخل ہے، جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیف شرعی ہے، [2] اور وہ امانت بھی داخل ہے، جس کا نام عدل وانصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے، [3] اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں، جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں، جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے، اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے، تو اس کے مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت ہے، اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے، کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے، تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے، کسی مجلس میں آپ ہوں اور کچھ باتیں آپ دوسروں کے متعلق وہاں سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے، کسی نے آپ سے اپنی کسی نجی کام میں مشورہ مانگا تو اس کو سن کر اپنے ہی تک رکھنا اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اس کو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے

[1] تفسیر کشاف زمخشری، ج ۱، ص:۲۹۷۔ [2] ایضًا۔
[3] تفسیر ابن جریر طبری، ج ٥، ص:٨٦، تفسیر آیت بالا۔

اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرالیتا ہے، یا بے سبب سستی کرتا ہے، یا دیر سے آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔ قرآن پاک اور حدیثوں میں ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے، ان مسلمانوں میں جن کو خدا نے فلاح پانے کی خوش خبری سنائی ہے، وہ بھی ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۸)

''اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول وقرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔''

پھر جن مسلمانوں کو جنت میں عزت کی جگہ دی جانے والی ہے۔ ان میں بھی وہ داخل ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴾ (۷۰/ المعارج: ۳۲)

''اور جو (اپنی) امانتوں اور اپنے قول وقرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔''

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی، یا سفر میں گواہ وشاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لے کر گروی رکھی:

﴿ فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۳)

''تو جو امین بنایا گیا اس کو چاہیے کہ اپنی امانت ادا کر دے اور چاہیے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔''

یعنی لے کر مکر نہ جائے، یا دینے میں حیلے حوالے نہ کرے، یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے، یا کسی نے ہم پر بھروسہ کر کے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اس کے اس بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں، کہ انہی چیزوں کا نام خیانت ہے، جس کی ممانعت اسلام نے برملا کی ہے:

﴿ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ (۸/ الانفال:۲۷)

''اور اپنی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین کے سفر میں دولڑکیوں کی بکریوں کے پینے کے لیے پانی بھر دیا اور اس کی کوئی مزدوری ان سے نہیں مانگی اور ان لڑکیوں میں سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی اور سفارش کی کہ ان کو نوکر رکھ لیجیے، تو اس موقع پر قرآن پاک کی آیت ہے:

﴿ يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴾ (۲۸/ القصص:۲۶)

''اے میرے باپ! اس کو نوکر رکھ لیجیے، سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور اور امانت دار ہو۔''

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لیے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے، اس سے یہ اصول بنا کہ جس کو جس

کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اس کی اہلیت کا ثبوت دے اور اس کو پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دے، اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو، وہ ایک دو گھنٹہ سستی سے چھپے چوری بے کار بیٹھا رہے، تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے، لیکن اسلام کی دوررس نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا، یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کے خلاف ہے۔

حدیثوں میں امانت کے بہت سے جزئیوں کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے، امانت کے خلاف بتایا گیا ہے اور کوئی غور سے دیکھے تو اخلاق کی رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں۔

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ اللہ کی امانت کا بوجھ انسان نے اٹھایا ہے، اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے، رسول اللہ ﷺ کے راز دار حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے دو باتیں سنی تھیں ایک کو تو آنکھوں سے دیکھ چکا، دوسری یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''امانت داری لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری ہے، (یعنی ان کی فطرت ہوتی ہے) پھر انہوں نے کچھ قرآن سے جانا، کچھ سنت سے سیکھا۔'' (یعنی فطری امانت کے جوہر میں کسب اور اچھی تعلیم سے، ترقی ہے) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر آپ نے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی بتایا، فرمایا: ''پھر یہ حال ہو گا کہ آدمی سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی اور اس کا ایک ہلکا سا نشان رہ جائے گا اور پھر سوئے گا تو امانت چلی جائے گی اور ایک آبلہ کی طرح کا داغ رہ جائے گا، جو اٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا، لوگ ایسے ہو جائیں گے کہ لین دین کریں گے، لیکن کوئی امانت داری نہیں کرے گا، اس وقت امانتداری کی مثال ایسی کم یاب ہو جائے گی کہ لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانت دار شخص ہے، آدمی کی تعریف ہو گی کہ کیسا عقل مند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے، حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری نہ ہو گی۔'' [1]

حدیث کے پہلے ٹکڑے میں انسانوں میں ایمانداری کا جوہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دین داری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے، اس کے بعد بری صحبت کے اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے اور بتایا گیا ہے، آخر زمانہ میں وہ ایسا ہی رہ جائے گا، جیسا آبلہ کا داغ رہ جائے۔

طبرانی کبیر میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں، جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس میں دین نہیں، اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! کسی بندہ کا اس وقت تک دین

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق باب رفع الامانۃ: ٦٤٩٧ وکتاب الفتن، باب اذا بقی فی حثالة من الناس: ٧٠٨٦ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانة: ٣٦٧ ومسند احمد، ج ٥، ص: ٣٨٣ وترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء فی رفع الامانة: ٢١٧٩ وابن ماجه، ابواب الفتن، باب ذهاب الامانة: ٤٠٥٣۔

درست نہ ہوگا، جب تک اس کی زبان درست نہ ہو اور اس کی زبان درست نہ ہوگی جب تک اس کا دل درست نہ ہوگا...... اور جو کوئی کسی ناجائز راہ سے کوئی مال پائے گا اور اس میں سے خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہیں دی جائے گی اور اگر اس میں سے خیرات کرے گا تو قبول نہیں ہوگی اور جو اس میں بچ رہے گا وہ اس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہوگا، بری چیز بری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی ہے، البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے۔'' ❶

حدیث کی کئی کتابوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں۔'' ❷ اور یہ ظاہر ہے کیونکہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دے سکتا ہے۔

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہیے کہ اپنی رائے ایمان داری سے دے، ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے مشورہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس سے مشورہ چاہا جائے اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے۔'' ❸ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجلس میں جو باتیں ہوں وہ امانت ہیں۔'' یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بننا چاہیے، الا یہ کہ اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((المجالس بالامانة)) یعنی ''نشستیں امانت کے ساتھ ہوں۔'' مگر تین موقعوں پر، کہیں کسی ❹ کے ناحق قتل کی، یا کسی کی آبروریزی کی، یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو، تو متعلقہ لوگوں کو اس سے آگاہ کر دینا چاہیے۔

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے، بلکہ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتیں ہوتی ہیں، وہ بھی ایسے راز ہیں، جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے، ❺ راز کے یہی معنی نہیں ہیں کہ جس کو کہنے والا راز کہہ کر ہم سے کہے، بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً ادھر ادھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے۔'' ❻ امانت میں خیانت کرنا آنحضرت ﷺ نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہے۔ ❼ مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیتا ہے تو اللہ کی مقرر کی ہوئی شرطوں کے مطابق لیتا ہے، لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے کر اس کے حقوق ادا کرنے میں کمی کرتا ہے یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے، تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی

---

❶ کنز العمال، ج ۲، ص: ۱۵ حیدر آباد از طبرانی کبیر عن ابن مسعود۔

❷ کنز العمال، ج ۲، ص: ۱۵ از طبرانی اوسط وطبرانی کبیر وابن عدی فی الکامل، وبیهقی فی شعب الایمان۔

❸ ادب المفرد بخاری، باب المستشار مؤتمن: ۲۵۶۔ ❹ ابوداود، کتاب الادب، باب فی نقل الحدیث: ۴۸۶۹۔ ❺ ایضا: ۴۸۷۰۔ ❻ ایضا: ۴۸۶۸۔

❼ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ۳۳، ۳۴۔

امانت میں خیانت کرتا ہے، حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ”عورتوں کے باب میں اللہ سے ڈرو۔“ فرمایا: ”کیونکہ تم نے ان کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت میں لیا ہے۔“ ❶

قیامت کی نشانیوں میں سے آیا ہے کہ ”سب سے پہلے اس امت سے امانت کا جوہر جاتا رہے گا اور سب سے آخر میں جو چیز رہ جائے گی وہ نماز ہوگی اور کتنے نمازی ہیں جن کی نمازوں کا کوئی حصہ اللہ کے ہاں نہیں۔“ ❷ فرمایا: ”میری امت اس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی، جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہیں سمجھے گی۔“ ❸ یعنی جو امانت سپرد کی جائے گی اس کو آمدنی اور کارِ خیر میں دینے کو جرمانہ، جب تک مسلمان نہیں سمجھیں گے ان کی فطری صلاحیت باقی رہے گی۔

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ: ۲۹۵۰۔

❷ کنز العمال، ج۲، ص: ۱۵ از طبرانی وابن مبارك وحکیم ترمذی وابن عباس۔

❸ کنز العمال، ج۲، ص: ۱۵ از سنن سعید بن منصور۔

شرم وحیا

انسان کا یہ وہ فطری وصف ہے، جس سے اس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی پرورش ہوتی ہے، عفت اور پاک بازی کا دامن اسی کی بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے، درخواست کرنے والوں کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصہ ہے، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مروت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے اور بہت سے گناہوں سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے۔

اس وصف سے متصف سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ ہے، لیکن اس کے معنی یہاں وہی ہوں گے، جو اس کی ذات اقدس کے لائق ہیں، مثلاً: یہ کہ وہ اپنے بدکار بندوں کو برائی کرتے دیکھتا ہے، لیکن ان کو پکڑتا نہیں اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے اس کو نامراد نہیں لوٹاتا، حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عزت اور جلال والے اللہ کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلائی مانگتا ہے تو وہ اس کو نامراد لوٹاتے ہوئے شرماتا ہے۔'' [1] ایک دفعہ تین صاحب مسجد نبوی ﷺ میں آئے، آپ کے ارد گرد صحابہ کا حلقہ تھا، ایک صاحب کو وہاں ذرا سی جگہ ملی اس میں بیٹھ گئے، دوسرے صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے، تیسرے صاحب چلے گئے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں ان صاحبوں کی خبر نہ دوں؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ میں آکر بیٹھا، وہ اللہ کی پناہ میں آیا تو اللہ نے پناہ کی جگہ دی اور جو پیچھے جا کر بیٹھا، وہ شرمایا اللہ نے بھی اس سے شرم کی (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا، اس نے اللہ سے منہ پھیرا، [2] تو اللہ نے بھی اس سے منہ پھیرا۔''

سورۂ بقرہ میں ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا ﴾ (۲/ البقرة:۲٦)

''اللہ کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہیں۔''

یعنی کسی حق بات کے ظاہر کرنے میں وہ شرماتا نہیں، جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ہے:

﴿ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۳)

''اللہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔''

حدیث میں بھی ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ لَايَسْتَحْيِ مِنَ الْحَقِّ)) [3]

''اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہیں۔''

قرآن اور حدیث کے اس طرز ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے، اس کی نسبت اللہ کی

---

[1] بیهقی، کتاب الاسماء والصفات، باب ماجاء فی الاستحیاء، ص:۳٤٠۔
[2] بخاری، کتاب العلم، باب من قعد حیث ینتهی به المجلس:٦٦ وصحیح مسلم، کتاب السلام، باب من اتی مجلسا فوجد فرجة:٥٦٨١۔ [3] بخاری، کتاب الادب، باب مالا یستحیا من الحق:٦١٢١۔

طرف اللہ کی غیرت وحیا کے خلاف ہے، حدیث میں آتا ہے: ''اللہ سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اسی لیے اس نے بدکاریوں کو حرام کیا ہے۔'' ❶

موسیٰ علیہ السلام کو مدین کے سفر میں جن دولڑکیوں سے سابقہ پڑا تھا، وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں، تاہم یہ وصف ان میں ایسا نمایاں تھا کہ اللہ نے بھی اس کا ذکر کیا، ان کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر پلٹ نہ جاتے، وہ اپنے مویشیوں کو پانی نہیں پلاتی تھیں، تاکہ مردوں کی کشمکش سے الگ رہیں اور جب ان کے باپ نے ان میں سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بلانے کے لیے بھیجا۔

﴿ فَجَآءَتْهُ إِحْدَىٰهُمَا تَمْشِي عَلَى ٱسْتِحْيَآءٍ ﴾ (۲۸/ القصص:۲۵)

''تو ان دولڑکیوں میں سے ایک شرماتی ان کے پاس آئی۔''

اس آیت میں واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیا والی لڑکی کی مدح وستائش بھی مقصود ہے۔

یہ وصف انسان میں بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے اور اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے، بلکہ بڑھتا جاتا ہے اور اگر بری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگوں کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا ہے، اس لیے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا، سترِ عورت کا خیال، نگاہیں نیچی رکھنا، بے حیائی کی باتوں کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا، برہنگی کو منع کرنا، یہاں تک کہ غسل خانہ اور خلوت میں بھی اس کی اجازت نہ دینا، اسی لیے ہے کہ آنکھیں شرم کے منظر سے جھینپتی رہیں، اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی، تو رفتہ رفتہ انسان پکا بے حیا بن جائے گا۔

آنحضرت ﷺ جب بچہ تھے تو خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا، آپ اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے، آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا، تم تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو کہ اینٹ کی رگڑ نہ لگے، آپ نے ایسا کیا تو آپ پر بیہوشی طاری ہوگئی، ہوش آیا تو زبان مبارک پر تھا، میرا تہبند، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے تہبند باندھ دیا، ❷ نبوت کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ صحابہ کہتے ہیں:

كان النبي ﷺ اشد حياء من العذراء في خدرها. ❸

''رسول اللہ ﷺ پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔''

بعض موقعوں پر آپ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی، مگر شرم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے، جیسا کہ سورۂ احزاب میں مذکور ہے:

﴿ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي ٱلنَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِۦ مِنكُمْ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۳)

❶ صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب غيرة الله تعالىٰ: ٦٩٩١ تا ٦٩٩٥ عربی میں غیرت کا لفظ حیا سے خاص ہے مگر اس موقع پر اللہ کے تعلق سے اس کے معنی کچھ حیا کے قریب قریب سے ہو جاتے ہیں غیرت کے اصلی معنی رقابت سے ملتے جلتے ہیں، جو محبت میں شرکت کو نہیں چاہتی۔ ❷ بخاری، کتاب الحج، باب فضل مكة وبنيانها: ١٥٨٢۔

❸ بخاری، کتاب الادب، باب الحياء: ٦١١٩۔

''تمہاری اس بات سے رسول کو ایذا پہنچتی تھی تو تم سے وہ شرماتا تھا۔''

حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے، تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لیے اس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے، جب اس میں بزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم وحیا کی وجہ سے نہیں کر سکتا، بلکہ بعض حالتوں میں اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے، اس لیے حیا کی حقیقت میں بزدلی کا جو جزو شامل ہے، شریعت مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے اور وہ یہ ہے کہ امر حق کے اظہار میں شرم و حیا دامن گیر نہ ہو، لیکن دوسروں کی مروت سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے، جو ایک معنی میں تعریف کے قابل ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیادار تھا، اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا، اس کا بھائی اس پر ناراضی کا اظہار کر رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: ''اس پر غصہ نہ کرو کیونکہ حیا ایمان سے ہے۔'' [1]

یہی حیا جو ایمان کا ایک جزو ہے شرعی حیا ہے، یعنی جس طرح ایمان کا اقتضا یہ ہے کہ تمام فواحش ومنکرات سے اجتناب کیا جائے، اسی طرح حیا بھی انسان کو ان چیزوں سے روکتی ہے، اس لیے وہ دونوں ایک ہی ہیں، لیکن جن لوگوں میں فطرۃً حیا کا مادہ ہوتا ہے، ان کو اس شرعی حیا کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے، اس لیے بذات خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہیں، بلکہ اصلاح کے قابل ہے اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک اظہار حق، وعظ و پند، تبلیغ ودعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے، حیا کے طبعی ضعف کو دور کر دیا جائے اور شریعت نے ان موقعوں پر اسی ضعف کو دور کیا ہے، مثلاً: اللہ نے قرآن مجید میں جا بجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر کیا ہے، جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالت شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے، اللہ نے فرمایا: کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندوں کے فائدہ کی ہے تو اس کے کہنے سے اللہ نہیں شرماتا، یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہیں چھوڑ دیتا، فرمایا:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶)

''اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں (ذرا بھی) نہیں شرماتا (چاہے وہ مثال) مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور حقیر چیز کی)۔''

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی دعوت ولیمہ میں صحابہ کرام کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، جس سے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف تو ہو رہی تھی، لیکن فطری حیا کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے، تاہم چونکہ لوگوں کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آداب نبوت کے خلاف تھا، اس لیے خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ ۖ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۵۳)

[1] بخاری، کتاب الادب، باب الحیاء:۶۱۱۸۔

''اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی اور وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے اور اللہ تو حق (بات کے کہنے) میں (کسی کا کچھ) لحاظ کرتا نہیں۔''

اپنی ذاتی تکالیف کے لیے لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دینا، رسول اللہ ﷺ کی خوش خلقی اور مروت کے خلاف تھا، اس لیے آپ کو اس سے شرم آتی تھی، تاہم اس طرح بیٹھ جانا آدابِ مجلس کے خلاف تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ٹوکا کہ اخلاق وآداب کی تعلیم دینے میں شرم وحیا کا موقع نہیں۔ یہی حیا تھی جس نے ان مواقع پر صحابہ کرام کو نہایت دلیر، بے جھجک اور آزاد بنا دیا تھا، ایک صحابیہ آپ ﷺ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم وحیا کے خلاف ہے، تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے پہلے کہہ دیتی ہیں کہ یا رسول اللہ! اللہ حق بات سے نہیں شرماتا، کیا عورت پر جنابت کا غسل فرض ہے؟

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کی مثال ایک ایسے سرسبز درخت کی ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی۔'' اکابر صحابہ اس درخت کا نام بتانے سے قاصر رہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے، تاہم چونکہ کمسن تھے، اس لیے شرم سے چپ رہے، لیکن چونکہ یہ شرم وحیا کا موقع نہ تھا اور علمی مجالس میں آزادی کی ضرورت تھی، اس لیے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے انہوں نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا، کہ اگر تم اس درخت کا نام بتا دیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ [1] انصار یہ عورتیں رسول اللہ ﷺ سے عورتوں کے مسئلے پوچھتی تھیں اور یہ ان کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

نعم النساء نسآء الانصار لم یکن یمنعھن الحیاء ان یتفقھن فی الدین. [2]

''انصار کی عورتیں کس قدر اچھی تھیں کہ دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو حیا نہیں روکتی تھی۔''

ان موقعوں یعنی تبلیغ ودعوت، پند ونصیحت، ارشاد وہدایت، تعلیم وتعلّم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیا انسان کا ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جس سے اس کو فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((الحیاء لایاتی الابخیر)) [3]

''حیا سے صرف بھلائی پہنچتی ہے۔''

اور جس شخص کو کسی برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، اس کا نام آزادی اور دلیری نہیں ہے، بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے، کیونکہ یہی جذبہ حیا ہے جو انسان کو برائیوں سے باز رکھتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو پھر بے حیا ہو کر انسان جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی روک نہیں سکتا، اس لیے فرمایا کہ

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب مالا یستحی من الحق للتفقه فی الدین: ٦١٢٢۔ [2] مسلم، کتاب الحیض، باب استحباب استعمال المغتسلة من الحیض فرصة من مسك فی موضع الدم: ٧٥٠۔

[3] بخاری، کتاب الادب، باب الحیاء: ٦١١٧۔

((ان مما ادرك الناس من كلام النبوة الاولىٰ اذالم تستح فاصنع ماشئت)) [1]

''لوگوں نے پرانے پیغمبروں کی جو باتیں پائی ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ اگر تم میں شرم و حیا نہیں تو جو چاہو کرو۔''

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ [2] نے اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کر سکتے ہو۔ قرآن و حدیث میں جہاں جہاں فحش، منکر اور سوء وغیرہ کے لفظ آئے ہیں، ان سے بے حیائی کے یہی سب کام مراد ہیں اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کے ساتھ ان تمام کاموں سے روکا ہے کہ حیا اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے، اسی بنا پر حدیث شریف میں آیا ہے کہ ''ہر دین کا ایک خاص خلق ہوتا ہے اور اسلام کا خاص خلق حیا ہے۔'' [3] یہ بھی فرمایا: ''ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔'' [4] فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہاں تک کہ تنہائی کی حالت میں بھی شرم و حیا کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''برہنگی سے بچو، کیونکہ تمہارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہیں جو صرف بول و براز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں، تو ان سے شرماؤ اور ان کا خیال رکھو۔'' [5] مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھوں سے گرنے نہ پائے۔

[1] بخاری، کتاب الادب، باب اذا لم تستح فا صنع ما شئت: ٦١٢٠۔ [2] فتح الباری، ج ١٠، ص: ٤٣٤۔

[3] موطا امام مالك، کتاب حسن الخلق، باب ماجاء في الحياء. ١٦٧٨۔

[4] صحيح بخاری، كتاب الايمان، باب امور الايمان: ٩۔

[5] ترمذی، ابواب الادب، باب ما جآء في الاستتار عند الجماع: ٢٨٠٠۔

رحم

رحم بھی انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے، دنیا میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی معاوضہ کا خیال کیے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہیں، ان کو کرید کرد یکھیے تو سب کی تہہ میں رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا، جس کے دل میں اس جذبہ کا کوئی ذرہ نہ ہوگا، اس سے دوسروں کے ساتھ بے رحمی، ظلم سنگدلی اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو وہ کم ہے، اسی لیے اسلام کی اخلاقی تعلیم میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور عام ہے، وہ رحمٰن یعنی ''بڑا رحم والا'' ہے، اسی کے ساتھ دوسرا نام ''رحیم'' آتا ہے، ''یعنی رحم سے بھرا ہوا، قرآن پاک میں پہلا نام ایک طرح سے اللہ کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے، مسلمان کو حکم ہے، جب وہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمٰن ورحیم اللہ کا نام لے، ہر سورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہے، دنیا میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی رحمت کے جلوؤں کے سوا کچھ اور نہیں ہے، اللہ کے فرشتے اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں:

﴿ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا ﴾ (۴۰/ المؤمن:۷)

''اے ہمارے پروردگار! تو نے اپنی رحمت اور علم میں ہر چیز کو سما لیا ہے۔''

اس رحمتِ الٰہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، بلکہ

﴿ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾ (۵۹/ الحشر:۲۲)

''وہی رحم والا مہربان ہے۔''

مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ دعاؤں میں کہیں:

﴿ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۰۹)

''اور تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔''

دنیا میں رحم و کرم کے جو آثار پائے جاتے ہیں، وہ اسی رحمت کے آثار اور پرتو ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''اللہ نے رحمت کے سو (۱۰۰) ٹکڑے کیے، جن میں سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لیے اور زمین پر صرف ایک ٹکڑے کو اتارا اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں، یہاں تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے۔'' [1]

بنی نوعِ انسان میں محاسنِ اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبروں کی ذات ہے اور پیغمبروں میں سب سے اعلیٰ واشرف ہستی رسول اللہ ﷺ کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی وصف کے ساتھ متصف کیا ہے:

﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ

[1] بخاری، کتاب الادب، باب جعل اللہ الرحمۃ فی مائۃ جزء: ۶۰۰۰۔

رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (۹/ التوبة:۱۲۸)

''(لوگو)! تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آئے ہیں، تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے (اور) ان کو تمہاری بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں پر بہت شفیق (اور) رحیم ہیں۔''

پیغمبروں کے بعد اگلے پیغمبروں کی امتیں ہیں اور ان امتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے:

﴿وَجَعَلْنَا فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً﴾ (۵۷/ الحدید:۲۷)

''اور جو لوگ ان کے پیرو ہوئے ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔''

اور اس وصف میں امت محمدیہ بھی ان کی شریک وسہیم ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (۴۸/ الفتح ۲۹)

''اور جو لوگ محمد ﷺ کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر زور آور ہیں، آپس میں رحمدل ہیں۔''

آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے، اس کو صلۂ رحم کہتے ہیں، کیونکہ قرابتوں کے سارے رشتے رحم مادری سے پیدا ہوتے ہیں اور رحم اور رحمٰن جو اللہ کا نام ہے، ایک ہی اصل سے مشتق ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحمٰن) اللہ کی رحمت کا پرتو ہے اور اسی سے صلۂ رحم کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہے، حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((الرحم شجنة من الرحمن)).

''رحم، رحمٰن کی جڑ سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے۔'' ❶

یعنی قرابت کی رحمدلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمٰن کی ذات ہے اور ساری رحم دلیوں کے جذبے اس کی شاخیں ہیں، بچوں کی محبت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک زانو پر مجھ کو اور دوسرے زانو پر امام حسن رضی اللہ عنہ کو بٹھا لیتے تھے، پھر دونوں کو ملا کر کہتے تھے کہ ''اللہ ان دونوں پر رحم کر کیونکہ میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں۔'' ❷

ایک بار ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس کو لپٹانے لگا، آپ ﷺ نے یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ ''تم اس پر رحم کرتے ہو؟'' اس نے کہا: ہاں۔ ارشاد ہوا کہ ''اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔'' ❸

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بوسہ لیا، اقرع بن حابس جو ایک درشت خو بدو تھے،

❶ بخاری، کتاب الادب، باب من وصل وصله الله:۵۹۸۸۔ ❷ بخاری، کتاب الادب، باب وضع الصبی علی الفخذ:۶۰۰۳۔ ❸ ادب المفرد، باب رحمة العیال: ۳۷۷۔

پاس بیٹھے ہوئے تھے، بولے کہ میرے دس بچے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا، آپ ﷺ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ''جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔''

ایک اور بدو نے آپ سے کہا کہ آپ لوگ بچوں کو چومتے ہیں، لیکن ہم لوگ نہیں چومتے، ارشاد ہوا کہ ''اللہ نے جب تمہارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے۔'' [1]

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹوں پر ترس کھانا امت محمدیہ کا ایک عنصر ہے، اس لیے فرمایا کہ ''جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔'' [2] اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ رحم ہمیشہ چھوٹوں اور زیر دستوں پر کھایا جاتا ہے، تو اس حدیث کی وسعت صرف عمر کے چھوٹوں تک نہیں، بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹوں تک وسیع ہے۔ خود اپنی قوم کی ہمدردی، محبت اور اعانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے، اسی لیے قرآن مجید نے صحابہ کرام کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہے: ﴿ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ یعنی ''وہ لوگ آپس میں رحم دل ہیں۔''

اور حدیث میں اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال میں بیان کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ مسلمانوں کی باہمی رحم دلی و باہمی دوستی اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو درد، دکھ پہنچتا ہے تو تمام جسم متاثر ہو جاتا ہے، [3] جس کے معنی یہ ہیں کہ جذبہ رحم نے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے مسلمانوں کو اس قدر متحد کر دیا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ایک جسم ہو گئے ہیں اور انفرادی طور پر مسلمانوں کے تمام افراد اس جسم کے اعضاء اور جوارح ہیں، اس لیے جس طرح ایک عضو کے درد، دکھ میں تمام جسم شریک ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک مسلمان کے درد، دکھ میں تمام مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیے۔ اسلام نے جس رحمدلی کی تعلیم دی ہے، وہ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور اس میں تمام بنی نوع انسان شامل ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں عام رحم کی تعلیم دی ہے اور فرمایا ہے کہ ''جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرے گا۔'' یہ بھی فرمایا کہ ''رحم کرنے والوں پر، رحم کرنے والا اللہ رحم کرے گا، زمین والوں پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔'' [4]

رحمدلی کی یہ تعلیم صرف بنی نوع انسان ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں بے زبان جانور بھی شامل ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کرے گا، تو اللہ قیامت کے دن اس پر رحم کرے گا۔'' [5] ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر ترس آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں، آپ ﷺ نے دو بار فرمایا کہ ''اگر تم بکری پر رحم کرتے

[1] بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد و تقبيله و معانقته: ٥٩٩٧، ٥٩٩٨۔

[2] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الصبيان: ١٩١٩۔

[3] بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠١١۔ [4] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی رحمة الناس: ١٩٢٤۔ [5] ادب المفرد، باب ارحم من فی الارض: ٣٧٣۔

ہوتو اللہ بھی تم پر رحم کرے گا۔'' ❶ جانوروں کے لڑانے کا جو بے رحمانہ طریقہ جاری ہو گیا تھا اور اب بھی جاری ہے، وہ اس رحم دلی کے بالکل مخالف تھا، اس لیے اسلام نے اس تفریحی مشغلہ کو ناجائز کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی۔

اس عام رحمدلی کی تعلیم رسول اللہ ﷺ نے دو ایسے مختصر اور جامع لفظوں میں دی ہے، جو بلاغت کی جان ہیں، فرمایا:

((مَنْ لَا یَرْحَمْ لَا یُرْحَمْ)) ❷

''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔''

ان دو لفظوں کی تشریح دفتروں میں نہیں سما سکتی، رحمدلی کا ہر منظر اور شفقت وکرم کا ہر جذبہ انہیں دو لفظوں سے ابھارا جا سکتا ہے، اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ بھی رحم نہیں فرمائے گا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کھاتا تو دوسرے بھی اس پر رحم نہیں کھائیں گے، محدث ابن بطال نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ''اس میں تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اس لیے اس میں مسلمان، کافر، مملوکہ اور غیر مملوکہ جانور سبھی داخل ہیں اور ان کے کھانے پینے کی نگرانی کرنا، ان پر ہلکا بوجھ لادنا اور ان کو بہت نہ مارنا یہ سب چیزیں اسی رحم میں شامل ہیں۔'' ❸ غرض یہی وہ چیز ہے جس سے ہم یتیموں کی غمخواری، بے کسوں کی تسکین، بیماروں کی تسلی، غریبوں کی امداد، مظلوموں کی حمایت اور زیر دستوں کی اعانت کرتے ہیں اور اس حدیث کے حکم کا وسیع دائرہ ان سب کو گھیرے ہے، اس لیے مبارک ہیں وہ جو رحم کرتے ہیں، کہ ان پر رحم کیا جائے گا۔

---

❶ ادب المفرد:۳۷۳۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم:۶۰۱۳۔

❸ فتح الباری، ج ۱۰، ص:۳۶۸۔

عدل وانصاف

کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو، تو اس کو عربی میں ''عدل'' کہتے ہیں، [1] اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں، یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے، اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل وانصاف کا پلہ بھی کچھ کم بھاری نہیں۔

عدل سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں، ان میں ایک عدل (عدل والا) بھی ہے، علما نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ ''اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے، وہ حق بات کہتا ہے اور وہی کرتا ہے جو حق ہے۔'' [2] قرآن پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دہرائی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ﴾ (۴۰/ المؤمن:۲۰)

''اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔''

یہ عدل عملی کی طرف اشارہ ہے، دوسری آیت میں ہے:

﴿ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۴)

''اور اللہ حق بات کہتا ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کے عدل قولی کو ظاہر کرتا ہے اور یہ دونوں باتیں قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں یک جا ہیں:

﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ﴾ (۶/ الانعام:۱۱۶)

''اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہوگئی۔''

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے بل بوتے پر قائم ہے، وہ اپنی تمام مخلوقات میں اپنی شہنشاہی پورے انصاف کے ساتھ قائم کیے ہوئے ہے اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۸)

''اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی اور اللہ نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے، وہی اللہ

[1] مفردات راغب اصفہانی: ۳۲۷۔

[2] کتاب الاسماء والصفات بیہقی، ص: ۶۱ الہ آباد۔

انصاف کو لے کر کھڑا ہے۔‘‘

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل و انصاف صرف نظم و سلطنت ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل کی ضرورت ہے اور نظامِ عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت میں جن اچھی باتوں کا حکم دیا ہے، ان میں سب سے پہلے عدل و انصاف ہی کرنے کا حکم ہے، فرمایا:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ ﴾ (١٦/ النحل:٩٠)

’’بے شبہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔‘‘

عدل قانون کا اقتضا ہے اور احسان کرنا اور درگزر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے نظمِ عالم کو قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے اور اس کے بعد احسان کی تاکید کی ہے، جس سے اشخاص کی روحانی تکمیل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ سارے عالم کی نگہداشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل کے فرض سے زیادہ اہم ہے، پھر اسی مجمل تعلیم پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ زندگی کے اہم شعبوں کو لے کر ان میں عدل و انصاف کا حکم دیا ہے۔ مثلاً: معاشرتی زندگی میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے، جو ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرتے ہیں، اس لیے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

﴿ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ﴾ (٤/ النساء:٣)

’’پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیبیوں میں) انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی (بی بی کرنا) یا جو (لونڈی) تمہارے قبضے میں ہو۔‘‘

عورتوں کی طرح یتیموں کے حقوق کے لیے بھی عدل و انصاف کی ضرورت ہے، اس لیے فرمایا:

﴿ وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ ﴾ (٤/ النساء:١٢٧)

’’اور (خاص کر) یہ کہ یتیموں کے حق میں انصاف کو ملحوظ رکھو۔‘‘

عام معاملات میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید و فروخت میں وزن و پیمانہ میں ہے، اس لیے فرمایا:

﴿ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ﴾ (٦/ الانعام:١٥٢)

’’اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری) ناپ کرو اور (پوری پوری) تول۔‘‘

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول میں بے انصافی نہ کی جائے، کیونکہ خرید و فروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے، اس لیے وزن و پیمانہ میں کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے، وہ نہایت عام و وسیع ہے، اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار میں کمی

کرنے سے انسان کی سخت دناءت ثابت ہوتی ہے اور اس سے روح میں سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے۔

عدل وانصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات میں ہوتی ہے اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل وانصاف کا لحاظ رکھا ہے، تحریر دستاویز کے متعلق حکم ہے کہ

﴿ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ﴾ (۲/ البقرة:۲۸۲)

''اور (تمہارے باہمی قرارداد کو) کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے۔''

﴿ فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ﴾ (۲/ البقرة:۲۸۲)

''پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا، اگر وہ کم عقل ہو یا معذور یا خود ادائے مطلب نہ کرسکتا ہو تو (جو) اس کا مختار کار (ہو وہ) انصاف کے ساتھ (دستاویز کا) مطلب بولتا جائے۔''

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہو یا اس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو، لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت میں بھی عدل وانصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہیں رکھتی:

﴿ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ﴾ (٦/ الانعام:١٥٢)

''اور (گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے) جب بات کہو تو گو (فریق مقدمہ اپنا) قرابت مند ہی (کیوں نہ) ہو انصاف (کا پاس) کرو۔''

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ﴾ (٥/ المائدة:٨)

''مسلمانو! خدا واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آمادہ رہو اور لوگوں کی عداوت تم کو اس جرم (کے ارتکاب) کی باعث نہ ہو کہ (معاملات میں) انصاف نہ کرو (نہیں ہر حال میں) انصاف کرو کہ (شیوہ) انصاف پرہیز گاری سے قریب تر ہے۔''

پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ تمہاری باہمی دوستی ومحبت تم کو بے انصاف نہ بنائے اور دوسری آیت میں یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے اور یہ کہ ہر حال میں عدل وانصاف کرنا تقویٰ کی نشانی ہے۔

یہود اور نصاریٰ اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے، اس پر بھی رسول اسلام علیہ السلام کی زبان مبارک سے وحی الٰہی یہ کہلواتی ہے:

﴿ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا

﴿ أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴾

(٤٢/ الشوریٰ:١٥)

''اور کہہ دے کہ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ نے اتاری اور مجھے (اللہ سے) یہ حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں، اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا، ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملنا ہے اور تم کو تمہارے کاموں کا، ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں، اللہ ہی سب کو جمع کرے گا، اسی کی طرف (سب کو) پھر جانا ہے۔''

جس عدل اور برابری کا حکم اس آیت پاک میں ہے، اس کے کئی پہلو ہیں، ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچتی ہے، اس کو میں برابر برابر تم سب کو پہنچادوں، دوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمہارے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے، بلکہ وہ کیا جائے جس کا تقاضا عدل وانصاف کرتا ہے اور تیسرا یہ کہ اب تک تم میں مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری ہے کہ دولت مندوں اور عزت والوں کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگوں کے ساتھ سختی کا قانون برتا جائے، میرے اللہ نے ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ عام وخاص اور امیر و غریب سب کے ساتھ یکساں اور برابری کا سلوک کیا جائے، کیونکہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے، ہم سب اس کے غلام ہیں، اس لیے اس کے سب غلاموں کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیے، ہم کو ہمارے اعمال اور تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا، اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں، سب کو قیامت میں اس مالک کے سامنے پیش ہونا ہے، جس کا کام اس کو پسند آئے گا اس کو ویسا انعام ملے گا اور اگر برا کام کیا ہو تو ویسی ہی سزا ملے گی۔

عدل وانصاف کی راہ میں ان دونوں سے بھی زیادہ ایک کٹھن منزل ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی عدل وانصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، محمد رسول اللہ ﷺ کی پاک تعلیم کی روشنی میں اہلِ ایمان کو اس کٹھن منزل کی راہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے، ارشادِ الٰہی ہوا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴾ (٤/ النساء:١٣٥)

''اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو، اللہ کے لیے گواہ بنو، اگر چہ تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو، یا ماں باپ کا، یا رشتہ داروں کا اگر وہ دولت مند ہے یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو، اگر تم زبان ملو گے یا کچھ بچاؤ گے تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔''

ان آیتوں میں عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے، کہا گیا کہ معاملات

میں عدل وانصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو، جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو اور اللہ واسطے کہو، عدل وانصاف کے فیصلہ اور گواہی میں نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ میں آئے، نہ عزیزوں اور قرابت داروں کا، نہ دولت مند کی طرف داری کا، نہ محتاج پر رحم کا، پھر اس فیصلہ اور گواہی میں کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے، نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچا لیا جائے، مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی میں دولت مند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ اور قرابت کو بھی نہ دیکھو، جو حق ہو وہ کر دیا کہو، پھر سچ کہنے میں کوئی توڑ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہ میں پڑ جائے، یا پوری بات نہ کہو، کچھ چھپا لو، تو یہ سب باتیں عدل اور انصاف کے خلاف ہیں، کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ میں ردو بدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے، مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے، فیصلہ میں ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے، جیسا کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے۔ غرض یہ ہے کہ عدل وانصاف کی راہ میں کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لیے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے۔

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرف دارانہ گواہی دیتا ہے وہ غلطی میں مبتلا ہے، اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہیں ہوسکتا، اس لیے نہ گواہوں کو اس لیے طرف داری کرنی چاہیے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرف داری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل میں لانا چاہیے، بلکہ دونوں کو اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا چاہیے کہ وہی ان کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر ولی ہے۔ لوگ عدل وانصاف کے فیصلہ یا گواہی میں اسی لیے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرف داری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے، تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر اور غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، تمہاری کم بین نظر تو آس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب کچھ ہے، وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندوں کے ساتھ وہ کرتا ہے، جس میں ان کی بھلائی ہے، غور کیجیے کہ ان لفظوں میں عدل وانصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے، کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی میں کسی خاص انسان کی بھلائی کے لیے جھوٹ بولتا ہے یا غلط فیصلہ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا، حالانکہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لیے کیا چیز مفید ٹھہرے گی، پھر ایک اور حیثیت سے دیکھیے کہ بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرف داری سے فائدہ پہنچا بھی دیا تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے اس طرح حقیقت میں سچائی کا خون کر کے نظم عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی اور ظلم کی بنیاد رکھی، جس سے عالم کے امن وامان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ غلط گو انسان کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع ونقصان کا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے، جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہے۔ اسی لیے رشوت دے کر حاکموں کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں گناہ ہے اور بعض مفسروں کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت میں:

﴿ وَتُدْلُوا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۸۸)

''اور نہ مال حاکموں تک پہنچاؤ، تا کہ لوگوں کے مال میں سے گناہ کما کر کچھ کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔''

اس رشوت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ [1]

دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے، اس لیے اس میں بھی عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے اور کس حالت میں دیا گیا ہے جب دونوں طرف سے تلواریں میان سے نکل چکی ہوں اور ایک دوسرے کے سر و سینہ پر تڑپ تڑپ کر گر رہی ہوں، یعنی اس وقت جب عقل کی قوت اور نیکی کی استعداد کا چراغ جذبات کی آندھیوں میں بجھ رہا ہو، اس عالم میں بھی مسلمانوں سے یہی کہا گیا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹے، فرمایا:

﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ (۴۹/ الحجرات:۹)

''اور اگر (تم) مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو، پھر اگر ان میں کا ایک (فرقہ) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے اس سے تم (بھی) لڑو یہاں تک کہ وہ حکم اللہ کی طرف رجوع کرے، پھر جب رجوع لائے تو دونوں میں برابری کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کو ملحوظ رکھو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔''

عدل و انصاف حکومت و سلطنت کی عمارت کا ستون ہے، اسی لیے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کے لیے عدل کو ضروری قرار دیا ہے کہ اگر نہ ہو تو کسی مظلوم کی دادرسی ممکن ہی نہیں، اسی لیے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عادل ہو، ارشاد ہوا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ ﴾ (۴/ النسآء:۵۸)

''بے شک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچاؤ اور یہ کہ جب لوگوں کے درمیان جھگڑے فیصل کرنے لگو، تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

اہل تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت پاک میں ''امانت'' سے مراد منصفانہ فیصلہ اور وہ منصفانہ حق ہے

[1] تفسیر روح المعانی، ج ۲، ص:۶۰۔

جوایک کا دوسرے پر چاہیے، اللہ نے اس آیت میں اسی منصفانہ فیصلہ اور حق کی امانت کو حق دار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہے اور یہ فیصلہ دوست و دشمن، کافر و مسلم سب کے ساتھ یکساں عدل و انصاف کے ساتھ ہونا چاہیے، چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کو یہودیوں کے معاملات میں حکم ہوا:

﴿ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٤٢)

''اور اگر فیصلہ کرو تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

عدل و انصاف کی برتری کی یہ اہمیت لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل و انصاف کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ اپنی دوستی اور محبت سے نوازنے کی بشارت سناتا ہے۔

اخلاق کے ساتھ یہ مسئلہ سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے، یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے، اس کے لیے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے، قرآن مجید میں اگرچہ اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے، تاہم اشارات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو، اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو، قوت نطق سے محروم نہ ہو، صاحب علم ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۝ ﴾

(١٦/ النحل:٧٦)

اور اللہ (ایک دوسری مثال دیتا ہے کہ) دو آدمی (ہیں) ان میں کا ایک گونگا (اور گونگا ہونے کے علاوہ پرایا غلام کہ خود) کچھ نہیں کر سکتا اور (گونگے ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بارِ خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اس کو بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا ہے، کیا ایسا غلام اور وہ شخص (دونوں) برابر ہو سکتے ہیں جو (لوگوں کو) عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر ہے۔''

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے، اس کو صفت نطق سے متصف ہونا چاہیے، ورنہ وہ حکم نہ دے سکے گا اور قادر ہونا چاہیے کیونکہ حکم سے علوئے مرتبت کا اظہار ہوتا ہے اور جب تک وہ قادر نہ ہو علوئے مرتبت حاصل نہیں ہو سکتا اور عالم ہونا چاہیے، تاکہ ظلم و انصاف میں تمیز کر سکے، اس سے ثابت ہوا کہ عدل و انصاف کی صفت قدرت اور علم دونوں کو شامل ہے، پہلا شخص گونگا ہے تو دوسرے کو گویا ہونا چاہیے، پہلا شخص کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتا تو دوسرے کو صاحب قدرت ہونا چاہیے، پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک بن نہیں آتا، اس لیے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہیے، تاکہ وہ ہر کام کو سلیقہ سے کر سکے۔

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل و انصاف کا جو حکم دیا ہے وہ اخلاق، معاشرت اور سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے، یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر اسلام کی یہ اخلاقی تعلیم حاوی نہ ہو۔

ان آیات کی رو سے اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہیے، تاہم امام و حاکمِ وقت کے لیے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے، اس لیے حدیث میں امامِ عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''قیامت کے دن جبکہ اللہ کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا، سات شخصوں کو اللہ اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص امامِ عادل ہوگا۔'' [1]

---

[1] بخاری، کتاب المحاربین، باب فضل من ترك الفواحش:٦٨٠٦۔

عہد کی پابندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول وقرار کرلیا جائے اس کو پورا کرنا ایک راست باز کا شعار ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران: ۹، ۱۳/ الرعد: ۳۱)

''بے شبہ اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

﴿ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ الْمِيعَادَ ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر: ۲۰)

''اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

﴿ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۹٤)

''(اے ہمارے پروردگار) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

﴿ وَعْدَ اللَّهِ ۖ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ ﴾ (۳۰/ الروم: ٦)

''اللہ کا وعدہ ہوا ہے، اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔''

﴿ وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۚ ﴾ (۲۲/ الحج: ٤۷)

''اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ۔''

﴿ فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۸۰)

''تو البتہ اللہ اپنے قول وقرار کے خلاف نہ کرے گا۔''

﴿ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۱۱۱)

''اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔''

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں اور جو قول وقرار کریں اس کے پابند رہیں، سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے، مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ منہ سے جو کہے وہ اس کو پورا نہ کرے اور کسی سے جو قول وقرار کرے اس کا پابند نہ رہے۔

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول وقرار کے سمجھتے ہیں، لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع ہے، وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے، جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے، اسی لیے قرآن مجید میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے، ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ میں ہے:

﴿ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''اور اپنے قول وقرار کو جب قول دیں پورا کرنے والے۔''

بعض آیتوں میں اس کامل الایمان مسلمانوں کے مخصوص اوصاف میں شمار کیا گیا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۸)

''اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں۔''

ایک دوسری سورہ میں جنتی مسلمانوں کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اس تصویر کا ایک رخ یہ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ ﴾ (۷۰/ المعارج:۳۲)

''اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔''

کسی کی امانت کو رکھ کر بلا کم و کاست ٹھیک وقت پر ادا کر دینا، معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے، جو عہد کے وسیع معنی میں داخل ہے، اس لیے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذکر کیا اور اس کے بعد عہد کا عام ذکر کیا، یعنی تاکیداً پہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مسلمانوں کا مخصوص وصف قرار دیا، اس کے بعد عام عہد کا ذکر کیا، اس کے برعکس ایک آیت میں پہلے عہد کی عام پابندی کا، اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا:

﴿ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۳۴۔۳۵)

''اور عہد کو پورا کیا کرو، (قیامت میں) عہد کی باز پرس ہوگی اور جب ناپ کر دو، تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو اور (تول کر دینا ہو تو) ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو (معاملہ کا) یہ بہتر (طریق) ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے۔''

قانون یا رسم و رواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس کی پابندی بائع اور خریدار پر فرض ہوتی ہے، اس لیے تاکیداً پابندی عہد کے عام حکم کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کے لیے زبانی قول وقرار کی ضرورت نہیں، بلکہ عرف عام کے سارے مسلمات سوسائٹی کے قول وقرار ہیں۔ تمام عہدوں میں سے سب سے پہلے انسان پر اس عہد کو پورا کرنا واجب ہے، جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے، یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے جو روز اَلَسْتُ کو بندوں نے اپنے اللہ سے باندھا اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے اور دوسرا وہ عہد ہے جو اللہ کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت میں کیا گیا ہے، تیسرا عہد وہ ہے جو عام طور سے قول وقرار کی شکل میں بندوں میں آپس میں ہوا کرتا ہے اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہلِ حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے اور جن کے ادا

کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ ﴾ (۱۳/ الرعد:۲۰-۲۱)

''جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے اقرار کو نہیں توڑتے اور اللہ نے جن تعلقات کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، ان کو جوڑے رکھتے ہیں۔''

اس آیت میں پہلے اس فطری عہد کے ایفا کا ذکر ہے جو اللہ اور بندہ کے درمیان ہے، پھر اس قول وقرار کا جو باہم انسانوں میں ہوا کرتا ہے، اس کے بعد اس فطری عہد کا ہے، جو خاص کر اہل قرابت کے درمیان قائم ہے۔ سورۂ نحل میں اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے، جو اللہ کو حاضر و ناظر بتا کر یا اللہ کی قسمیں کھا کھا کر بندے آپس میں کرتے ہیں، فرمایا:

﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ ﴾ (۱۶/ النحل:۹۱)

''اور اللہ کا نام لے کر تم آپس میں ایک دوسرے سے قرار کرو تو اس کو پورا کرو اور قسموں کو پکی کر کے توڑا نہ کرو اور اللہ کو تم نے اپنے پر ضامن ٹھہرایا ہے۔''

اس معاہدہ کے عموم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ عہد بھی داخل ہیں، جو اسلام لاتے وقت انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے کیے اور وہ نیک معاہدے بھی اس کے اندر شامل ہیں، جو جاہلیت میں کسی اچھی غرض سے کیے گئے تھے، ساتھ ہی وہ سب معاہدے بھی اس میں آجاتے ہیں، جو اللہ کا واسطہ دے کر اور اللہ کی قسمیں کھا کر آج بھی مسلمان ایک دوسرے سے کریں۔

سورۂ انعام میں ایک اور عہد الٰہی کے ایفا کی نصیحت کی گئی ہے، فرمایا:

﴿ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۱۵۲)

''اور اللہ کا قرار پورا کرو، یہ اس نے تم کو نصیحت کر دی ہے، تا کہ تم دھیان رکھو''

اس عہدِ الٰہی میں اللہ کے وہ فطری احکام بھی داخل ہیں، جن کے بجالانے کا اقرار تم نے اللہ سے کیا ہے، یا اللہ نے تم سے لیا ہے، اسی طرح اس نذر اور منت کو مشتمل ہے، جس کو اللہ کے مقدس نام سے تم نے مانا ہے اور انسانوں کے اس باہمی قول وقرار کو بھی شامل ہے جو اللہ کی قسمیں کھا کھا کر لوگ کیا کرتے ہیں۔

صلح حدیبیہ میں مسلمانوں نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریق مخالف کی قوت روز بروز گھٹتی اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی، اس حالت میں اس معاہدہ کو توڑ دینا کیا مشکل تھا، مگر یہی وہ وقت تھا جس میں مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کی آزمائش کی جاسکتی تھی کہ اپنی قوت

اور دشمنوں کی کمزوری کے باوجود وہ کہاں تک اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو، جن مشرکوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا ان سے لڑنے کی اجازت گو دے دی گئی تھی اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا، پھر بھی یہ حکم ہوا کہ ان کو چار مہینوں کی مہلت دو:

﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ﴾ (۹/ التوبۃ:۲)

’’اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو پورا جواب ہے، جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، تو پھر لو (تم اے مشرکو) ملک میں چار مہینے اور یقین مانو کہ تم اللہ کو تھکا نہیں سکتے۔‘‘

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہیں رہی، تو ساتھ ہی ان مشرکوں کے ساتھ ایفائے عہد کی تاکید کی گئی، جنھوں نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا تھا، فرمایا:

﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:٤)

’’مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا، پھر انھوں نے تم سے کچھ کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کو مدد دی، تو ان سے ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو، بے شک اللہ کو خوش آتے ہیں تقویٰ والے۔‘‘

اور ان مشرکوں کے ساتھ اس ایفائے عہد کو اللہ تعالیٰ تقویٰ بتاتا ہے اور جو اس عہد کو پورا کریں ان کو متقی فرمایا اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا، آگے بڑھ کر ان مشرکوں سے اپنی براءت کا اعلان کرتے وقت جنھوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش میں ان عہد شکن مشرکوں کے ساتھ، ان مشرکوں کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جائے جنھوں نے اس معاہدہ کو قائم رکھا ہے:

﴿ كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾

(۹/ التوبۃ:۷)

’’مشرکوں کو کیسے اللہ کے پاس اور اس کے رسول کے پاس کوئی عہد ہو، مگر وہ جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک معاہدہ کیا، جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو، بے شک اللہ کو تقویٰ والے خوش آتے ہیں۔‘‘

''سیدھے رہنے'' کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں، تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو اور جو لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں، ان کا شمار تقویٰ والوں میں ہے، جو قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے اور تقویٰ والے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضامندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفا اللہ تعالیٰ کی خوشی اور پیار کا موجب ہے اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہِ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔

قرآن مجید میں قریب قریب اسی عہد کے معنی میں ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ (٥/ المآئدۃ:١)

''مسلمانو! (اپنے) قراروں کو پورا کرو۔''

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہیں اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات کی باہمی پابندیوں کی گرہ ہے اور اصطلاح شرعی میں یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے، چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

''اوفوا بالعھد'' اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مشابہ ہے ﴿یاایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود﴾ اور اس قول میں تمام عقد مثلاً: عقد بیع، عقد شرکت، عقد یمین، عقد نذر، عقد صلح اور عقد نکاح داخل ہیں، خلاصہ یہ کہ اس آیت کا اقتضا یہ ہے کہ دو انسانوں کے درمیان جو عقد اور جو عہد قرار پا جائے اس کے مطابق دونوں پر اس کا پورا کرنا واجب ہے۔'' [1]

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے، یہاں تک کہ تعلقات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جلنے سے ہو جاتی ہے، حسن عہد میں داخل ہے، صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ''مجھ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہیں آیا، میرے نکاح سے تین سال پیشتر ان کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن رسول اللہ ﷺ ان کا ذکر کیا کرتے تھے اور بکری ذبح کرتے تھے تو اس کا گوشت ان کی سہیلیوں کے پاس ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔'' [2] یعنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد بھی ان کی سہیلیوں کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا جو ان کی زندگی میں جاری تھا، امام بخاری نے کتاب الادب میں ایک باب باندھا ہے جس کی سرخی یہ ہے ''حسن العھد من الایمان'' اور اس باب کے تحت میں اسی حدیث کا ذکر کیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں حاکم اور بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ ایک بڑھیا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، آپ ﷺ نے اس سے کہا کہ ''تم کیسی رہیں، تمہارا کیا حال

[1] تفسیر کبیر، ج ٥، ص: ٥٨٥۔ [2] بخاری، کتاب الادب، باب حسن العھد من الایمان: ٦٠٠٤۔

ہے، ہمارے بعد تمہارا کیا حال رہا؟'' اس نے کہا کہ اچھا حال رہا، جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آپ نے اس بڑھیا کی طرف اس قدر توجہ فرمائی؟ فرمایا: ''عائشہ! یہ خدیجہ کے زمانہ میں ہمارے یہاں آیا کرتی تھی اور حسنِ عہد ایمان سے ہے''۔ 1 یعنی اپنے ملنے جلنے والوں سے حسب توقع یکساں سلوک قائم رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ہر خطبہ میں اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے:

((لا دين لمن لا عهد له)) 2

''جس میں عہد نہیں، اس میں دین نہیں۔''

یعنی اس قول وقرار کو جو بندہ اللہ سے کرتا ہے، یا بندہ بندہ سے کرتا ہے، پورا کرنا حق اللہ اور حق العباد کو ادا کرنا ہے، جس کے مجموعے کا نام دین ہے، اب جو اس عہد کو پورا نہیں کرتا، وہ دین کی روح سے محروم ہے۔

---

1 فتح الباری، ج ۱۰، ص: ۳۶۵۔ 2 مسند احمد، ج ۳، ص: ۱۳۵، ۱۵۴، ۲۱۰، ۲۵۱۔

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى ﴾ (۱٦/ النحل:۹۰)

''اللہ انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔''

انصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور رنج و راحت کی پروا نہیں کرتا، وہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے، لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا، پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قرابت داروں کی مالی امداد کا ذکر کیا، لیکن احسان مالی امداد کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں اور عام لوگوں کے علاوہ باپ، ماں، قرابت دار، یتیم، محتاج، قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، آس پاس کے بیٹھنے والے، مسافر اور لونڈی غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء (۳٦:۴) کی ایک آیت میں ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے۔ (بقرہ:۸۳، انعام:۱۵۱، بنی اسرائیل:۲۳، احقاف:۱۵)

بہر حال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے، لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے، یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا:

﴿ وَأَحْسِنْ كَمَآ أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ ﴾ (۲۸/ القصص:۷۷)

''اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی (اوروں کے ساتھ) احسان کر۔''

احسان کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی، اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں:

﴿ وَقَدْ أَحْسَنَ بِيٓ إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ ﴾ (۱۲/ یوسف:۱۰۰)

''اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور بھی بڑے بڑے) احسان کیے ہیں کہ (بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا۔''

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتیں ہیں، اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں شریفانہ اور فیاضیانہ افعال ہیں، جن کو اللہ نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، مثلاً: عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کام تھا، جس سے روکا گیا اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کردو، فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى ﴾ (۱٦/ النحل: ۹۰)

''اللہ انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔''

انصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور رنج وراحت کی پروانہیں کرتا، وہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے، لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا، پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قرابت داروں کی مالی امداد کا ذکر کیا، لیکن احسان مالی امداد کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں اور عام لوگوں کے علاوہ باپ، ماں، قرابت دار، یتیم، محتاج، قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، آس پاس کے بیٹھنے والے، مسافر اور لونڈی غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء (۳٦:۴) کی ایک آیت میں ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے۔ (بقرہ:۸۳، انعام:۱۵۱، بنی اسرائیل:۲۳، احقاف:۱۵)

بہر حال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے، لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے، یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا:

﴿ وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ﴾ (۲۸/ القصص:۷۷)

''اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی (اوروں کے ساتھ) احسان کر۔''

احسان کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی، اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں:

﴿ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ ﴾ (۱۲/ یوسف:۱۰۰)

''اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور بھی بڑے بڑے) احسان کیے ہیں کہ (بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا۔''

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتیں ہیں، اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہیں، جن کو اللہ نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، مثلاً: عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کام تھا، جس سے روکا گیا اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کر دو، فرمایا:

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۹)

''طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہوسکتا ہے وہ تو دو ہی طلاقیں ہیں جو) دو دفعہ (کرکے دی جائیں) پھر (دو طلاقوں کے بعد یا تو) دستور کے مطابق (زوجیت میں) رکھنا ہے یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا۔''

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کر دو اور اس کی ادائی میں لیت ولعل اور حجت حوالہ نہ کیا کرو، فرمایا:

﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۷۸)

''پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی (طالب قصاص) سے کوئی جزو (قصاص) معاف کر دیا جائے، تو (جان کے بدلے خون بہا اور وارث مقتول کی طرف سے اس کا) مطالبہ دستور (شرع) کے مطابق اور (قاتل کی طرف سے) وارث مقتول کو خوش معاملگی کے ساتھ (خون بہا کا) ادا کر دینا۔''

قصور واروں کے قصور کو معاف کرنا اور ان کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے، اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے کہ جو اس صفت سے متصف ہوں وہ بھی اللہ کے محبوب بندوں میں ہوں گے:

﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۳٤)

''اور اللہ ان محسنوں (یا نیکی کرنے والوں) کو پیار کرتا ہے۔''

احسان کے لیے قرآن کا ایک اور لفظ فضل ہے، اگر کوئی منکوحہ سے خلوت کیے بغیر اس کو طلاق دے دے، تو شوہر پر نصف ❶ مہر واجب ہوتا ہے، یہ تو قانون ہوا، مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حسن خلق ہے اور شوہر پورا ادا کر دے اور آدھا کاٹے نہیں، تو یہ مرد کا حسن خلق ہے، اس کے بعد ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۷)

''اور آپس ❷ میں فضل مت بھولو، بے شک اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔''

کسی غریب یا کسی عزیز وقریب سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے ناراضی پیدا ہو جائے، تو بھی احسان والوں کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کریں اور اپنے احسان سے باز نہ آئیں۔ ❸ فرمایا:

---

❶ یعنی جس حالت میں کہ مہر مقرر ہو چکا ہو، ورنہ صرف چند کپڑے لازم آتے ہیں۔

❷ سعید سے روایت ہے ''آپس میں فضل کو مت بھولو'' یعنی ''احسان کو مت بھولو'' ابن جریر طبری، ج ۲، ص: ۳۲۵ مصر۔

❸ کشاف زمخشری تفسیر آیت مذکور ج ۱، ص: ۱۹۲، بعضوں نے یہاں ''فضل'' سے فضیلت دینی اور کسی نے فضل مالی مراد لیا۔

﴿ وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۪ۖ وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا ؕ ﴾ (۲۴/ النور:۲۲)

''اورتم میں جو احسان اور کشائش والے ہیں وہ قرابت داروں، غریبوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھالیں، ان کو چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں۔''

احسان کے اسی وسیع معنی میں اسلام نے ایک جامع لفظ ''معروف'' کا استعمال کیا ہے، یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً وشرعاً معلوم ہو، معروف میں داخل ہے، قرآن کریم کا حکم ہے:

﴿ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۹۹)

''اور نیکی کرنے کو کہہ۔''

اور اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ

((كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ)) [1]

''ہر نیکی ثواب کا کام ہے۔''

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے جس کے لیے غریب وامیر کی تخصیص نہیں، بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہر مسلمان پر صدقہ فرض ہے۔'' صحابہ نے عرض کیا کہ اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو کیا کرے؟ فرمایا ''کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے۔'' صحابہ نے عرض کیا کہ اگر اس کو کمانے کی قدرت نہ ہو یا وہ نہ کمائے؟'' فرمایا: ''غریب حاجت مند کی اعانت کرے''۔ صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے؟ فرمایا ''نیکی کے کرنے کا حکم دے۔'' صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکے؟ ارشاد ہوا کہ ''برائی سے باز رہے، کیونکہ یہ اس کے لیے صدقہ ہے۔'' اسی معنی کے لحاظ سے حدیث میں آیا ہے کہ ''آدمی اپنے اہل وعیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے وہ صدقہ ہے، کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا بھی اسی میں داخل ہے۔'' [2] اسی معنی میں قرآن مجید نے ایک اور لفظ ''بر'' کا استعمال کیا ہے اور اس وسیع دائرے میں کافر ومسلم سب کو شامل کر لیا ہے:

﴿ لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۝ ﴾ (۶۰/ الممتحنۃ:۸)

''جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انھوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ان کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے تو اللہ تم کو منع کرتا نہیں (کیونکہ اللہ منصفانہ برتاؤ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم میں کچھ ایسے لوگ تھے جو نامسلموں پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہیں سمجھتے تھے، اس پر یہ حکم آیا

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب کل معروف صدقة:۶۰۲۱۔

[2] ایضًا:۶۰۲۳؛ فتح الباری، ج۱۰، ص:۳۷۴۔

کہ ہدایت بخشنا تمہارا نہیں، میرا کام ہے، تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ نیکی کرنی اور اپنی نیت ٹھیک رکھنی چاہیے، تم کو اپنی نیت کا ثواب ملے گا، [1] ارشاد ہوا:

﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ؀ ﴾

(۲/ البقرۃ: ۲۷۲)

’’تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لے آنا، لیکن اللہ راہ پر لے آتا ہے، جس کو چاہے اور تم جو دو گے خیرات سو اپنے واسطے اور تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر اور جو دو گے خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا۔‘‘

گویہ احسان کی ایک خاص صورت ہے، مگر اس کی وسعت میں ساری دنیا سمائی ہے۔ نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا اسلام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب و عذاب کا دارومدار ہے، جو نیک کام کریں گے ان کو اللہ کے ہاں سے نیک ہی جزا ملے گی، ارشاد ہوا:

﴿ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ؀ ﴾ (۵۵/ الرحمٰن: ٦٠)

’’اور بھلائی کا بدلہ کیا ہے، مگر بھلائی۔‘‘

گویہ آیت مبارکہ اپنے سیاق کے لحاظ سے آخرت میں نیک کاموں کے نیک بدلہ ملنے سے متعلق ہے، مگر لفظوں کے لحاظ سے اس اصول کی وسعت دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے، دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس بوجھ کو ہلکا کیا ہے، قرضداروں پر احسان کرنا، ضرورت مندوں کو قرض دینا اور تنگ دست مقروضوں کو مہلت دینا جو قرض ادا کرنے سے بالکل مجبور ہوں، ان کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے۔ عرب میں سودخواری نے لوگوں کو اس قدر بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض ادا نہیں کر سکتے تھے، وہ غلاموں کی طرح فروخت کر دیے جاتے تھے اور جو قیمت ملتی تھی، اس سے ان کا قرض ادا کیا جاتا تھا، آج اس تمدن کے زمانہ میں قرض کی زنجیر مقروضوں کے لیے اتنی ہی بھاری ہے، بلکہ سرمایہ داری کے موجودہ نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی آیت اس سارے نظام کو تہ و بالا کرتی ہے:

﴿ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾

(۲/ البقرۃ: ۲۸۰)

’’اور اگر (کوئی) تنگ دست (تمہارا مقروض) ہو تو فراخی تک کی مہلت (دو) اور اگر سمجھو تو تمہارے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو (اصل قرضہ بھی) بخش دو۔‘‘

[1] ابن جریر، ج۳، ص: ۵۸، ۵۹ وابن کثیر، ج۱، ص: ۳۲۳ بحوالہ نسائی تفسیر آیت مذکورہ۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں خود اللہ تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان فرما کر کہ ''قیامت کے دن میں خود تین آدمیوں کا فریق ہوں گا، جن میں سے ایک وہ شخص ہے، جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی۔'' ❶ اس کو اور بھی مؤکد کر دیا اور قرض کے معاملے میں تنگدستوں پر احسان کرنے کی متعدد صورتیں بتائیں، یعنی مہلت دینا، قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ تقاضا کرنا اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ کرے، تب بھی صرف یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہوسکتا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ''ایک شخص جو نیکی کا کوئی کام نہیں کرتا تھا، لوگوں کو قرض دیتا تھا اور جب اس کو کوئی مقروض تنگ دست نظر آتا تھا تو اپنے ملازموں سے کہتا تھا کہ اس سے درگزر کرو، شاید اللہ ہم سے بھی درگزر کرے، چنانچہ اللہ نے اس کے صلہ میں اس سے درگزر کیا۔'' دوسری حدیث میں ہے کہ ''تم سے پہلے ایک شخص تھا، جس سے موت کے بعد فرشتوں نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا، کوئی نہیں، فرشتوں نے کہا، ذرا یاد کرو، اس نے کہا کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا، اگر مقروض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے میں آسانی کرتا تھا اور اگر تنگ دست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا یہ کہ فراخ دست مقروض کو مہلت دیتا تھا اور تنگ دست کا قرض چھوڑ دیتا تھا۔'' ❷

اس قسم کی بہت سی روایتیں ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے، وہ تنگ دست کو مہلت دے، یا اس کا قرض معاف کردے۔'' ❸ یہی روایت مسند ابن حنبل میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ ''جو شخص اپنے قرض دار کو مہلت دے گا، یا اس کا قرض معاف کردے گا تو قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔'' ❹

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص معنی میں محدود نہیں کیا ہے، بلکہ اس کو نیکی کی ہر راہ میں وسیع کر دیا ہے، زندگی تو زندگی موت میں بھی اس نے اس اصول کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے، تو اگر تمہیں کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ مارو، کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو، چھرے کو خوب تیز کرلیا کرو اور اپنے ذبیحہ کو راحت دو۔'' ❺

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے اسی کے ساتھ احسان کرنا چاہیے، محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے، ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آکر پوچھا کہ ''یا رسول اللہ ﷺ! میں کسی

---

❶ بخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حرا: ۲۲۲۷۔ ❷ بخاری، کتاب البیوع، باب من انظر موسرا: ۲۰۷۷ ومسلم، کتاب المساقاۃ، باب فضل انظار المعسر: ۳۹۹۳۔

❸ مسلم، کتاب المساقاۃ، باب فضل انظار المعسر: ۴۰۰۰۔ ❹ مسند احمد، ج ۵، ص: ۳۰۸۔

❺ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب الامر باحسان الذبح: ۵۰۵۵۔

شخص کے پاس سے گزرتا ہوں تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا، تو کیا جب اس کا گزر مجھ پر ہو تو میں بھی اس کی کج خلقی کا بدلہ یہی دوں۔ فرمایا: ''نہیں، تم اس کی مہمانی کرو۔'' ❶

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا: ''ایسے نہ بنو کہ خود تمہاری گرہ کی عقل نہ ہو، صرف دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرو، کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی کریں گے، بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کر لو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو ہی گے اور اگر وہ برائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔'' ❷

لوگ احسان کو غلطی سے دولت و تمول یا اور دوسری بڑی بڑی باتوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ غریب کیا احسان کا کام کر سکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لیے دولت کی نہیں، دل کی ضرورت ہے اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوتی ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کے کرنے سے مجھے بہشت نصیب ہو، ارشاد ہوا: ''تمہاری تقریر گو مختصر ہے، لیکن تمہارا سوال بہت بڑا ہے، تم جانوں کو آزاد کرو اور گردنوں کو چھڑاؤ''۔ اس نے کہا، یارسول اللہ ﷺ! کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں؟ فرمایا: ''نہیں اکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے اور دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن چھڑانا ہے اور لگاتار دیتے رہو اور ظالم رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرو، اگر تم یہ بھی نہ کر سکو تو بھوکے کو کھلاؤ اور پیاسے کو پلاؤ اور نیکی کے کام کرنے کو کہو اور برائی کے کام سے باز رکھو اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو۔'' ❸

ایک دفعہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتائیے، فرمایا: ''جو روزی اللہ نے دی اس میں سے دوسروں کو دے۔'' عرض کی، اے اللہ کے رسول! اگر وہ خود مفلس ہو؟ فرمایا: ''اپنی زبان سے نیک کام کرے۔'' عرض کی، اگر اس کی زبان معذور ہو۔ فرمایا: ''مغلوب کی مدد کرے۔'' عرض کی، اگر وہ ضعیف ہو، مدد کی قوت نہ ہو۔ فرمایا: ''جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو اس کا کام کر دے۔'' عرض کی، اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو۔'' فرمایا: ''اپنی ایذا رسانی سے لوگوں کو بچائے رکھے۔'' ❹

❶ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الاحسان والعفو: ۲۰۰۶۔ ❷ جامع ترمذی، ایضًا: ۲۰۰۷۔
❸ مستدرك حاكم، كتاب المكاتب، ج ۲، ص: ۲۱۷۔ ❹ مستدرك حاكم، كتاب الايمان، ج ۱، ص: ۶۳۔

عفو و درگزر

عفو و درگزر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے، اگر یہ نہ ہو تو دنیا ایک لمحہ کے لیے بھی آباد نہ رہے اور دم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سونی پڑ جائے، اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے عَفُو (درگزر کرنے والا) غافر، غفور اور غفار (معاف کرنے والا ہے) اس کی شان یہ ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّاٰتِ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۲۵)

''اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے۔''

وہ چاہے تو انسانوں کے گناہوں کے سبب سے ان کو ایک دم ہلاک کر دے، یا ان کو معاف کر دے، فرمایا:

﴿ أَوْ يُوبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيرٍ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۳۴)

''(اگر اللہ چاہے تو) گناہگاروں کو ان کے کرتوت کے سبب تباہ کر دے اور بہتوں کو معاف کر دے۔''

وہ اپنے شرمندہ بندوں کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تاکید پر تاکید کر کے یوں دلاتا ہے:

﴿ وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۸۲)

''اور اس میں شبہ نہیں کہ میں البتہ اس کی بڑی بخشائش کرتا ہوں جو توبہ کرے اور یقین لائے اور نیک کام کرے، پھر راہ پر رہے۔''

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دو جگہ اپنے کو غافر (بخشنے والا) پانچ دفعہ غفار (بڑی بخشائش کرنے والا) اور اتنے ہی دفعہ عفو (معاف کرنے والا) اور ستر سے زیادہ آیتوں میں غفور (بخشنے والا) کہا ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کے عفو و درگزر کا سمندر کس زور و شور سے جوش مار رہا ہے، اللہ نے اپنی ساری صفتوں میں سے اپنی اسی صفت کی تجلی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے۔ فرماتا ہے:

﴿ أَوْ تَعْفُوا عَنْ سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا ﴾ (۴/ النسآء:۱۴۹)

''یا کسی برائی کو معاف کرو، تو بے شک ہے اللہ معاف کرنے والا قدرت والا۔''

انسان اگر اپنے کسی قصوروار کو معاف کرتا ہے، تو اس کی قدرت بہر حال کامل نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، وہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصوروں کو معاف کرنا کتنا زیبا اور سزاوار ہے، تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصوروں کو معاف فرماتا ہے، اسی طرح ہم کو چاہیے کہ ہم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کریں۔ [1]

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصورواروں کو معاف کریں گے تو اللہ تعالیٰ

[1] تفسیر ابن جریر، پارہ ۶، ج۶، ص:۴ وبحر محیط ابن حیان تفسیر سورۃ نسآء، ج۳، ص:۳۸۵۔

ہمارے قصوروں کو بھی معاف کرے گا، ایک دوسری آیت میں اس اشارہ کی پوری تصریح ہے، فرمایا:

﴿ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾

(۲۴/ النور:۲۲)

''اور چاہیے کہ وہ معاف کردیں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے اور اللہ معاف کرنے والا اور رحم والا ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو عفو و درگزر کی تعلیم اس ترغیب کے ساتھ دی ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تمہیں معاف کرے گا اور جب اللہ غفور و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابر کرم کی کچھ چھینٹیں پڑنی چاہییں، چنانچہ جن مومنوں کے لیے اللہ نے جزائے خیر کا وعدہ فرمایا ہے، ان کی ایک صفت یہ بتائی ہے:

﴿ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۳۷)

''اور جب غصہ آئے تو وہ معاف کرتے ہیں۔''

سکون کی حالت میں معاف کرنا اتنا مشکل نہیں، جتنا غصہ کی حالت میں، جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا، لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن میں یہ جوہر ہوتا ہے، وہ اس حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور قصور والوں کو معاف کردیتے ہیں۔

یہ تو کسی ذاتی غیظ و غضب کی حالت ہوئی، لیکن اس سے بڑھ کر وہ موقع ہے جہاں مذہبی اختلاف درمیان میں ہے، کہ ان احمقوں کو اچھی بات بتائی جاتی ہے اور وہ نہیں مانتے، ان کے دعویٰ کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے، مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہیں اور حق کا جواب لایعنی گفتگو سے اور برا بھلا کہہ کردیتے ہیں، ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَإِن تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَسْمَعُوا ۖ وَتَرَاهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ۝ خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۹۸۔۱۹۹)

''اور اگر تم ان کو راہِ راست کی طرف بلاؤ تو (تمہاری ایک) نہ سنیں اور (بظاہر) وہ تم کو ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ (گویا) وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں، حالانکہ وہ دیکھتے نہیں، (اے پیغمبر) درگزر (کا شیوہ) اختیار کرو اور (لوگوں سے) نیک کام (کرنے) کو کہو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔''

کیونکہ ایسے موقع پر دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کردیا جائے، یا تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں ان ناگواریوں کو برداشت کیا جائے، اللہ نے اسی دوسری صورت کے اختیار کرنے کا حکم دیا

اور فرمایا کہ ان ناگواریوں کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو، صرف یہی نہیں بلکہ اس سلسلے میں برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو:

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۹۶)

''(اگر کوئی تمہارے ساتھ بدی کرے تو) بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو جو بہت ہی اچھا ہو، جو کچھ وہ تمہاری نسبت کہا کرتے ہیں وہ ہم کو خوب معلوم ہے۔''

مذہبی جماعت کے لیے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز موقع وہ ہوتا ہے، جب کچھ لوگ ان لوگوں کو بھی ان سے الگ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی جماعت میں شامل ہو چکے ہیں، لیکن اللہ نے اس موقع پر بھی مسلمانوں کو عفو ودرگزر کا حکم دیا ہے:

﴿ وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۰۹)

''(مسلمانو)! اکثر اہل کتاب باوجود یہ کہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے (پھر بھی) اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں، تو معاف کرو اور درگزر کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم صادر فرمائے۔''

اسی طرح مشرک بھی جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے تھے اگر غصہ دلانے والی کوئی بات کریں تو ان نادانوں کو معاف کر دینا چاہیے کیونکہ وہ اگر نہیں، تو تم تو قیامت کی جزا وسزا کے قائل ہو، اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرتے ہیں تو آج نہیں تو کل اس کا بدلہ ان کو مل جائے گا، فرمایا:

﴿ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ لِیَجْزِیَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾

(۴۵/ الجاثیة:۱۴۔۱۵)

''ایمان والوں سے کہہ دے کہ ان کو جو اللہ کے جزا وسزا کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے معاف کر دیا کریں، تاکہ لوگوں کو ان کے کاموں کا بدلہ ملے، جس نے اچھا کیا اس نے اپنے بھلے کے لیے کیا اور جس نے برا کیا اس نے اپنا برا کیا، پھر تم اپنے پروردگار کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔''

اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی اس پر بعض مسلمانوں کو طیش آیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور مسلمانوں کو عفو ودرگزر کی نصیحت

فرمائی، ❶ (تفسیر کبیر امام رازی زیر آیت بالا ج ۵ ص: ۵۸۹)

غم وغصہ کے اظہار کا اصلی وقت وہ آتا ہے جب انسان کی عزت وآبرو پر حملہ کیا جائے، لیکن اس حالت میں بھی اسلام نے عفو ودرگزر سے کام لینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے، لیکن جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہمت میں حصہ لیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی مالی امداد بند کردی، ❷ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ ﴾

---

❶ اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کفار سے عفو ودرگزر کی نصیحت ہے، عام مفسروں کا نظریہ یہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے، جہاد نے کفار کے حق میں عفو ودرگزر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے لیکن مفسروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفو ودرگزر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہیں سمجھتے اور اس لیے ایک سے دوسرے کو منسوخ نہیں جانتے، امام رازی نے اپنی تفسیر میں کئی موقعوں پر اس کی تصریح کی ہے لکھتے ہیں ''اس آیت ﴿ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۹۹) میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بداخلاقی پر صبر کریں اور ان کی بیہودہ باتوں اور کمینہ حرکتوں کا جواب اسی قسم کی باتوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے اور اس میں قتال سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہیں کیونکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکوں سے قتال میں کوئی تضاد نہیں اور جب دونوں باتیں ایک ساتھ ہوسکتی ہیں، تو نسخ ماننے کی ضرورت نہیں مگر ظاہر پرست مفسرین بے ضرورت ناسخ ومنسوخ آیتوں کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہیں۔'' جلد ۴ صفحہ ۴۹۶۔

ایک اور آیت ﴿ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ﴾ (۲۳/ المومنون:۹۶) کی تفسیر میں لکھتے ہیں: کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ نرمی برتنے پر ہر حال میں آمادہ کیا گیا ہے جب تک اس سے دین اور اخلاق میں کوئی نقصان نہ پیدا ہو۔ (ج ۶ صفحہ ۳۰۰)

آیت ﴿ وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۳) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''کلبی اور ابوالعالیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو قتال کے حکم نے منسوخ کر دیا لیکن اس نسخ کے ماننے کی ضرورت نہیں، کیونکہ احمقوں سے چشم پوشی کرنا اور ان کا مقابلہ نہ کرنا عقل اور شرع دونوں میں مستحسن ہے اور عزت وآبرو اور پرہیزگاری کی سلامتی کا باعث ہے۔ ج ۶ صفحہ ۴۹۷ طبع دار الطباعۃ العامرۃ مصر۔

آیت ﴿ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ ﴾ (۴۵/ جاثیہ:۱۴) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اکثر مفسروں نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے کیونکہ کفار پر عفو وکرم کے عموم میں یہ بھی داخل ہو جاتا ہے کہ ان سے قتال نہ کیا جائے لیکن جب خدا نے ان سے قتال کا حکم دیا تو عفو وکرم کے حکم کا نسخ ہوگیا، لیکن قریب بہ صحت یہ ہے کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کافروں سے جھگڑا نہ کیا جائے اور ان کی تکلیف دہ باتوں اور وحشیانہ حرکتوں سے درگزر کیا جائے۔ (جلد ۷، صفحہ:۴۸۴ طبع مذکور) میرے نزدیک اوپر کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں اور دوسرے قصورواروں کے ان ہی قصوروں کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے اور وہ حقوق العباد ہیں، یعنی وہ مسلمانوں کا ذاتی قصور کریں تو مسلمان معاف کردیں اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس سے کفر وشرک اور عصیان الٰہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو سرے سے حاصل نہیں اور قتال وجہاد حقوق الٰہی کے مقابلہ میں مشروع ہوا ہے اس لیے جہاد کی آیتیں اس مغفرت اور عفو ودرگزر کے اخلاقی احکام میں خلل انداز نہیں، درمنثور میں ابن عساکر سے حضرت ابومسلم خولانی صحابی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک کافرہ لونڈی کا قصور یہی آیت پڑھ کر معاف کیا تھا اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ (ج ۶ صفحہ:۳۵ مصر)

❷ تفسیر کبیر امام رازی، ج ٤، تفسیر سورہ نور، ص: ٦٥٢۔

(٢٤/ النور:٢٢)

''اور تم میں سے جو لوگ صاحب احسان اور کشائش والے ہیں، قرابت والوں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مدد خرچ) نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں، بلکہ (چاہیے کہ ان کے قصور) بخش دیں اور درگزر کریں، (مسلمانو)! کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کردے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس آیت کے آخری ٹکڑے سے ظاہر ہے کہ جو دوسروں کے قصور کو معاف کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے قصور سے درگزر فرمائے گا۔

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے:

﴿ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ (٣/ آل عمران:١٣٣۔١٣٤)

''اور اپنے پروردگار کی بخشائش اور اس جنت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ (اتنا بڑا ہے) جیسے زمین و آسمان، (کا پھیلاؤ، بجی سجائی) ان پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے، جو خوشحالی اور تنگ دستی (دونوں حالتوں) میں (اللہ کے نام پر) خرچ کرتے اور غصے کو روکتے اور لوگوں (کے قصوروں) سے درگزر کرتے ہیں اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے۔''

اوپر کی آیت میں متقیوں کے دو وصف ایک ہر حال میں راہ الٰہی میں دینا اور دوسرا لوگوں کو معاف کرنا اور درگزر کرنا اور ان کے لیے دو جزائیں، ایک اللہ کی مغفرت اور دوسری وسیع جنت بیان کی گئی ہیں، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال میں اللہ کی راہ میں دینے کا معاوضہ تو جنت ہے، جس کی حدودپایاں آسمان و زمین ہے اور غصہ کو روکنا اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ اللہ کی مغفرت ہمارے شامل حال ہوگی اور وہ احکم الحاکمین ہم کو بھی معاف کرے گا۔

عفو و درگزر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت اور قدرت کا جزو شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دنایت پسندی کے مترادف ہو جائے، اسی لیے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کردو، جو ذلت اور پست طبعی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے، کیونکہ اسلام نے عفو درگزر کی

ایسی معتدل تعلیم دی ہے، جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے:

﴿ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ۝ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ۝ ﴾ (الشوری:۳۹۔۴۰)

''اور جو ایسے (غیرت مند) ہیں کہ جب ان پر (کسی طرف سے) بے جا زیادتی ہوتی ہے، تو وہ (واجبی) بدلہ لے لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی، اس پر (بھی) جو معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، بے شک وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

برائی کا بدلہ برائی، جماعت کا قانون ہے اور عفو و درگزر افراد کا اخلاقی کمال ہے، جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس میں عفو و درگزر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے، جس کی مزدوری کی ذمہ داری احکم الحاکمین نے اپنے ذمہ لی ہے اور بتا دیا ہے کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہوں جو بے سبب پہلے ظلم کر بیٹھیں، یا وہ ہوں جو انتقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں، اللہ کی محبت سے محروم ہیں۔

اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد عفو و درگزر خودداری کے منافی نہیں ہوتا، بلکہ بڑی ہمت کا کام ہو جاتا ہے کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر عفو و درگزر کرتا ہے، اسی لیے فرمایا:

﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۝ ﴾ (٤٢/ الشوری:٤٢)

''اور البتہ جو شخص صبر کرے اور (دوسرے کی خطا) بخش دے تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔''

ایک اور آیت میں اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیوں کر دشمنی دوستی کی صورت میں بدل جاتی ہے:

﴿ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۝ وَمَا یُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ۝ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۝ ﴾

(٤١/ حٰمٓ السجدة:٣٤۔٣٦)

''اور بھلائی اور برائی برابر نہیں، (اگر کوئی برائی کرے تو اس کا) جواب اچھائی سے دو پھر تو تیرے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا گویا دوست ہے، ناتے والا اور یہ بات ملتی ہے انہیں کو جن میں صبر ہے اور یہ بات ملتی ہے اس کو جس کی بڑی قسمت ہے اور اگر (اس میں) شیطان کے کونچنے سے کوئی کونچ تجھ کو لگ جائے، تو اللہ کی پناہ ڈھونڈ، بے شک وہی ہے سنتا جانتا۔''

آیت کے اخیر ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفو و درگزر کے خلاف انسان سے جو حرکت ہو جاتی ہے، وہ شیطانی کام ہے، اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے، کہ انہوں نے کہا:

''اللہ نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ و غضب میں صبر کا اور نادانی و جہالت کے وقت حلم و بردباری کا اور برائی کے مقابلہ میں عفو و درگزر کا حکم دیا ہے، جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا۔'' ❶

ابو مسعود صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی، جان لو، جان لو، مڑ کر دیکھا تو آنحضرت ﷺ تھے، فرما رہے تھے کہ ''اے ابو مسعود! جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے، اس سے زیادہ اللہ کو تم پر ہے۔'' ابو مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ میں نے پھر کسی غلام کو نہیں مارا۔

ایک شخص نے حضور انور ﷺ سے آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کروں؟ آپ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے، اس نے پھر یہی پوچھا، تب آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر روز ستر دفعہ۔'' ❷ اس سے مقصود نبوی ﷺ تعداد کی تحدید نہیں بلکہ عفو و درگزر کی کثرت ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفو و درگزر سے ان کے رعب و داب اور وقار میں فرق آ جائے گا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، انتقام سے گو فوری جذبہ کی تسکین ہو جاتی ہے اور کمزوروں پر دھاک بیٹھ جاتی ہے، مگر اس سے کسی پائیدار شریفانہ عزت کا خیال نہیں پیدا ہوتا، یہ چیز عفو و درگزر ہی سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((وَمَا زَادَ اللّٰهُ رَجُلاً بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا)) ❸

''اور اللہ اس شخص کو جو عفو و درگزر کرتا ہے نہیں بڑھاتا ہے مگر عزت میں۔''

---

❶ ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم، تفسیر سورة حمٓ السجدة، ج٤، ص: ١٠١ آیت مذکور۔

❷ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب النهی عن ضرب الخدام ...... ١٩٤٨ اور باب ماجاء فی العفو ...... ١٩٤٩ میں یہ دونوں حدیثیں ہیں۔ ❸ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی التواضع: ٢٠٢٩۔

حلم و بردباری

حلم و بردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کر لیا جائے اور قصوروار سے اس کے لیے کوئی تعرض نہ کیا جائے، یہ قدرت سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، لیکن اس قدرت کے باوجود وہ اکثر اپنے بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے، انتقام نہیں لیتا اور اسی لیے اس نے اپنے آپ کو حلم کے ساتھ متصف کیا ہے اور جہاں جہاں اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے، ساتھ ہی اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کر دیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے، فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۵ ، ۵/ المائدۃ:۱۰۱)

''اور اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۵)

''بے شک اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔''

﴿ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴾ (۱۷/ بنی اسرآءیل:۴۴ ، ۳۵/ فاطر:۴۱)

''بے شک وہ (اللہ) ہے بخشنے والا بردبار۔''

ان سب آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت حلم کے ساتھ اپنی صفت مغفرت کا ذکر کر دیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری نعوذ باللہ کسی ضعف یا عدم قدرت کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کی شان غفاری کا نتیجہ ہے۔

دوسری جگہ حلم کے ساتھ اپنی صفت علم کو شامل کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴾ (۴/ النسآء:۱۲)

''اور اللہ ہے جاننے والا بردبار۔''

﴿ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴾ (۲۲/ الحج:۵۹)

''بے شک ہے اللہ جاننے والا بردبار۔''

﴿ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۱)

''اور ہے اللہ جاننے والا بردبار۔''

ان آیتوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانوں کی طرح بے جانے بوجھے، یا محدود علم کے سبب سے بردباری نہیں کرتا، بلکہ پورے علم اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہو کر بردباری فرماتا ہے، ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفت استغنا کا بھی ذکر فرماتا ہے:

﴿ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۳)

''اور اللہ مستغنی اور تحمل والا ہے۔''

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہے، اس لیے یہ ظاہر فرما دیا کہ وہ مستغنی ہے اور بردبار ہے۔

انسانوں میں بردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے، مثلاً: انتقام کے مقابلہ میں حلم، اگر اس برائی کرنے والے کو رام کرنے کے لیے کسی کو زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے کہ اس کو انتقام سے زیادہ حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہے، لیکن اللہ کی ذات ہر حیثیت سے غنی ہے، اس کا حلم کامل استغنا کے ساتھ ہے۔

حلم گو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت میں تعریف کے قابل ہے، لیکن اس کی ایک حیثیت ایسی ہے کہ اس سے بعض کم فہموں کے نزدیک حلیم اور بردبار آدمی کی کمزوری کا راز فاش ہوتا ہے اور اسی لیے اس کے مقابلہ میں ان میں سرکشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اس کمزوری سے واقف تھا، اس لیے اس نے اپنے حلم اور دارو گیر دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے، تا کہ اس سخت گیری کے سبب سے بندوں میں مایوسی اور بردباری کے سبب سے سرکشی نہ پیدا ہو، فرمایا:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾

(۲/ البقرة:۲۳۵)

''اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو تمہارے دلوں میں ہے، تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشش والا ہے تحمل والا۔''

یہ آیت عورت کے نکاح ثانی کے سلسلہ میں ہے، یعنی جب تک اس کی عدت کے دن پورے نہ ہوں کوئی چھپے چوری بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے اور نکاح نہ کرے، دل میں رہے تو کوئی حرج نہیں، اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کا ہر بھید معلوم ہے، ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، اس لیے ایک طرف تو اس کی گرفت سے ہمیشہ ڈرتے رہو، دوسری طرف اس کی بخشش اور بردباری بھی عام ہے، اس لیے اس سے پرامید بھی رہنا چاہیے۔

نیکی کے کاموں میں مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے اور ایسے لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے، اس موقع پر اس کا ارشاد ہے:

﴿ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴾

(٦٤/ التغابن:١٧)

''اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض دینا تو وہ اس کو دوگنا کر دے گا اور تمہیں معاف کرے گا اور اللہ ہے قدردان اور تحمل والا۔''

اس کی قدر دانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلہ دو دے گا اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کرے گا۔

اس آیت میں تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے، کسی قصوروار کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں اور اس کی خوبیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں، اس لیے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی ہے۔ یا اس میں ایک عیب ہے، مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں، تو اس کی ان خوبیوں کی قدر کر کے اس کی غلطی سے درگزر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرما کر وہ اس کی غلطی سے درگزر کرتا ہے۔

صفتِ حلم سے انبیائے کرام بھی متصف فرمائے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جن کی بنیادوں پر محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی ہے، خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بت پرست باپ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ کسی طرح عذاب الٰہی سے بچ جائے، انہوں نے اس کافر باپ کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم سہے اور آخر مجبور ہو کر اس سے علیحدگی پر مجبور ہوئے، پھر بھی ان کی بردباری اور تحمل کا سررشتہ ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور اس وقت تک اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے، جب تک ان کو پوری مایوسی نہیں ہوگئی اور ان کو قطعی طور سے معلوم نہیں ہوگیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے، اس واقعہ کے سلسلہ میں ہے:

﴿ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۱۴)

''اور (نہ تھا) ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا مانگنا، مگر ایک وعدہ (کی وجہ) سے جو ابراہیم نے اپنے باپ سے کر لیا تھا، پھر ان کو (بھی) جب معلوم ہو گیا کہ یہ اللہ کا دشمن ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہو گئے، بے شک ابراہیم البتہ بڑے نرم دل (اور) بردبار تھے (کہ باپ کے کافر ہونے کے باوجود اللہ سے اس کی مغفرت مانگنے کا وعدہ کر لیا تھا)۔''

دوسری آیت میں اس موقع پر جہاں قوم لوط کی بربادی کی خبر پا کر وہ اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کرتے ہیں، ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ ﴾ (۱۱/ ھود:۷۵)

''بے شک ابراہیم علیہ السلام بردبار، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔''

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلم، عفو و درگزر، رفق و ملاطفت اور صبر و استقلال

کے مجموعہ کا نام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی توصیف میں حلیم کے ساتھ اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وصف میں اواہ کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلم کے لیے عفو و درگزر اور رفق و ملاطفت لازمی ہیں۔ لیکن ایک اور آیت میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبت فرمایا ہے:

﴿ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴾ (۳۷/ والصافات:۱۰۱)

''تو ہم نے ان کو (ابراہیم علیہ السلام کو) ایک بڑے بردبار لڑکے (اسماعیل علیہ السلام کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی۔''

اس کے بعد جب ان کی قربانی کا حکم ہوا ہے تو انہوں نے کہا:

﴿ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾

(۳۷/ والصافات :۱۰۲)

''اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے (بے تامل) اس کی تعمیل کیجئے، انشاء اللہ آپ مجھ کو بھی صابر ہی پائیں گے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ صبر حلم کا ایک ضروری جزو ہے۔ حلم کی صفت اللہ کو نہایت محبوب ہے، چنانچہ ایک شخص کی نسبت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو اللہ پسند کرتا ہے، یعنی حلم اور جلد بازی نہ کرنا۔'' [1] یعنی کوئی بات پیش آئے تو بے سوچے سمجھے غصہ میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہیے۔

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، آپ ﷺ نے ہر بار یہ جواب دیا کہ ''غصہ نہ کرو۔'' اگر غصہ آ بھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔'' [2] ایک اور حدیث میں ہے کہ ''جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو ضبط کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعام خاص کا مستحق ٹھہرائے گا۔'' [3]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں ان کے ساتھ ملتا ہوں، [4] وہ کاٹتے ہیں میں بھلائی کرتا ہوں، وہ بدی کرتے ہیں، وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں، میں تحمل کو راہ دیتا ہوں، آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ ''اگر یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو، تو تم ان کے منہ میں گرم راکھ بھرتے ہو اور جب تک اس حالت پر قائم رہو گے اللہ کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی''۔ [5]

---

[1] ترمذی، ابواب البرّ والصلة، باب ماجاء فی التأنی والعجلة:۲۰۱۱۔ [2] بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب:۶۱۱۴، ۶۱۱۶۔ [3] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب فی کظم الغیظ:۲۰۲۱۔ [4] یعنی صلہ رحم کرتا ہوں۔ [5] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب صلة الرحم:۶۵۲۵ وادب المفرد امام بخاری، باب فضل صلة الرحم: ۵۲۔

رفق ولطف

رفق ولطف کے معنی یہ ہیں کہ معاملات میں سختی اور سخت گیری کے بجائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے۔ جو بات کی جائے نرمی سے، جو سمجھایا جائے وہ سہولت سے اور جو مطالبہ کیا جائے وہ میٹھے طریقہ سے کہ دلوں کو موہ لے اور پتھر کو بھی موم کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی آیتوں میں اپنے کو ''لطیف'' فرمایا ہے، [1] اور حدیثوں میں اس کا نام رفیق آیا ہے، [2] جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ہر قسم کے بندوں کے ساتھ ان کی خبر گیری اور رزق کا سامان پہنچانے میں رفق ولطف فرماتا ہے اور اپنے اس تلطف میں وہ ان کی اطاعت اور عدم اطاعت کی پروا نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بے سان گمان جس طرح امارت کے رتبہ تک پہنچایا اور ان کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعوں سے مصر لے آیا اور دشمن بھائیوں کو جس طرح ان کے سامنے نادم وشرمندہ کر کے ان کے آگے سرنگوں کر دیا، اس کو یاد کر کے وہ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝ ﴾ (١٢/ یوسف:١٠٠)

''بے شک میرا رب لطف کرنے والا ہے، جس بات کا چاہے، بے شک وہی علم والا حکمت والا ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کو جو مشکلیں پیش آئیں اور پھر وہی مشکلیں جس طرح ان کی کامیابی کا ذریعہ بنیں، ان کی حکمت کو اللہ ہی جانتا تھا اور اسی کو اس کی خبر تھی۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ رفق ولطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے:

﴿ اَللّٰهُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ۝ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:١٩)

''اللہ اپنے بندوں پر لطف فرماتا ہے، جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے اور وہی قوت والا غالب ہے۔''

اس آیت کے اوپر قیامت کے تعلق سے مومنوں اور کافروں کا ذکر ہے اور نیچے بھی ان دونوں قسموں کا تذکرہ ہے، بیچ میں یہ آیت ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطفِ الٰہی کافر ومومن دونوں کے ساتھ ہے کہ

---

[1] راغب اصفہانی ''لطیف'' کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہیں: ''وہ اپنے بندوں کی راہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے۔'' (لفظ لطف المفردات فی غریب القرآن، لام مع الطاء ص:٤٦٩) امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں نقل کرتے ہیں: ''اللہ کا نام لطیف اس لیے ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے اور ان کے لیے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے، لطیف اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے، ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا اور اس طرح ان کی مصلحتوں کا سامان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی ان کو نہیں ہوتا۔ ابن الاعرابی کا قول ہے، لطیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک ملائمت (رفق) سے پہنچا دیتا ہے۔'' (صفحہ ٤٧ الہ آباد)۔

امام غزالی کہتے ہیں: ''اس صفت کا مستحق وہی ہے جو نازک اور باریک مصلحتوں کو جانتا ہے، پھر ان کو نرمی کے طریق سے، سختی سے نہیں، اس تک پہنچاتا ہے جس کے حق میں وہ مفید ہیں۔ جب عمل میں نرمی اور ادراک میں لطافت ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہیں اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لیے ہے۔'' (روح المعانی تفسیر سورہ شوریٰ پارہ ٢٥، جزء ٢٥، ص:٢٥)

[2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل الرفق: ٦٦٠١۔

دونوں کو یکساں وہ رزق پہنچاتا ہے، [1] اور اسی لیے قیامت کو راز رکھنا بھی اس کے الطاف بے کراں کا ایک نتیجہ ہے۔

ملت حنیف کے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے کافر باپ کے حق میں جب دعائے مغفرت کے طالب ہوئے تو بارگاہ الٰہی میں گو یہ دعا مستجاب نہ ہوئی، [2] مگر ابراہیم علیہ السلام خلیل کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی، ارشاد ہوا:

﴿ إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَأَوَّٰهٌ حَلِيمٌ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۱۴)

''بے شک ابراہیم نرم دل بردبار تھے۔''

اسی طرح جب وہ قوم لوط کی گناہگار قوم کی سفارش کے لیے کھڑے ہوئے تو یہ درخواست بھی گو قبول نہ ہوئی، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدح وتوصیف فرمائی گئی کہ

﴿ إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّٰهٌ مُّنِيبٌ ۝ ﴾ (۱۱/ ھود:۷۵)

''بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل، حق کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔''

اواہ کے معنی میں مفسروں کا اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ جو بہت دعائیں مانگتا ہو، دوسرا اس کے معنی نرم دل بتاتا ہے اور تیسرا دردمند کہتا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ تینوں باتیں پوری اترتی ہوں، وہ ہر شخص کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے تھے، وہ دردمند تھے اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے، یا دل کے نرم تھے، اس لیے جلد پسیج جاتے تھے اور یہ اس لیے ایسا تھا کہ ملت حنیف کا داعی ہر ایک کو اپنے سے ملانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام فرعون جیسے سنگ دل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کے لئے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو تبلیغ کے یہ آداب سکھائے جاتے ہیں:

﴿ فَقُولَا لَهُۥ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُۥ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۴۴)

''سو تم دونوں اس سے نرم بات کہنا، شاید وہ نصیحت پائے یا (اللہ سے) ڈرے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی اور نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے اور اسی لیے دینِ حنیف کے مبلغِ اعظم اور توحید کے داعی اکبر محمد رسول اللہ ﷺ کو رحمتِ الٰہی نے خاص طور سے اس کا حصہ وافر عنایت فرمایا تھا۔ خود حضور ﷺ کو خطاب کرکے ارشاد ہوتا ہے:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ ٱللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ ٱلْقَلْبِ لَٱنفَضُّوا۟ مِنْ حَوْلِكَ ۖ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۵۹)

''تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تم مزاج کے اکھڑ اور دل

[1] تفسیر روح المعانی میں مقاتل کا یہی قول ہے صاحب روح المعانی اور امام فخر رازی بھی عموم کو واضح جانتے ہیں (ج ۲۵، ص:۲۵)۔

[2] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کی حالت پر اطلاع پاکر اس کے بعد اس سے اپنی علیحدگی ظاہر کردی۔

کے سخت ہوتے ،تو یہ لوگ تمہارے پاس سے تتر بتر ہو گئے ہوتے۔''

اس لیے ایک پیغمبر کے لیے یہ وصف نہایت اہم ہے،تا کہ لوگوں کو اس کی تعلیم ودعوت کی طرف میلان ہو اور وہ اس کے حلقہ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں اور اسی لیے رحمت عالم ﷺ کی ذاتِ پاک میں یہ وصف سب سے نمایاں طور پر ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری،عفو ودرگزر،چشم پوشی اور خوش خلقی غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام جن میں شانِ جمالی پائی جاتی ہے،یہی رفق وتلطف اور نرم دلی ونرم خوئی ہے۔جس طرح حسنِ فطرت زینت و آرائش سے دوبالا ہو جاتا ہے،اسی طرح رفق ونرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دو چند ہو جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی،فرمایا:

((ان الرفق لایکون فی شيء الا زانه ولاینزع من شيءٍ الا شانه)) [1]

''نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے،اس کو بدنما بنا دیتی ہے۔''

''جس چیز'' کا لفظ کتنا عام ہے،اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بنا دیتی اور سختی بگاڑتی ہے، الا یہ کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ نرم خو (رفیق) ہے اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا۔'' [2] جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو نرمی سے محروم رہا،وہ بھلائی سے محروم رہا۔'' [3] اور فرمایا کہ ''تین خصلتیں جس شخص میں ہوں گی اللہ اپنے سایہ کو اس پر پھیلائے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا،یعنی کمزور کے ساتھ نرمی کرنا،باپ ماں پر مہربانی کرنا اور غلام پر احسان کرنا۔'' [4]

اسی اخلاقی وصف کی تعلیم آپ ﷺ نے دوسرے الفاظ میں یوں دی:

((الا اخبر کم بمن یحرم علی النّار وتحرم علیه النّار، علی کل قریب هین سهل)) [5]

''کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ کون شخص آگ پر حرام ہے اور کس پر آگ حرام ہے،ہر اس شخص پر جو لوگوں سے قریب ہو،نرم ہو اور آسان ہو۔''

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فی فضل الرفق:٦٦٠٢۔

[2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فی فضل الرفق:٦٦٠١۔ [3] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فی فضل الرفق:٦٥٩٨ تا ٦٦٠٠۔ [4] ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب فیه أربعة أحادیث: ٢٤٩٤۔

[5] ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب فضل کل قریب هین سهل: ٢٤٨٨۔

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ "السام علیکم" یعنی تم کو موت آئے ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سمجھ گئیں اور انہوں نے جواب میں کہا "وعلیکم السام واللعنة" یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو، رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ " عائشہ ٹھہر جاؤ، اللہ تمام کاموں میں نرمی پسند کرتا ہے۔" بولیں ، یا رسول اللہ ﷺ! انہوں نے جو کچھ کہا کیا آپ ﷺ نے نہیں سنا، فرمایا: "میں نے بھی تو کہہ دیا کہ علیکم یعنی "تم پر۔" [1]

آنحضرت ﷺ کے جواب میں یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی ، مگر اس میں سختی کا نشان نہیں اور پھر اس طرح سے ہے کہ مخاطب ذرا سوچے تو خود بخود اس کا دل شرمندہ ہو۔ شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے، اس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص حدود الٰہی میں سے کسی حد کو توڑ ڈالے اور جماعت کو نقصان پہنچانے کے در پے ہو، چنانچہ کفار اور منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے رہیں، بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے در پے ہوں، تو ان کے شر کو روکنے اور ان کی سازشوں کے قلع و قمع کرنے کے لیے ان پر پوری سختی کی جا سکتی ہے، فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ ﴾ (٦٦/ التحریم:٩)

"اے پیغمبر ﷺ! کافروں اور دغا بازوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ ﴾

(٩/ التوبة:١٢٣)

"اے مسلمانو! اپنے نزدیک کے کافروں سے لڑتے جاؤ اور چاہیے کہ وہ تم میں کڑا پن پائیں۔"

اسی طرح شریعت کے گناہگاروں کو جب سزا دی جائے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کے اجرا میں نرمی نہ برتیں، مسلمان بدکار مردوں اور بدکار عورتوں کی سزا کے متعلق فرمایا:

﴿ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ﴾

(٢٤/ النور:٢)

"اور اللہ کے حکم چلانے میں تم کو ان دونوں پر ترس نہ آئے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔"

آنحضرت ﷺ کے مکارمِ اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، اس میں بھی نرمی اور

[1] بخاری، کتاب الادب، باب الرفق فی الامر کله: ٦٠٢٤۔

سختی کے مواقع میں یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا، البتہ جب احکام الٰہی کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ اس کو سزا دیتے تھے۔'' ❶ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک خاص باب میں اس قسم کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں، جن میں آپ ﷺ نے مسلمانوں بلکہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن تک پر کسی کسی بات میں سختی برتی ہے۔ ❷ حافظ ابن حجر اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں:

''گو امام بخاری اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تکلیفوں پر صبر کرتے تھے وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہے، لیکن اللہ کے حق میں آپ اس قدر سختی سے کام لیتے تھے جس کا اللہ نے حکم دیا تھا۔'' ❸

آنحضرت ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کرتے تھے کہ ''آسانی کرو، سختی نہ کرو۔'' ❹ شارحین حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نوافل و مباحات میں سختی نہ برتی جائے اور شریعت نے جس حد تک گنجائش اور وسعت رکھی ہو اس میں تنگی نہ کی جائے۔ ایک صحابی سے ایک دفعہ روزہ میں ایک شرعی غلطی ہوگئی، انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور کی خدمت میں لے چلو، ان سب نے معاملہ کی اہمیت کے ڈر سے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو انہوں نے اکیلے ہی خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر حقیقت حال عرض کی۔ ارشاد ہوا: ''ایک غلام کی گردن آزاد کرو۔'' وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ یا رسول اللہ ﷺ! اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہیں۔ فرمایا: ''لگاتار دو مہینے روزے رکھو۔'' گزارش کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! روزہ ہی میں تو یہ حرکت ہوئی، پھر روزہ رکھوں، فرمایا: ''ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔'' عرض پرداز ہوئے کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک میں رات گزاری ہے۔ فرمایا کہ ''صدقہ کے فلاں محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوہارے لے لو، اس سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا کر جو بچ رہے وہ خود کھاؤ۔'' وہ صحابی رضی اللہ عنہ ہنسی خوشی اپنی قوم میں واپس آئے اور اپنی روداد بیان کر کے بولے کہ میں نے تمہارے پاس تنگی اور بری رائے اور نبی ﷺ کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی۔ ❺

---

❶ بخاری، کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ: یسروا ولا تعسروا: ٦١٢٦۔ ❷ باب مایجوز من الغضب والشدة لامر اللّٰه تعالىٰ، رقم الباب (٧٥)۔ ❸ فتح الباری، ج ١٠، ص: ٤٢٩۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ: یسروا ولا تعسروا: ٦١٢٥۔

❺ سنن ابی داود، کتاب الطلاق، باب فی الظهار: ٢٢١٣۔

تواضع وخاکساری

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے، جس میں کوئی اس کا شریک نہیں:

﴿ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ (٤٥/ الجاثية: ٣٧)

''اور اسی کو بڑائی ہے، آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی زبردست ہے حکمت والا۔''

اس لیے بندوں کی شان نہیں کہ وہ کبریائی کریں، ان کی بندگی کی شان اس میں ہے کہ وہ تواضع و خاکساری اختیار کریں اور عاجزی وفروتنی برتیں۔

تواضع و خاکساری کے بہت سے مظہر ہیں، قرآن مجید نے ان میں سے نمایاں مظاہر کو لے کر بعض موقعوں پر ان کا حکم دیا ہے اور دوسرے موقعوں پر ان کو اپنے خاص بندوں کا وصف بتایا ہے، مثلاً: رسول اللہ ﷺ کو پہلے کفار سے درگزر کا، پھر مومنوں کے ساتھ پُر محبت تواضع کا حکم دیا ہے:

﴿ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (١٥/ الحجر: ٨٨)

''اور اپنا بازو مومنوں کے لیے جھکا دے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (٢٦/ الشعرآء: ٢١٥)

''اور اپنا بازو جھکا رکھ ان کے واسطے جو تیرے ساتھ ہوئے ہیں ایمان والے۔''

اولاد کو ماں باپ کے سامنے اسی پر محبت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آنا چاہیے:

﴿ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ ﴾ (بنیٓ اسرآئیل: ٢٤)

''اور ماں باپ کے لیے عاجزی کا بازو و مہر و محبت سے جھکا دے۔''

''خفضِ جناح'' یعنی بازو جھکا دینا، تواضع و خاکساری سے استعارہ ہے۔ جناح پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں، پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازوؤں کو جھکا دیتا ہے۔ اس سے یہ استعارہ [1] کیا گیا کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیتا ہے اور تکبر اور ترفع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کا یہ وصف بتایا ہے:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾

(٢٥/ الفرقان: ٦٣)

''اور رحمت والے (اللہ) کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں اور

[1] کتاب المثل السائر، باب النوع الثانی فی التشبیه، ص: ١٦٠ مطبوعه مصر: ١٣١٢ھ وتفسیر کبیر رازی تفسیر آیت جناح الذل، ج٥، ص: ٥٧٤ دار الطباعة العامرة۔

جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)۔''

قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ بندوں کو خاکساری کی تعلیم دینی تھی تو ان کو رحمت والے اللہ کے بندے کہہ کر نصیحت فرمائی گئی کہ اللہ جب رحمت اور مہر وکرم والا ہے تو اس کے بندوں میں خلق اللہ کے ساتھ تواضع اور ملنساری ظاہر ہو۔

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو یہ اخلاقی نصیحت کی:

﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ ۚ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۝ ﴾

(۳۱/ لقمان:۱۸۔۱۹)

''اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین پر اترا کر نہ چل (کیونکہ) اللہ کسی اترانے والے شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اختیار) کر اور (کسی سے بات کرے) تو ہولے سے بول (کیونکہ) بری سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے۔''

اس آیت میں خاکساری اور تواضع کے مختلف مظاہر بتائے ہیں، بات کرنے میں لوگوں سے بے رخی نہ کی جائے، زمین پر اکڑ کر نہ چلا جائے، چال ڈھال میں غرور کا شائبہ نہ ہو اور نہ آواز میں غرور کے مارے سختی اور کرختگی ہو۔ لیکن یہ خیال میں رہے کہ تواضع وخاکساری اور دنایت وپستی میں بڑا فرق ہے۔ تواضع وخاکساری کا منشا یہ ہے کہ انسان میں کبر وغرور پیدا نہ ہو اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے اور دنایت وپستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض کے لیے انسان اپنی خودداری کو کھودے۔ چنانچہ ایسے موقع پر جہاں خاکسارانہ روش سے انسان کا ضعف ظاہر ہو، وہاں اسلام نے عارضی اور نمائشی طور پر خوددارانہ کبر وغرور کا حکم دیا ہے۔ صحابہ جب عمرہ کے لیے آئے تو چونکہ مدینہ کے وبائی بخار نے ان کو کمزور کر رکھا تھا، اس لیے کفار نے طنز کیا کہ محمد ﷺ اور ان کے اصحاب ضعف کی وجہ سے خانہ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے، اس پر آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ طواف کے تین چکر اکڑ کر کریں، تا کہ مشرکوں پر ان کی طاقت کا اظہار ہو۔ [1]

قوت کے اظہار کا اصلی موقع جہاد میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر وغرور کو پسند کیا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''بعض غرور کو اللہ ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، جنگ وصدقہ کے موقع پر اترانا اللہ کو پسند ہے اور ظلم وفخر پر اترانا ناپسند۔'' [2]

---

[1] مسلم، کتاب الحج، باب استحباب الرمل فی الطواف:۳۰۵۵ وصحیح بخاری، کتاب المغازی، باب عمرۃ القضاء:۴۲۵۶۔ [2] ابو داود، کتاب الجهاد، باب ما یؤمر من انضمام...... ۲۶۲۹۔

بہر حال اسلام میں خاکساری ایک شریفانہ خلق ہے اور ضعف، ذلت، بیچارگی اور بے سروسامانی سے مختلف ہے، ضعف و ذلت سے انسان پست رتبہ ہو جاتا ہے، لیکن خاکساری اس کو بلند رتبہ بنا دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص اللہ کے لیے خاکساری کرتا ہے اللہ اس کو بلند کر دیتا ہے۔'' 1 ایک اور حدیث میں فرمایا کہ ''جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے، لیکن وہ خاکساری سے اس کو نہیں پہنتا تو اللہ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ ایمان کا جو حلّہ پسند کرے اس کو پہن لے۔'' 2

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لیے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دولت کا بے جا استعمال نہ کرنے پائے، جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو، تا کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے۔'' 3 اس سے معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشگوار لطافت پیدا کرنا ہے اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہیے۔

---

1 ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی التواضع: ۲۰۲۹۔ 2 ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب البناء کله وبال: ۲۴۸۱۔ 3 ابو داود، کتاب الادب، باب فی التواضع: ۴۸۹۵۔

خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے باتیں کرنے میں ایک دوسرے کے ادب واحترام اور لطف ومحبت کا پہلو ملحوظ رکھے، تاکہ آپس میں خوشگوار تعلقات پیدا ہوں اور باہم مروت اور محبت بڑھے۔ سلام کرنا، شکریہ ادا کرنا، حال پوچھنا، ایک دوسرے کو نیک دعائیں دینا، اچھی باتیں کرنا، اچھی باتیں سمجھانا، اسی ایک صفت کے مختلف جزئیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں بنی اسرائیل کو لوگوں کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا، اس کو قرآن پاک میں بھی دہرایا ہے:

﴿ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۳)

''اور کہو لوگوں سے اچھی بات۔''

اس اچھی بات کہنے میں لوگوں کے فائدہ اور کام کی باتوں کا کہنا، نصیحت کرنا، اچھی باتوں کی تعلیم اور تلقین کرنا بھی داخل ہے۔ ایک اور آیت میں یہی حکم دوسرے لفظوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پہچان بن جاتا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ؀ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۵۳)

''اور اے (پیغمبر)! میرے بندوں سے کہہ دے کہ وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو، بے شک شیطان جھڑپواتا ہے آپس میں، بےشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔''

آیت کے پچھلے حصہ میں دعویٰ کی دلیل بھی دے دی گئی ہے کہ خوش گوئی اور خوش کلامی آپس میں میل ملاپ پیدا کرتی ہے اور بدگوئی و بدکلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے، جو شیطان کا کام ہے۔ وہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں غصہ، نفرت، حسد اور نفاق کے بیج بوتا ہے۔ اس لیے اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ نیک بات بولیں، نیک بات کہیں، اچھے لہجہ میں کہیں اور نرمی سے کہیں کہ آپس میں میل ملاپ اور مہر ومحبت پیدا ہو۔ اسی لیے تنابز بالالقاب یعنی ایک دوسرے کو برے لفظوں اور نفرت اور تحقیر کے خطابوں سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے۔ کسی کو کافر یا منافق اور تحقیر وکراہت کے دوسرے القاب سے مخاطب کرنا گویا اس میں اس اچھی بات کے خلاف جو آپ اس کو سمجھانا چاہتے ہیں، پہلے ہی سے نفرت اور ضد کا جذبہ پیدا کر دینا ہے، فرمایا:

﴿ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ ﴾

(۴۹/ الحجرات:۱۱)

''اور نہ تم آپس میں ایک دوسرے کو طعن دو اور نہ چڑ کا نام لے کر پکارو، ایمان کے بعد گناہگاری برا نام ہے۔''

اسی لیے برائیوں کے تذکروں اور بدگوئیوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، ارشاد ہے:

﴿ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ﴾ (٤/ النسآء: ١٤٨)

''اللہ کو بری بات کا پکارنا خوش نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، (اس کو حق ہے کہ ظالم کے ظلموں کو بیان کرے)۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے، نہ لعنت بھیجتا ہے، نہ بدزبانی اور فحش کلامی کرتا ہے۔'' [1] اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتوں سے بہت اونچی ہونی چاہیے۔ اس کی زبان سے حق وصداقت، بہبودی وخیر خواہی اور نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی اور بات نہ نکلے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو اللہ اور روز جزا پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اچھی بات بولے، ورنہ چپ رہے۔'' [2] اس حدیث پاک میں ادھر اشارہ ہے کہ اللہ اور روز جزا پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ کلمہ خیر کے سوا کچھ اور زبان سے نہ نکلے، کیونکہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنا یہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا وہ بھرے گا۔ اگر تمہیں بھی کوئی برا کہے تو ہو سکے تو چپ رہو کہ اس کی جزا آج نہیں تو کل اس کو مل کر رہے گی۔ ایک دفعہ آپ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا اور روئے انور پر اس کی تکلیفوں کے تصور سے اثر ظاہر ہوا۔ پھر ارشاد فرمایا: ''دوزخ سے بچو، اگرچہ چھوہارے کے ایک ٹکڑے کی خیرات سے ہو، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی اچھی بات سے۔'' [3]

ایک دفعہ آپ ﷺ نے جنت کا ذکر فرمایا اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا، ایک بدوی صحابی رضی اللہ عنہ مجلس میں حاضر تھے، بے تابانہ بولے کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ جنت کس کو ملے گی؟ فرمایا: ''جس نے خوش کلامی کی، بھوکوں کو کھلایا، اکثر روزے رکھے اور اس وقت نماز پڑھے جب دنیا سوتی ہو۔'' [4]

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھی بات صدقہ ہے۔'' [5] یعنی جس طرح صدقہ دے کر کسی غریب کی حاجت روائی اور دل جوئی کی جاتی ہے، اسی طرح زبان کی مٹھاس سے اس کے زخموں پر پھاہا رکھا جا سکتا ہے اور سچی سعی وسفارش سے اس کو مدد پہنچائی جا سکتی ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! نجات کیونکر ملے؟ فرمایا: ''اپنی زبان پر قابو رکھو اور تمہارے گھر میں تمہاری گنجائش ہو اور اپنے گناہوں پر رویا کرو۔'' [6] ایک دفعہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ آپ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ڈر ہے؟ آنحضرت ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا: ''اس کا ڈر ہے۔'' [7]

---

[1] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی اللعنة: ۱۹۷۷۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام الجار......: ۱۷۳۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب طیب الکلام: ۶۰۲۳۔

[4] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی قول المعروف: ۱۹۸۴۔ [5] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب فضل من حمل متاع صاحبه فی السفر: ۲۸۹۱۔ [6] ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء فی حفظ اللسان: ۲۴۰۶۔

[7] ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء فی حفظ اللسان: ۲۴۱۰۔

ایثار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے، خود بھوکا رہے اور دوسرے کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے اور دوسروں کو آرام پہنچائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہ تھا کہ مکہ کے مہاجر جب بے خانماں ہو کر اور اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ آئے تو انصار نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کو اپنے گھر دیے، باغ دیے، کھیت دیے، اپنی محنتوں میں ان کو شریک کیا [1] اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر ان کو آرام پہنچایا۔ پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور آنحضرت ﷺ نے دو انصاریوں کے سوا باقی ساری زمین مہاجروں کو دے دی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور ان کی مدح وستائش کی۔ [2]

﴿ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (۵۹/ الحشر:۹)

''اور ان کے واسطے جنہوں نے ان (مہاجروں کی آمد) سے پہلے اس مقام (مدینہ) میں اور ایمان میں جگہ پکڑی اور محبت رکھتے ہیں، اس پر جو اپنا گھر چھوڑ کر ان کے پاس چلا آیا اور ان (مہاجروں) کو دیے جانے سے دل میں کوئی مطلب نہیں رکھتے اور اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو (ان مہاجر بھائیوں کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔''

بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ ''میں اس کو انصار کی جاگیروں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں۔'' ان ایثار کے پیکروں نے عرض کی، جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اتنا ہی نہ ملے، ہم کو یہ منظور نہیں۔ فرمایا ''اگر یہ منظور نہیں تو صبر کرو، میرے بعد تم کو یہ تکلیف پہنچے گی کہ لوگ لے لیں گے اور تم کو نہیں پوچھیں گے۔'' [3]

ایک دفعہ ایک مسلمان خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر بن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت

---

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اخاء النبی ﷺ بین المهاجرین ۳۷۸۰تا۳۷۸۲۔

[2] تفسیر آیت ذیل ابن جریر طبری، پارہ ۲۸، ج۲۸، ص: ۲۷۔

[3] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب قول النبی ﷺ للانصار...: ۳۷۹۴۔

میں پیش کی، آپ ﷺ نے ضرورت مند ہو کر اس کے اس تحفہ کو قبول کر لیا۔ اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ مجھے عنایت ہو، آپ نے اسی وقت اتار کر ان کے حوالہ کر دی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس کی حاجت تھی اور آپ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے۔ تم نے کیوں مانگ لی؟ بولے، ہاں میں نے تو برکت کے لیے لی ہے کہ یہی چادر میرا کفن بنے۔ ❶

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا۔ کاشانہ نبوی ﷺ میں اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص آج رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔'' یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی اور وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ بولیں، صرف بچوں کا کھانا۔ بولے، بچوں کو سلا دو اور چراغ کو بجھا دو۔ ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے، البتہ مہمان پر ظاہر کریں گے کہ کھا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ صبح کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمہارے اس حسن سلوک سے بہت خوش ہوا۔'' ❷

بعض روایتوں میں ہے کہ اوپر کی آیت میں انصار کے جس ایثار کی تعریف کی گئی ہے، اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے ❸ لیکن قرآن پاک کا سیاق وسباق عموم کو چاہتا ہے، جس میں یہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعے بھی شامل ہوں گے۔

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب حسن الخلق والسخاء: ٦٠٣٦ وکتاب الجنائز، باب من استعد الکفن: ١٢٧٧۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ. ٥٣٥٩ وصحیح بخاری، کتاب التفسیر: ٤٨٨٩۔ ❸ ایضاً۔

اعتدال اور میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے، جس میں وہ منفرد ہے۔ اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسئلوں کے افراط وتفریط کے بیچ سے نکلا ہے۔ قرآن پاک نے مسلمانوں کو ﴿ امةً وسطًا ﴾ ''بیچ کی امت'' کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے، ان میں یہ بھی ہے کہ ان کا مذہب افراط وتفریط کے درمیان ہے، [1] اس لیے اس نے اکثر معاملوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ عبادات میں بھی اس اصول کو وہ نہیں بھولا ہے۔ دعا یا نماز میں ہماری آواز کتنی ہو، ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۱۱۰)

''اور تو نہ پکار اپنی دعا (نماز) میں اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ میں راہ۔''

یعنی نہ چلا کر دعا کی جائے یا نماز پڑھی جائے کہ نمائش ہو جائے، یا مخالف اس کو سن کر برا بھلا کہے اور نہ بالکل چپکے چپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سن سکیں، بلکہ دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کی جائے۔

ہماری چال کیسی ہو اس کی نسبت حضرت لقمان علیہ السلام کے نصائح میں ہے:

﴿ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ ﴾ (۳۱/ لقمان: ۱۹) ''اور چل بیچ کی چال۔''

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال میں متانت اور وقار نہ باقی رہے اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ ریا کار زاہدوں کی نمائشی چال بن جائے۔ [2]

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ سارے مذہبوں نے اس پر تاکید کی ہے اور جو جس قدر زیادہ لٹا سکے اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے اس راہ میں بھی بے اعتدالی سے پرہیز کیا ہے اور اس کو اچھا نہیں سمجھا ہے کہ دوسروں کو دے کر تم خود اتنے محتاج بن جاؤ کہ بھیک مانگنے کی نوبت آ جائے اور محتاجوں میں ایک نئے محتاج کا اور اضافہ ہو جائے۔ فرمایا:

﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۲۹)

''اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن میں باندھ لے اور نہ اس کو بالکل کھول دے کہ تو بیٹھ جائے ملامت کا نشانہ بن کر تھکا ہارا۔''

مسلمانوں کی اخلاقی خصوصیتوں کے سلسلہ میں کہا:

﴿ وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۶۷)

---

[1] تفسیر کبیر رازی تفسیر آیت مذکور (بقرہ)، ج۱، ص: ۵۳۲۔ [2] ابن جریر طبری تفسیر سورۃ لقمان، ج۲۱، ص: ۴۴؛ روح المعانی تفسیر سورۃ لقمان جزء ۲۱، ص: ۸۱۔

''اور جو خرچ کریں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ بہت تنگی کریں اور ہو اس کے درمیان اعتدال سے۔''

یعنی نہ اسراف ہو، نہ بخل ہو، درمیان کی چال ہو۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اکلفوا من الاعمال ما تطیقون)) [1]

''اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کر سکو۔''

''عمل'' کا لفظ گو یہاں عام ہے، مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد نماز و روزہ وغیرہ عبادتیں ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھا سکو اور آخری دم تک نباہ سکو، دوسری اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے۔ مسند بزار میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ صحابی کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [2]

((ما احسن القصد فی الغنی، ما احسن القصد فی الفقر ما احسن القصد فی العبادۃ))

''دولت مندی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے، محتاجی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے، عبادت میں درمیانگی کتنی اچھی ہے۔''

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولت مند ہو کہ انسان قارونِ وقت بن کر حق سے غافل ہو جائے، نہ اتنا محتاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے۔ لوگ دولت مند ہو کر اس قدر شان و شکوہ عز و جاہ اور عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ محتاج ہو کر اس قدر غنی اور متبذل ہو جاتے ہیں کہ صبر اور خودداری اور تمام شریفانہ اوصاف کھو دیتے ہیں اور یہ بھی بے اعتدالی ہے۔ ان دونوں حالتوں میں اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولت مندی کی حالت میں نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہیے، نہ محتاجی کی حالت میں اپنی حیثیت سے گر جانا چاہیے۔ عبادت سے بڑھ کر اسلام میں کوئی نیکی کا کام نہیں۔ اسلام نے اس میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے۔ نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھندوں کے لائق نہ رہے اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہو جائے۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا واقعہ سیرت میں کئی دفعہ گزر چکا ہے کہ انہوں نے جب راتیں نمازوں اور دن روزوں میں بسر کرنا شروع کیا تو آنحضرت ﷺ نے ان کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی اور فرمایا: ''کہ تمہارے ذمہ اور بھی حق ہیں۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل: ٦٤٦٥ وفتح الباری، ج ١١، ص: ٢٥٦۔

[2] بروایت کنز العمال جلد ثانی، ص:٧۔

خودداری یا عزت نفس

یہ وہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے زندگی میں اس کے موقعے کثرت سے پیش آتے ہیں، اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے، کھانے پینے، اوڑھنے پہننے غرض معاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے، جس میں یہ وصف نہ ہوگا، اس میں نہ نظر کی بلندی ہوگی، نہ خیال کی رفعت، نہ اخلاق کی اونچائی نہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت ہوگی، نہ اس کی باتوں کا لحاظ کیا جائے گا اور نہ اس کی طرف لوگ متوجہ ہوں گے اور نہ اس کو کسی مجلس میں وقار حاصل ہوگا۔ یہ عزت و وقار سب سے پہلے اس بلند و برتر ذات الٰہی میں ہے جو ساری عزتوں کا مرکز ہے، چنانچہ قرآن پاک میں بہتر موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام عَزِیْزٌ لیا گیا ہے عزیز کے معنی ہیں عزت والا [1] اور غالب، کہیں کہیں عَزِیْزٌ کے ساتھ قَوِیٌّ (قوت والا) یا مُقْتَدِرٌ (اقتدار والا) بھی کہا گیا ہے۔ اس لیے اصلی عزت اسی کی ہے اور وہی سچی عزت ہے، جو اس کے وسیلہ سے حاصل ہو اسلام جب کمزور تھا تو منافق لوگ ادھر مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور کافروں کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ و عزت کے سبب سے ان کی دوستی کے بھی طلب گار تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی میں کھول دیا:

﴿ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴾ (٤/ النسآء:١٣٩)

''کیا ان کے پاس عزت چاہتے ہیں تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری خدا کے واسطے ہے۔''

فرمایا، اگر عزت کی تلاش ہے تو وہ خدا کے پاس ہے:

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ﴾ (٣٥/ فاطر:١٠)

''جو عزت چاہے تو عزت تو ساری اللہ کی ہے۔''

﴿ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ﴾ (٣/ آل عمران:٢٦)

''اے خدا! تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔''

ایک دفعہ ایک غزوہ میں منافقوں کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوٹ کر مدینہ کے معززان ذلیل لوگوں یعنی مسلمانوں کو یا (نعوذ باللہ) محمد ﷺ کو نکال دیں گے، [2] اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (٦٣/ المنافقون:٨)

---

[1] عزۃ کا لفظ قرآن میں شدت، غلبہ، عز و شرف اور نخوت (حمیت) کئی معنوں میں آیا ہے، اس لیے ہر جگہ اس کے وہ معنی لیے جائیں گے، جو سیاق و سباق کے مناسب ہو، اس کا اصل مفہوم جو اس کے سب معنوں میں مشترک ہے، یہ ہے: ''کسی کا ایسی حالت و منزلت میں ہونا کہ اس کو کوئی دبا نہ سکے۔'' دیکھو لسان العرب، ج ۲ ص:۷۶۴ و مفردات راغب اصفہانی ص:۳۳۶ و ابن جریر طبری آیات عزت و سورۂ بقرہ و نساء و ص و منافقون۔ [2] صحيح بخاری، کتاب التفسير، تفسير سورة المنافقون:٤٩٠٧۔

''اور عزت تو اللہ کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے، لیکن منافق نہیں جانتے۔''

اس آیت پاک نے مسلمانوں کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی چھینی نہ جائے گی، اس لیے ہر مسلمان کا سر ہر باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہیے۔ اور اس کو اپنی دینی خودداری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہیے اور اسی لیے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آنا چاہیے، تعلیم محمدی ﷺ کے اثر سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل اس صحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب کفار کے ساتھ صلح کے شرائط پر جن کو آنحضرت ﷺ نے منظور فرمایا تھا، اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ ان کے اندر کام کر رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم حق پر اور یہ کافر باطل پر نہیں ہیں، ارشاد ہوا: ''بے شک ایسا ہی ہے۔'' عرض کی، تو پھر ہم یہ مذہبی ذلت کیوں برداشت کریں [1] ارشاد ہوا: ''میں خدا کا رسول ہوں اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی محدود نظر جہاں تک کام کر رہی تھی رسولِ خدا ﷺ کی نظر اس کے بہت آگے تھی اور واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا۔

غزوۂ خندق میں آنحضرت ﷺ نے انصار کے سر سے جنگ کو ٹالنے کے لیے قبیلہ غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ ان کو مدینہ کی پیداوار (کھجور) کا تہائی حصہ دیا جایا کرے گا، لیکن جب انصار رضی اللہ عنہ کے سرداروں کو بلا کر آپ ﷺ نے مشورہ کیا تو انہوں نے عرض کی:

''یا رسول اللہ ﷺ! جب ہم بتوں کو پوجا کرتے تھے اور اللہ سے بے خبر تھے، تب تو ان کو ہم سے لینے کی ہمت نہیں ہوئی اور اب جب کہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے اور اس کے اور حضور ﷺ کے بدولت ہم عزت پا چکے ہیں۔ ہم ان کو یوں اپنا مال دینا منظور کریں گے؟ خدا کی قسم! ہمیں اس معاہدہ کی ضرورت نہیں۔'' [2]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب خلافت کے زمانہ میں قیصر و کسریٰ کے مقابلہ میں صف آرا تھے، ان کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسریٰ کے درباروں میں بے دھڑک چلا جاتا تھا اور دلیری و آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا، مسلمان جب تک مسلمان رہے، یہی خیال ان کی ہر قسم کی حوصلہ مندیوں اور اولوالعزمیوں کا باعث تھا اور ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بحیثیت مسلمان کے اپنی مذہبی عزت اور خودداری کا احساس رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ بحیثیت مسلمان کے اس کا پایہ بہت بلند ہے اور ہر وقت اس کے کان میں یہ آواز رہتی ہے:

﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۱۰)

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲۔ [2] سیرۃ ابن ہشام، الخندق وقریظہ والنضیر، ج ۲، ص: ٦١ و تاریخ طبری ذکر واقعۃ احزاب بسند، ج ۳، ص: ۱۴۷۴۔

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی سربراہی) کے لیے ظہور میں لائی گئی۔''

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے عرض کی کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ میں غرور ہے، فرمایا: ''غرور نہیں خودداری (عزت) ہے، یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مفلسی نہیں'' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (٦٣/ المنافقون:٨) ایک مسلمان صالحہ بی بی کے کپڑے پرانے تھے، تو بولیں، کیا میں مسلمان نہیں، یہ وہ عزت ہے جس کے ہوتے ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہیں۔

شیخ ابوحفص سہروردی کہتے ہیں کہ خودداری (عزت) غرور سے الگ چیز ہے، کیونکہ خودداری اپنی ذات کی حیثیت کو جاننے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے کہ وہ فانی باتوں کی پستی میں نہ پڑ جائے اور غرور اپنی ذات کی اصلی حیثیت کو فراموش کر جانے اور اس کو اس کی جگہ سے اوپر لے جانے کو کہتے ہیں۔ [1] یہ خودداری عین شرافت ہے، جس میں یہ خودداری نہیں، لوگوں کی آنکھوں میں اس کا وقار نہیں۔ اس وقار اور خودداری کے لیے اگر ہاتھ میں قدرت نہ ہو یا مصلحت نہ ہو تو بہت سی باتوں سے اعراض اور درگزر کرنا پڑتا ہے۔ قرآن میں مسلمانوں کے وصف کے سلسلہ میں ہے:

﴿ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾ (٢٥/ الفرقان:٧٢)

''اور جب وہ ہو نکلیں بیہودہ باتوں کی طرف سے تو گزر جائیں شریفانہ۔''

یعنی اس شریفانہ انداز، رکھ رکھاؤ اور خودداری کی شان سے گزر جائیں کہ نہ وہ آپ ادھر متوجہ ہوں اور نہ ان شریروں کو انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے۔ اس اخلاقی خودداری، اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک ایک بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے، چال ڈھال، بول چال، لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہو، لیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھا پن یا تنگ ظرفی یا غرور و نمائش کی بو تک نہ آئے، یعنی اس میں اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کا جزو شامل نہ ہو، یہی چیز ہے جس سے خودداری، غرور اور نمائش میں فرق و امتیاز کیا جا سکتا ہے، چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔'' اس پر ایک شخص نے کہا کہ مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے، مطلب یہ کہ یہ تو غرور میں داخل نہیں، ارشاد ہوا کہ ''خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے، غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگوں کی تحقیر کی جائے۔'' [2] اسلام میں صاف ستھرے رہنے کا جو حکم ہے طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسروں کی نظر سے گرنے نہ پائے، کیونکہ گندے آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے، ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے تو فرمایا کہ ''کیا

---

[1] یہ اقوال امام رازی، تفسیر کبیر تفسیر سورۃ المنافقون، ج ٦، ص: ٢٩٧ اور صاحب روح المعانی نے سورۂ منافقون جزء ٢٨، ص: ١٠٢ کی آیت ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ﴾ کی تفسیر میں لکھے ہیں۔ [2] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الکبر: ١٩٩٩۔

اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟'' ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا: ''کیا کپڑے دھونے کے لیے اس کو پانی میسر نہ تھا۔'' ❶ ایک شخص نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا، فرمایا: ''تمہارے پاس کچھ مال ہے؟'' اس نے کہا، اونٹ بکری گھوڑے تمام سب کچھ ہیں۔ ارشاد ہوا کہ ''جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل اور احسان کا اثر تمہارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہیے۔'' ❷

خودداری کا سب سے بڑا مظہر وقار یعنی سنجیدگی اور متانت ہے، اسی لیے اسلام نے ہر حالت میں وقار کے قائم رکھنے کی ہدایت کی ہے، نماز سے زیادہ اور کون سی عبادت ضروری ہوسکتی ہے، لیکن اس کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِذَا سَمِعْتُمُ الْاِقَامَةَ فَامْشُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ وَعَلَيْكُمْ بِالسَّكِيْنَةِ وَالْوَقَارِ وَلَا تُسْرِعُوْا)) ❸

''جب تم اقامت سنو تو نماز کے لیے سکون اور وقار کے ساتھ چلو، جلدی نہ کرو۔''

لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جب تکبیر سنتے یا رکوع میں جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہیں تو بے تحاشا بھاگتے ہیں کہ رکعت نہ چلی جائے، مگر یہ چیز متانت کے خلاف ہے اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ آہستہ چلنا، نگاہ کا جھکائے رکھنا، آواز کا پست کرنا اور ادھر ادھر نہ دیکھنا اس وقار میں داخل ہے۔ وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے اور اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ ابوداود نے کتاب الادب باب الوقار میں یہ حدیث نقل کی ہے:

((الهدى الصالح والسمت الصالح والاقتصاد جزء من خمسة وعشرين جزء من النبوة)) ❹

''نیک طور طریق، نیک انداز اور میانہ روی، نبوت کے پچیس اجزا میں سے ایک جزو ہے۔''

کیونکہ ان ہی اخلاقی خوبیوں کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے اور وہ خود بھی ان خوبیوں کی بدولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کر کے خوددار بنتا ہے۔

صحیح بخاری میں ایک اور لفظ دَلّ کا ہے اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ انسان رفتار، گفتار، شکل وصورت، وضع ولباس اور اپنی عام روش میں باوقار رہے اور نیک مسلمانوں کا طور وطریقہ اختیار کرے، اسلام نے خصالِ فطرت یعنی ناخن اور مونچھ کے ترشوانے اور ختنہ کرانے کا جو حکم دیا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل میں نظر آتا ہے سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا، وقار۔ بولے، خداوندا! میرے وقار کو اور بڑھا۔ ❺

---

❶ ابوداود، کتاب اللباس، باب فی الخلقان وفی غسل الثوب: ٤٠٦٢۔ ❷ ایضًا: ٤٠٦٣۔

❸ بخاری، کتاب الاذان، باب لا یسعی الی الصلوة ولیأتها بالسکینة والوقار: ٦٣٦۔

❹ ابو داود، کتاب الادب، باب فی الوقار: ٤٧٧٦۔ ❺ ادب المفرد، باب الختان للکبیر: ١٢٥٠۔

فقر وفاقہ کی حالت یا حرص وطمع کے موقع پر انسان سے خودداری ظاہر ہوتی ہے،اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں تعفف اور استعفاف ہے اور شریعت میں وہ ایک قابلِ ستائش اخلاقی وصف ہے اور اسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر خدا تعالیٰ نے اصحاب صفہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ؗ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ ۚ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۳)

''(خیرات تو) ان حاجت مندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھر سے بیٹھے ہیں، ملک میں کسی طرف کو جا نہیں سکتے ، بے خبر ان کی خودداری (کی وجہ) سے ان کو غنی سمجھتا ہے، تو (ان کو دیکھے تو) ان کی صورت سے ان کو (صاف) پہچان جائے (کہ محتاج ہیں) وہ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔''

اس آیت میں فقر وفاقہ کی حالت میں خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے،اس کا اندازہ اس آیت کے بعض فقروں کی تفسیر سے ہوسکتا ہے،صاحب کشاف نے ﴿لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''وہ سوال تو کرتے ہیں، لیکن لجاجت واصرار کے ساتھ نہیں کرتے ، بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہیں۔'' [1] لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں ، کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ ان کی خودداری کی وجہ سے جو لوگ ان کے حال سے ناواقف ہیں، ان کو دولت مند سمجھتے ہیں تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی ، اصحاب صفہ صاحب احتیاج ہونے کے باوجود اس لیے سوال نہیں کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے، جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے، لیکن اپنی حاجت سے فقر وفاقہ کا اظہار کرتا ہے، تو اس کی یہی خاموشی لجاجت واصرار کا سوال ہے، کیونکہ حاجت کی علامتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے اور خاموشی اسی بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں، اس لیے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے تو ان کے لیے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے،اس لیے یہ حالت خود لجاجت واصرار کا سوال ہے،پس جب خدا یہ کہتا ہے کہ اصحاب صفہ لوگوں سے لجاجت واصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ اپنے پھٹے حال کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے ، جو لجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے، بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے ہیں اور اپنے فقر و فاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے۔ [2]

---

[1] تفسیر سورۃ بقرۃ، ج۱، ص:۱۷۹۔ [2] تفسیر کبیر جلد ثانی، ص: ۵۲۶، ۵۲۷۔

سوال کی سب سے مبتذل صورت گداگری ہے اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت کی ایک حدیث میں ہے کہ ''جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا۔'' یہ اس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزت و آبرو گنوادی ہے، چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے، رسول اللہ ﷺ سے کچھ مانگا آپ ﷺ نے دے دیا، پھر سوال کیا اور آپ ﷺ نے پھر دیا، لیکن جب سب مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ ''میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم سے بچا کر اس کو جمع نہ کروں گا، جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے، خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے، خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے، خدا اس کو صبر دیتا ہے، خدا نے صبر سے بڑا عطیہ کسی کو نہیں دیا۔''

فقر و فاقہ کی حالت میں عام آدمیوں سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری کے منافی ہے اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اس کی احتیاج دور نہیں ہوتی، لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے، ممکن ہے کہ خدا اس کو بے نیاز کر دے، خواہ مرگِ ناگہانی کے ذریعہ سے، خواہ فوری مال کے ذریعہ سے۔''

روزمرہ کے معمولی کاموں میں لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا برا نہیں جانتے، لیکن کمالِ خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں میں بھی احتیاط قائم رہے، مثلاً: اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ ٹوپی اٹھا دو، میز پر کتاب رکھ دو تو گو بظاہر یہ سوال خودداری کے منافی نہیں معلوم ہوتا، لیکن اگر وہ ناگواری یا سختی سے اس کا انکار کر دے تو یقیناً اس شخص کی خودداری کو صدمہ پہنچے گا۔ اسی لیے کمالِ خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستوں سے بھی احتراز کیا جائے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں سے چند باتوں پر بیعت لی جن میں ایک بات یہ تھی: ((لَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا)) ''تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا۔'' ان میں سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پر ان کا کوڑا گر جاتا تھا، تو بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت ﷺ سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی، آپ ﷺ نے پہلے تو اس کو اجازت ہی نہیں دی، پھر فرمایا کہ ''اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے تو صالحین سے سوال کرو۔'' [1] صالحین کی تخصیص غالباً اسی لیے کی گئی ہے کہ یہ لوگ باعزت طریقہ پر سوال پورا کریں گے، ورنہ رفق و ملاطفت کے ساتھ اس کو رد کر دیں گے۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اسلام اور ایمان کی نعمت وہ عزت اور وہ

[1] ابوداود، کتاب الزکوۃ، باب کراہیۃ المسئلۃ: ۱٦٤٢، ۱٦٤٣ وباب فی الاستعفاف: ۱٦٤٤ تا ۱٦٤٦ میں یہ کل حدیثیں ہیں۔

دولت ہے جس کے مقابلہ میں ساری نعمتیں اور دولتیں ہیچ ہیں، جو مسلمان ہے وہ خدا کے سوا کسی کی پروا نہیں کرتا، وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا، وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا اور بحیثیت مسلمان کے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کے لیے ہے اور اس کی عطا سے رسول کے لیے ہے اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کے لیے ہے، اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت کو قائم رکھنا ہے اور اسی فیض تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ چڑھا ہے کہ جب ہم کسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہیں تو یہ کہہ کر اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہیں کہ مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو، گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزت ہے، جس کے برقرار رکھنے کے لیے اس کو ہر قسم کی برائی سے پاک اور ہر دنائت اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہیے۔ اس باب کا خاتمہ ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہیں، جس سے اسلامی خودداری کی حقیقت ظاہر ہوگی کہ وہ تزک واحتشام، تکلف وتصنع اور جاہ وحشم کی نمائش کا نام نہیں، بلکہ یہ ہے کہ نفس کے تواضع اور دل کی خاک ساری کے ساتھ اسلام کی عزت اور حق کا فخر اس کو اونچا کر دے کہ اگر وہ غریب ومفلس اور کمزور بھی ہو تو وہ ہر ظاہری قوت کے سامنے بے نیاز اور باطل طاقت کے مقابلہ میں سربلند رہے اور اگر وہ صاحب امارت وحکومت ہو تو اپنے رعب ودبدبہ کے لیے ظاہری نمائشی چیزوں کے بجائے حق کی طاقت کو کافی سمجھے۔

بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رومیوں سے بیت المقدس کی کنجی لینے کو شام جا رہے تھے، جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالار اسلام حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کچھ مسلمانوں کو لے کر استقبال کو نکلے، جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کچھ پانی تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ناقہ سے اتر آئے، پاؤں سے چرمی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لیے اور ناقہ کی مہار پکڑ کر پانی میں گھسے اور اسی شان سے اسلام کا فرمانبردار رومیوں کے مقدس شہر میں داخل ہونے کے لیے بڑھا، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی، یا امیر المومنین! آپ یہ کیا کر رہے ہیں کہ موزے اتار کر آپ نے کندھے پر ڈال لیے ہیں، اونٹنی کی نکیل آپ کے ہاتھوں میں ہے اور آپ اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اس کو پانی میں لے چل رہے ہیں، یہ وہ موقع ہے کہ سارا شہر آپ کے دیکھنے کو امنڈ آیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، اے ابوعبیدہ! اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دے کر امت محمد ﷺ کے لیے عبرت بناتا، ہم سب سے ذلیل قوم تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی تو جو عزت خدا نے ہم کو دی ہے، اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہیں گے، تو خدا ہمیں ذلیل کرے گا۔ [1]

[1] مستدرك حاكم، كتاب الايمان، ج ١، ص: ٦٢، على شرط الصحيحين -

شجاعت اور بہادری

قدیر (قدرت والا) قادر، مُقْتَدِرُ، قَوِیّ، جَبّار، (جس کو کوئی پچھاڑ نہ سکے) قاھر (جو ہر کسی کو دبا دے) غَالِبُ اور عَزِیْز اللہ تعالیٰ کے کمالی اوصاف ہیں، جب کسی بندہ میں ان اوصاف کا کچھ پرتو پڑتا ہے تو اس میں اخلاقی وجسمانی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے۔

تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے، جس نے اپنے پیروؤں میں شجاعت وبہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اسلام سے پہلے دنیا کی عام حالت پر نظر کر کے لوگوں میں یہ خیال پیدا تھا کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم وستم اور خون ریزی اسی قوت کا نتیجہ ہے، اس لیے یہ مٹانے کے قابل ہے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے یہ نکتہ سمجھایا کہ قوت بذاتہ کوئی بری چیز نہیں، بلکہ اس کے استعمال کا موقع برا ہوتا ہے، اس لیے تعلیم محمدی ﷺ نے بہادری وشجاعت کو سراہا اور اس کے موقعوں کی تعیین کی کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لیے کام میں لانا چاہیے، کیونکہ اگر نیکوں میں یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم وستم کی روک تھام اور باطل قوتوں کا بہادرانہ مقابلہ نہ کر سکیں اور نہ اسلام کا مقدس فریضہ جہاد کامیاب ہو سکے۔

ان مسلمانوں کی جو سختیوں اور مصیبتوں کا بہادرانہ مقابلہ کریں اور لڑائیوں میں داد مردانگی دیں، اللہ تعالیٰ تعریف فرماتا ہے:

﴿ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''اور جو سختی اور تکلیف اور لڑائی کے وقت ثابت قدم رہیں، وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی متقی ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ آ پڑے تو اس میں ثابت قدمی اور بہادری وہ صفت ہے، جو اپنے موصوف کو راست باز اور متقی بننے میں مدد دیتی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جو کسی جماعت اور ملت کا فرد ہو، وہ زبان سے کہے یا نہ کہے، اس کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت میں اپنی جان تک کی بازی لگا دے اور جب وہ ایسا کر گزرتا ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ اور ملت کی نظر میں راست باز اور سچا ٹھہرتا ہے۔ جو جذبہ اس کو اس فرض پر آمادہ کرتا ہے، وہی اتقا کا منشا ہے، ایک اور موقع پر مسلمانوں کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْھُمُ الْاَدْبَارَ ۝﴾

(۸/ الانفال:۱۵)

''اے ایمان والو! جب تم کافروں سے میدان جنگ میں مقابل ہو تو ان کو پیٹھ مت دو۔''

یعنی جب غنیم سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقابلہ میں پیٹھ پھیر کر بزدلی نہ

دکھائیں، بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان میں قدم جمائے ڈٹے رہیں، اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ''ایمان والے'' کہہ کر خطاب کیا ہے، اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہی ''ایمان'' مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے، کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان نامرد اس دن بزدلی سے دشمن کو پیٹھ دکھائے گا، وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا:

﴿ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۱۶)

''اور جو ان کو اس دن پیٹھ دے گا، مگر یہ کہ لڑائی کا کوئی پیچ کرتا ہو، یا کسی (مسلمان) دستہ سے جاملتا ہو، تو وہ اللہ کا غضب لے پھرا، اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کتنا برا ٹھکانہ ہے۔''

یہ تو سلبی تعلیم تھی، یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدان جنگ میں پیٹھ نہیں دکھانی چاہیے، اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ ان کو اس کے لیے ایجابی حکم دیتا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا ﴾ (۸/ الانفال:۴۵)

''اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو۔''

یعنی اپنی جگہ پر جم کر مقابلہ کرو، کوئی تم میں سے سوائے اس کے کہ لڑائی کی مصلحت ہو اپنی جگہ سے نہ ہٹے مسلمانوں کی تعریف میں فرمایا کہ وہ کافروں کی قوت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔

﴿ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ﴾ (۴۸/ الفتح:۲۹)

''وہ کافروں پر زورآور ہیں۔''

اَشِدَّآءُ کا ترجمہ اس آیت میں زورآور، زورمند اور قوی دست کیا جاسکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حق کے اور خصوصاً اپنے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں طاقتور اور قوی دست ہونا ضروری ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ ﴾ (۸/ الانفال:۶۰)

''اور ان کے لیے تم سے جو ہو سکے یعنی زور وقوت اور گھوڑے باندھنا تیار رکھو، کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور دوسروں کو جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ جانتا ہے، مرعوب کرو۔''

اس ''قوت'' کے لفظ کی تفسیر اس زمانہ کے سامان جنگ وقتال سے کی گئی ہے، مثلاً: قلعوں کی تعمیر اور تیر اندازی، مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ معناً مفسرین نے اس کو عام رکھا ہے اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس میں داخل کیا ہے۔ [1] غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سپاہیانہ جوہر پیدا کرنے

---

[1] تفسیر طبری، تفسیر سورہ انفال آیت مذکورہ پارہ ۱۰، جزء ۱۰، ص:۱۹۔

اور جنگی سامان واسلحہ تیار رکھنے اور اس کے استعمال کے طریقوں کو جاننے کی ہدایت فرمائی ہے، تاکہ حق کے دشمن ان کی تیاری سے مرعوب اور خوف زدہ رہیں اور ان سے معاہدہ کرکے توڑنے کی ہمت نہ کرسکیں۔

برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی برائی کی گئی ہے، بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ کے نام سے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ کی جارہی تھی، متوحش ہورہے تھے، اس پر وحی الٰہی نے ان کا ذکر مذمت کے ساتھ کیا:

﴿ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۶)

''گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جارہے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں۔''

سورۂ احزاب میں منافقوں کی دلی کمزوری کا یہ نقشہ کھینچا ہے:

﴿ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۱۹)

''جب ڈر کا وقت آئے تو ان کو تو دیکھے کہ تیری طرف ٹکر ٹکر دیکھتے ہیں، ان کی آنکھیں گردش کھاتی ہیں، جیسے کسی پر موت کی غشی آجائے۔''

سورۂ محمد میں ان کی دل کی کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے:

﴿ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۝ ﴾ (۴۷/ محمد:۲۰)

''جب اتری کوئی ثابت سورت اور مذکور ہو اس میں لڑائی تو تو ان کو جن کے دلوں میں روگ ہے، دیکھے گا کہ تکتے ہیں، تیری طرف جیسے ٹکٹکی لگائے وہ جس پر موت کی بے ہوشی ہے، سو خرابی ہو ان کی۔''

ایک اور آیت میں یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا:

﴿ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ۭ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۭ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۭ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۭ ﴾ (۶۳/ المنافقون:۴)

''اور جب تو انہیں دیکھے، تو ان کے بدن اچھے معلوم ہوں اور اگر بولیں تو ان کی بات تو سنے، جیسے ٹیک سے کھڑی کی ہوئی لکڑیاں ہیں، جو کوئی چیخے سمجھیں ہم ہی پر کوئی آفت آئی۔''

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فربہی اور موٹائی سے نہیں، بلکہ دل کی طاقت سے ہے جس سے منافق محروم ہیں۔ دیکھنے میں تو ان کے بدن بڑے سجیلے اور گٹھے ہوئے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، مگر دل کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر ذرا کوئی چیخ دے تو گھبرا اٹھیں۔ ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی

لٹھوں کو ٹیک لگا کر کھڑا کر دے دیکھنے میں تو یہ بڑے لمبے تڑنگے اور موٹے تازے ہیں، مگر چونکہ ان کی جڑیں مضبوط نہیں، اس لیے ذرا ٹھیلنے سے دھڑ سے زمین پر آ رہتے ہیں۔

اسلام اپنے پیروؤں میں شجاعت و بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے، گو اس میں مادی وجسمانی شجاعت سے یکسر اعراض وتغافل نہیں ہے، لیکن اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی بنیاد اس پر کھڑی نہیں کی ہے اسی لیے اوپر کی آیت میں دیکھیے کہ منافقین کے جسمانی طول وعرض اور موٹائی کا مضحکہ اڑایا ہے، اس لیے ان میں شجاعت اور بہادری نہیں، اس بنا پر وہ اپنے پیروؤں میں شجاعت اور بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے، جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہیں۔

① جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا اس لیے تعداد کی قلت وکثرت کوئی چیز نہیں، صرف فضلِ الٰہی اور نصرتِ خداوندی چاہیے۔

② ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، جب وہ آ جائے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی اور جب تک نہ آئے اس کو کوئی مار نہیں سکتا۔

③ خدا کی راہ میں مارا جانا زندگی کا بہترین مصرف ہے، اس خون کے پانی سے گناہ کا سارا دفتر دھل جاتا ہے اور جو اس غزا میں مارا نہیں گیا وہ بھی بڑے بڑے ثوابوں کا مستحق ہے۔

تعداد کی قلّت وکثرت

تعداد کی قلت وکثرت پر جدوجہد کی کامیابی وناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے، کامیابی وناکامی تعداد کی کمیت پر نہیں، بلکہ جدوجہد کرنے والوں کی ایمانی واخلاقی کیفیت پر منحصر ہے، تعداد گو کتنی ہی چھوٹی ہو، اگر اس میں ایمان ویقین کی قوت موجود ہے تو بفضلِ خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ پاسکتی ہے، اس فلسفہ کو حضرت طالوت کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ میں قرآن نے ان مختصر لفظوں میں سمجھا دیا ہے:

﴿ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۴۹)

''کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے بڑی فوج پر غالب آ گیا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو آمادۂ جہاد کرتے ہیں تو دل کے کمزور کہتے ہیں کہ ہم تو ان سے نہیں لڑیں گے:

﴿ اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۲۲)

''اس میں تو ایک زبردست قوم بستی ہے۔''

اس وقت ان کی امت کے دو مسلمان ان کو سمجھاتے ہیں:

﴿ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۲۳)

''تو جب تم شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔''

بدر اور احد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے، ارشاد ہوا:

﴿ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

(۸/ الانفال:۱۹)

''اور تم کو تمہارا جتھا کچھ کام نہ آئے گا، اگرچہ تعداد میں بہت ہو اور اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔''

﴿ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۵۹۔۱۶۰)

''تو جب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر بھروسہ کر، بیشک اللہ توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے گا تو اس کے بعد کون تمہاری مدد کرے گا اور مومنوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔''

فتح و شکست حکم الٰہی پر موقوف ہے اور مدد اسی طرف سے آتی ہے:

﴿ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۱۰)

''اور مدد نہیں ہے مگر اللہ ہی کی طرف سے بے شک اللہ غالب، حکمت والا ہے۔''

تعداد کی قلت کی تلافی ایمان کی قوت سے ہوتی ہے، یہ راز اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں بتایا، بلکہ ان کو قاعدہ بنا کر ہمیشہ کے لیے خوش خبری سنادی، فرمایا کہ ایک پکا مسلمان اپنے دس گنے کے مقابل ہے، ثابت قدم دس مسلمان سو پر اور بیس ایسے مسلمان دو سو کی فوج پر بھاری ہوں گے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ ﴾

(۸/ الانفال:۶۵)

''اے پیغمبر! مومنوں کو لڑائی کا شوق دلا، اگر تم مسلمانوں میں سے بیس صابر (ثابت قدم) ہوں تو وہ دو سو پر غالب ہوں، اگر تم میں سے سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب ہوں، کیونکہ وہ سمجھ نہیں رکھتے۔''

ثابت قدم مسلمانوں کے غالب آنے اور کافروں کی شکست کھا جانے کی وجہ بھی بتادی کہ مسلمانوں کے دل میں خدا پر صبر وتوکل کی قوت ہے اور کافروں کے دل ایمان کے اس فہم وبصیرت سے محروم ہیں۔

اس کے بعد آزمائش کی سختی میں تھوڑی نرمی کر دی گئی، پھر بھی یہ نرمی وہ ہوئی جو آج بھی مردانگی و بہادری کی کسوٹی ہے، یعنی یہ ایک مسلمان اپنے سے دو چند کا مقابلہ کرے اور اس کے قدم نہ ڈگمگائیں:

﴿ فَإِنْ يَكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِّنْكُمْ أَلْفٌ يَّغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ ﴾ (۸/ الانفال:٦٦)

''تو اگر تم سے سو صابر (ثابت) رہیں تو دو سو پر غالب ہوں اور اگر تم سے ہزار ہوں تو دو ہزار پر بحکمِ خدا غالب ہوں اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔''

اس تعلیم کے نشہ کی تیزی اور تندی دیکھو کہ آج بھی یہ یقین بحمد اللہ مسلمانوں میں پیدا ہے کہ ایک مسلمان لڑائی میں دو کافروں پر بھاری ہے، اور وہ اپنے اس یقین وایمان کی بدولت اپنے سے دونی تعداد کی پروانہیں کرتا اور خدا کی مدد پر ہمیشہ بھروسہ رکھتا ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ کافروں کے دلوں میں ان کا وہ رعب بیٹھا ہے، جس کا وعدہ ساڑھے تیرہ سو سال سے ہے کہ

﴿ سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۱)

''ہم کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دیں گے۔''

﴿ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ﴾ (۸/ الانفال:۱۲)

''میں کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دوں گا۔''

خدا نے یہ وعدہ پورا بھی کیا، چنانچہ یہود جن کو اپنے قلعوں اور لڑائی کے سامانوں پر بڑا گھمنڈ تھا۔ مسلمانوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ بےلڑے بھڑے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہوئے۔

﴿ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲٦)

''اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔''

﴿ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ ﴾ (۵۹/ الحشر:۲)

''اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔''

اور جب تک مسلمانوں میں ایمان کی یہ قوت باقی ہے اللہ کا وعدہ پورا ہوتا رہے گا۔

موت کا وقت مقرر ہے

انسان کی کمزوری کی اصل وجہ موت کا ڈر ہے، اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے، جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے اور نہ بلائے آسکتا ہے، اس لیے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وحی محمدی ﷺ نے مسلمانوں کو اس عقیدہ کی بار بار تلقین کی ہے، یہاں تک کہ یہ چیز مسلمانوں کی رگ رگ میں سرایت کر گئی ہے، غزوۂ احد میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور اس عقیدہ کو یاد دلایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ﴾ (۳/ آل عمران:۱۴۵)

''اور کسی جان کے بس میں نہیں کہ اللہ کے حکم کے سوا وہ مر سکے، لکھا ہوا وقت مقرر ہے۔''

جب اللہ کا حکم ہوگا تب ہی کوئی مر سکتا ہے، پھر موت سے خوف کیوں ہو اور اس سے بزدلی کیوں چھائے، جنگ احزاب میں جب منافقوں کو گھبراہٹ ہوئی تو خدا نے فرمایا:

﴿ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۱۶)

''(اے پیغمبر ﷺ! ان سے) کہہ کہ اگر تم موت سے یا مارے جانے سے بھاگے بھی تو یہ بھاگنا تم کو کام نہ آئے گا۔''

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے، سراپا غلط ہے، جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی، وہ خود آ کر اپنے اپنے مقام پر مارے جاتے، فرمایا:

﴿ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۵۴)

''(اے پیغمبر ﷺ! ان سے) کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جس کا مارا جانا لکھا جا چکا تھا، وہ آپ نکل کے اپنے پڑاؤ پر آ جاتے۔''

یہ سمجھنا کہ چونکہ لڑائی میں شریک ہوئے اس لیے مارے گئے، یوں بھی غلط ہے کہ مارنا اور جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے، مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم کافروں جیسا عقیدہ نہ رکھو جو یہ کہتے ہیں:

﴿ لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۶)

''اگر یہ مرنے یا مارے جانے والے ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے اور یہ خیال اس لیے ان کے دل میں آتا ہے، تاکہ اللہ ان کے اس خیال کو ان کی دلی حسرت بنائے اور واقعہ تو یہ ہے کہ اللہ جلاتا اور مارتا ہے۔''

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر مقتول لڑائی میں نہ جاتا تو مارا نہ جاتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کی یہ بات سچ ہے تو وہ اپنی موت ٹال سکتے ہیں تو ٹال لیں:

﴿ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۶۸)

''اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت ہٹا تو لو۔''

جو مسلمان ذرا دل کے کمزور تھے، ان کے خطرہ کا ذکر کر کے ان کی تشفی کی گئی:

﴿ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ ﴾ (٤/ النسآء:٧٧-٧٨)

''پھر جب ان کو لڑائی کا حکم ہوا تو ناگہاں ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگا جیسے خدا سے ڈرہو یا اس سے بھی بڑھ کر اور کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی، کیوں نہ ہم کو تھوڑے دن اور مہلت دی (اے پیغمبر!) جواب دے کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت پرہیز گار کے لیے بہتر ہے اور تمہارا حق ذرا بھی دبایا نہ جائے گا جہاں تم ہو گے موت تم کو پالے گی، اگر تم مضبوط قلعوں میں ہو۔''

غرض کہیں بھی تم جا کر رہو موت سے چھٹکارا نہیں، پھر میدان جنگ سے تم کیوں گھبراؤ، بلکہ ان مجاہدوں کی طرح بنو، جن کا ایمان جہاد کا نام سن کر اور تازہ ہو جاتا ہے:

﴿ الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۝ ﴾ (٣/ آل عمران:١٧٣)

''وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تم سے لڑنے کے لیے لوگوں نے بڑا سامان کیا ہے، سو تم ان سے خوف کرو تو اس نے ان کے ایمان کو اور بڑھا دیا اور بول اٹھے کہ ہم کو خدا کافی ہے اور وہ کیسا اچھا کارساز ہے۔''

شہادت اور غزا کا رتبہ

میدان جہاد میں شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھ سکتی تھی، وہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے، اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع قمع کر دیا ہے، اس کی تعلیم ہے کہ مجاہدوں کی جان و مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی خوشی و رضا اور جنت کے بدلہ میں بکا ہوا ہے اور وہاں ان کے لیے وہ کچھ مہیا ہے جس کے سامنے یہاں کا بڑے سے بڑا عیش و آرام بھی ہیچ ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ﴾ (٩/ التوبة:١١١)

''اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ ان کے لیے

جنت ہے، اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔"

اس سے پہلے سورۂ نساء میں اہل ایمان کو جو آخرت کے لیے دنیا کا سودا کر چکے ہیں، اعلان ہے:

﴿ فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴾ (٤/ النسآء:٧٤)

"تو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلہ بیچتے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور جو اللہ کی راہ میں لڑے پھر مارا جائے یا وہ غالب ہو تو ہم اس کو بڑی مزدوری دیں گے۔"

ان کے گناہ کے سارے دفتر دھل جائیں گے:

﴿ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ ﴾ (٣/ آل عمران:١٩٥)

"تو جو لوگ اپنے وطن سے چھوٹے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، اتاروں گا ان سے ان کی برائیاں اور داخل کروں گا ان کو جنت میں۔"

شہیدوں نے اس راہ میں اپنی جو سب سے بڑی دولت نثار کی وہ ان کی زندگی تھی، وہ ان کو از سر نو اسی وقت دے دی جائے گی، اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیال باطل کا کہ شہید مر جاتے ہیں، ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو، وہ خدا کے پاس زندہ ہیں:

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۝ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ﴾ (٣/ آل عمران:١٦٩)

"اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے، ان کو مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں، خدا نے ان کو اپنی مہربانی سے جو دیا اس سے خوش ہیں۔"

ان کی اس زندگی کو گو اس دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے، پھر بھی ان کو زبان سے بھی مردہ نہیں کہنا چاہیے۔

﴿ وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝ ﴾ (٢/ البقرۃ:١٥٤)

"اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں، ان کو مردہ نہ کہو بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم کو اس کی خبر نہیں۔"

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات ان ہی کے لیے ہیں، جو فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے لڑتے ہیں۔ اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض و غایت کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ وہ ذاتی خود غرضیوں اور نفسانی غیظ و غضب، اور بہادری کی نیک نامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کر دی گئی

ہے۔اگر کوئی مال کے لیے کسی کو قتل کرے تو یہ کافروں کی سی جاہلانہ بات ہوگی۔فرمایا:

﴿ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ ﴾ (٤/ النسآء:٩٤)

''چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال،سو اللہ کے پاس بڑا مال غنیمت ہے،تم (اسلام سے) پہلے ایسے ہی تھے،تو خدا نے تم پر فضل کیا (یعنی اسلام بخشا) تو اب تحقیق کر لیا کرو۔''

رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لیے لڑتا ہے،ایک شخص شہرت کے لیے لڑتا ہے،ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ میں اس کی پامردی کی نمائش ہو،ایک شخص بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے،ایک شخص حمیت سے لڑتا ہے،ایک شخص نمائش کے لیے لڑتا ہے،ایک شخص غصہ وانتقام کے لیے لڑتا ہے،تو آپ ﷺ نے ان سب کا مشترک جواب یہ دیا ہے:

((مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) [1]

''جو شخص اللہ کی بات سب سے بالا کرنے کے لیے لڑے،اسی کا جہاد خدا کی راہ میں ہے۔''

ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک شخص سے قیامت کے دن اس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ اے خدا! میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہوا،خدا کہے گا کہ تم جھوٹ کہتے ہو،تم اس لیے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ [2] سو تم اپنا اجر پا چکے اور دنیا میں تم کو بہادر کہا جا چکا۔'' غرض جس شجاعت کا مقصود اصلی ریا ونمائش ہو،اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے،لیکن اگر جہاد میں اعلائے کلمۃ اللہ کے ساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے،تو اسلام نے اس کو برا نہیں کہا ہے [3] کیونکہ اس فخر کا منشا بھی کلمۂ حق کی بلندی کا اظہار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاد کے میدان میں کبر وتبختر کے شجاعانہ پہلوؤں کو پسند کیا ہے،چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ''بعض ناز وتبختر کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے،خدا جس ناز وتبختر کو پسند کرتا ہے،وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی کے وقت اترائے [4] کیوں کہ اس سے دشمنوں پر رعب وداب قائم ہوتا ہے اور دوستوں میں مستعدی وسرگرمی پیدا ہوتی ہے۔'' ایک صحابی نے ایک کافر پر حملہ کیا اور شجاعانہ فخر وغرور کے لہجہ میں کہا،لو میں ابن اکوع ہوں۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس فقرے کی شرح میں لکھتے ہیں:

''یہ فقرہ اس فخر سے الگ ہے،جس کی ممانعت کی گئی ہے،کیونکہ حالت کا اقتضا یہی تھا اور وہ اس ناز وتبختر سے قریب ہے،جو لڑائی میں جائز ہے اور دوسرے موقعوں پر جائز نہیں۔'' [5]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا: ٤٩٢٠، ٤٩٢٢ وصحیح بخاری، کتاب الجهاد باب من قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا فهو فی سبیل الله: ٢٨١٠۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل للریاء والسمعة استحق النار: ٤٩٢٣؛ جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء فی الریاء والسمعة: ٢٣٨٢۔ [3] فتح الباری، ج ٦، ص: ٢٢ شرح حدیث مذکور۔

[4] ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الخیلاء فی الحرب: ٢٦٥٩۔ [5] فتح الباری، ج ٦، ص: ١١٤۔

غزوۂ حنین میں جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو گھیر لیا تو آپ ﷺ نے خود عزم وثبات کے عربی لہجہ میں فرمایا:

((اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِالْمُطَّلِبْ))

''میں پیغمبر ہوں، جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔''

یعنی میں سچا پیغمبر ہوں، اس لیے میدان سے نہ بھاگوں گا نہ ہٹوں گا، چنانچہ اس وقت غنیم کے تیروں کی بارش سے گواور لوگ ہٹ گئے، مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں فرمائی۔ ❶

صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم میں سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت ﷺ کے پاس کھڑا ہوتا تھا ❷ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نہایت بہادر تھے، ایک بار اہل مدینہ کے دلوں میں کسی طرف سے حملہ کا خوف پیدا ہوا تو سب سے پہلے جو ادھر بڑھا، وہ خود سرور کائنات علیہ الصلوۃ والسلام تھے، آپ ﷺ گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے اور واپس آ کر فرمایا: ''خوف کی کوئی بات نہیں۔'' ❸ ایک موقع پر جب بدویوں نے آپ کو عطیہ کے لیے گھیر لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ مجھ کو بخیل، جھوٹا اور بزدل نہ پاؤ گے۔'' ❹ بزدلی اسلام میں ایسا اخلاقی عیب ہے، جس سے پناہ مانگنی چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعاؤں میں جن چیزوں سے پناہ مانگی ہے ان میں بزدلی بھی ہے، چنانچہ روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیچارگی (عجز) کاہلی (کسل) بزدلی اور بڑھاپے سے کہ یہ بھی بیچارگی کی ایک قسم ہے، پناہ مانگتے تھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ ہر نماز کے بعد ان چیزوں سے پناہ مانگتے تھے ❺ ایک روایت میں ہے کہ ''انسان میں سب سے بڑی بداخلاقی گھبرا دینے والا بخل اور دل ہلا دینے والی بزدلی ہے۔'' ❻

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ صحابی نے ایک خط لکھ کر بھیجا تھا، اس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جب دشمن سے مقابلہ آ پڑے تو ثابت قدم رہو۔'' ❼ اسی خط میں آنحضرت ﷺ کا وہ بلیغ فقرہ بھی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے:

((وَاعْلَمُوْآ اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ)) ❽

''یقین کرو کہ بہشت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔''

---

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قول الله تعالیٰ: ويوم حنين ....: ٤٣١٥ وكتاب الجهاد، باب بغلة النبي ﷺ: ٢٨٧٤۔ ❷ صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب غزوة حنين: ٤٦١٦۔

❸ صحيح بخاری، كتاب الجهاد وباب الحمائل وتعليق السيف بالعنق: ٢٩٠٨۔

❹ بخاری، کتاب الجهاد، باب الشجاعة في الحرب والجبن: ٢٨٢١۔ ❺ بخاری، کتاب الجهاد، باب مايتعوذ من الجبن: ٢٨٢٢، ٢٨٢٣۔ ❻ ابوداود، کتاب الجهاد، باب في الجرأة والجبن: ٢٥١١۔

❼ صحيح بخاری، کتاب الجهاد، باب الصبر عندالقتال: ٢٨٣٣۔ ❽ صحيح بخاری، کتاب الجهاد، باب الجنة تحت بارقة السيوف: ٢٨١٨ وباب كان النبي ﷺ اذا لم يقاتل اول النهار اخر القتال حتى تزول الشمس: ٢٩٦٦۔

استقامت

''استقامت'' کے لفظی ''معنی سیدھا رہنے یا سیدھا چلے چلنے کے ہیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے، مشکلیں پیش آئیں مخالفتیں ہوں، ستایا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے، مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا جائے۔

آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے:

﴿ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ﴾ (٤١/ حٰمٓ السجدة:٦)

''تمہارا معبود ایک ہی ہے، سو اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے گناہ بخشواؤ۔''

یعنی ہماری عبادتیں اسی ایک کے لیے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو، اس سے کسی حال میں ادھر ادھر نہ ہوا جائے، سیدھے اسی کی طرف چلے چلو، ایک اور آیت میں بارگاہِ الٰہی سے جنابِ رسالت مآب ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو حکم ہوتا ہے کہ اسی راہ پر سیدھے چلے چلو، نہ رہ سے بھکو نہ حکم ماننے سے سرکشی کرو:

﴿ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴾

(١١/ هود:١١٢)

''تو (اے پیغمبر!) تو سیدھا چلا چل جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ اور حد سے نہ بڑھو کہ وہ (اللہ) تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔''

عرب کا گرم ریگستان دینِ حق کی مخالفت میں غیظ وغضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا تھا، ذرہ ذرہ کی زبان سے رسولِ حق کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہوتی جاتی ہے، اس موقع پر رسول اسلام ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کو اعلان حق اور حق پر استقامت کی تاکید ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''اسی دین حق کی طرف سب کو بلاتے رہو اور ثابت قدمی دکھاؤ اور مخالفوں کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو۔''

﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ ﴾ (٤٢/ الشورىٰ:١٥)

''پس اسی کی طرف بلا اور قائم رہ جیسا کہ تجھے فرمادیا اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل۔''

ایسے ثابت قدموں کو جنہوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف وخطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے یہ خوشخبری سنائی جارہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی لیے ہے، وہ دن آئے گا جب نہ تمہیں کسی کا ڈر رہو گا اور نہ کسی چیز کا غم ہوگا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾

(٤٦/ الاحقاف:١٣)

''بے شک جنہوں نے کہا، ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر وہ (راہ پر) جمے رہے، تو نہ ڈر ہے ان کو اور نہ وہ غم کھائیں گے۔''

اس دن جس دن ہیبت سے سب کے دل لرزتے ہوں گے، ان کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا اطمینان یہاں حاصل تھا، وہاں تسکین وتسلی کا اطمینان بھی حاصل ہوگا، ایسے ثابت قدموں کے کانوں میں ان کی استقامت کی مزدوری میں فرشتوں کی بشارت سنائی دے گی:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝ ﴾ (٤١/ حٰمٓ السجدۃ:٣٠)

''بے شک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر جمے رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کھاؤ اور اس بہشت کی خوشی سنو جس کا تم سے وعدہ ہے۔''

ان ہی آیتوں کی شرح میں اس حدیث کو سمجھئے کہ ایک صحابی دریافت کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی ایسی بات بتایئے کہ میں اس سے چمٹ جاؤں، ارشاد ہوا: ''کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر جم جاؤ۔'' [1] صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان نصیحتوں پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنامے پیش کیے ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے، مگر ان پر تاریخ کی زبان سے برابر حسنت اور آفرین کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، خود اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احزاب کے سلسلہ میں ان کی استقامت کا ایک نقشہ کھینچا ہے، فرمایا:

﴿ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۝ هُنَالِكَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا۝ ﴾

(٣٣/ الاحزاب:١٠۔١١)

''جب کفار کی متحدہ فوجیں تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے آئیں اور جب ڈگنے لگیں آنکھیں اور دل گلے کو آنے لگے اور تم اللہ سے طرح طرح کے گمان کرتے تھے، وہاں ایمان والے جانچے گئے اور خوب جھڑجھڑائے گئے۔''

اس کے بعد اس موقع پر منافقوں نے جو کمزوری دکھائی اس کی تفصیل ہے، اس کے بعد ہے:

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا۝ۭ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٢٢)

''اور جب ایمان والوں نے کفار کی ان متحدہ فوجوں کو دیکھا تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ

[1] ترمذی، ابواب الزھد، باب ماجاء فی حفظ اللسان:٢٤١٠۔

ہم کو دیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا اور اس نے ان کو یقین اور اطاعت میں اور بڑھا دیا۔''

اس کے بعد جن مسلمانوں نے اس قسم کے خطروں میں اپنی کامل استقامت اور ثبات کا وعدہ کیا تھا، اور اس کو پورا کر دکھایا، ان کی تعریف فرمائی جاتی ہے:

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۳)

''ایمان والوں میں بعض وہ مرد ہیں جنہوں نے خدا سے جس چیز کا عہد کیا، اس کو سچ کر دکھایا تو ان میں کوئی تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی ان میں وقت کی راہ دیکھ رہا ہے اور انہوں نے ذرا بھی نہیں بدلا۔''

یعنی بعض تو خدا کی راہ میں جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے اور بعض ابھی زندہ ہیں اور اس دن کی راہ تک رہے ہیں، جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دیں گے اور ان تمام خطروں کے باوجود نہ تو منافقوں کی طرح انہوں نے اپنے دین وایمان کو بدلا اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے اس کو توڑا۔ حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا اور اس میں مردان خدا کی استقامت کی آزمائش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے، جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا اور جب تک اس میں کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہیں اترتی کامیابی کا منہ نہیں دیکھتی، فرمایا:

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱۴)

''کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر تم سے پہلوں کے احوال نہیں آئے ان کو سختی اور تکلیف پہنچتی رہی اور جھڑ جھڑائے گئے، یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، سن رکھو اللہ کی مدد نزدیک ہے۔''

پہلوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کیے ہیں، ایک تو طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور آخر کامیاب ہوا اور اس عالم میں اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی:

﴿ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۵۰)

''اے ہمارے پروردگار! ہم میں ڈال دے پوری مضبوطی اور جما ہمارے پاؤں اور اس کافر

قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔''

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاخدود کا ہے، احادیث [1] وسیر میں ہے کہ یمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمان تھے، یہودیوں نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں اور آخران کو گڑھا کھود کر آگ میں جھونک دیا، مگر وہ دین حق سے برگشتہ نہ ہوئے:

﴿ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِۙ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِۙ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌۙ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌؕ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِۙ ﴾

(۸۵/ البروج:٤-٨)

''مارے گئے گڑھے کھودنے والے، آگ بھری ایندھن سے جب وہ اس (گڑھے کے منہ) پر بیٹھے تھے اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے، دیکھ رہے تھے اور وہ ان سے بدلا نہیں لیتے تھے، مگر اسی کا کہ یہ زبردست خوبیوں والے خدا پر ایمان لے آئے تھے۔''

اگلوں کی استقامت کے ان احوال میں سے جن کو محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا، وہ واقعہ ہے کہ جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح میں نقل کیا ہے، خباب بن ارت رضی اللہ عنہ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور ﷺ سے اپنی مصیبتوں کا حال عرض کیا اور درخواست کی کہ ہمارے لیے دعا کیجئے، کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی بے تابی کا اظہار تھا، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور آرے سے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا، مگر یہ اس کو دین حق سے روگرداں نہیں کرتا تھا، اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کا گوشت ہڈی سے نوچ کر تار تار کر دیا جاتا تھا، مگر یہ بھی اس کو اس کے دین سے ہٹاتا نہ تھا۔ [2]

رسولِ اسلام ﷺ کی ان تعلیمات اور تلقینات کا جو اثر آپ کے ساتھیوں پر ہوا وہ اہلِ تاریخ سے چھپا نہیں، ان ہی خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کا جو اس روایت کے راوی ہیں، یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے جرم میں ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں، آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر ان کو چت لٹا دیا گیا اور ایک شخص ان کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے [3] حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے مدتوں کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی تو تائے ہوئے سونے کی طرح سنگ دل قریش کے ظلم وستم کا یہ سکہ ان کی پیٹھ پر چمک رہا تھا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ گرم جلتی بالو پر لٹائے جاتے، پتھر کی بھاری چٹان ان کے سینہ پر رکھی جاتی، گلے میں

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الزھد، باب قصة اصحاب الاخدود ..... ٧٥١١ وسیرت ابن ھشام قصة اصحاب الاخدود۔ [2] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار ، باب ما لقی النبی ﷺ واصحابه من المشرکین بمکة: ٣٨٥٢۔ [3] ابن سعد تذکرة خباب بن ارت ، ج ٣، ص:١١٧۔

رسی باندھ کر زمین پر گھسیٹتے جاتے اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ، اس وقت بھی ان کی زبان سے اَحَدٌ اَحَدٌ (ایک خدا ایک خدا) ہی نکلتا تھا، حضرت خبیب رضی اللہ عنہ سولی پر لٹکائے جاتے ہیں، مگر خدا کی راہ میں جان کی یہ قربانی ان کو اتنی پسند آتی ہے کہ دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں، خود آنحضرت ﷺ کا وہ فقرہ جس کو آپ ﷺ نے اپنے چچا اور ابو طالب کے جواب میں کہا تھا، اس کی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہوگی جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے، فرمایا چچا جان! اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی دے دیں تب بھی میں اس دین حق سے باز نہ آؤں گا۔

خود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو کہ اگر یہ رسول (ﷺ) اس راہ میں مر جائے، یا مارا جائے، تو کیا تم اس راستہ سے جس پر تم چل رہے ہو، الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ نہیں حق کسی کی موت وحیات سے وابستہ نہیں، اس کا ساتھ تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ حق ہے:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْــًٔا ؕ ﴾ (۳/ آل عمران:۱٤٤)

''اور محمد (ﷺ) تو ایک رسول ہے، اس سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے، پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو الٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔''

پھر اگلی امتوں کا حال سنا کر تسلی دی جاتی اور صبر وثبات اور استقامت کی تعلیم دی جاتی ہے:

﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱٤٦)

''اور کتنے پیغمبر ہیں کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا والے لوگ لڑے، تو پھر ان کو خدا کی راہ میں کچھ دکھ پڑا تو ہمت نہیں ہارے اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار کرتا ہے اور نہ تھا ان کا کہنا مگر یہی کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ اور ہم سے اپنے کام میں جو زیادتی ہوئی اس کو بخش دے اور ہمارے قدم جمائے رکھو اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے۔''

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثبات قدم کی یہی کیفیت ہونی چاہیے، اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک اور چیز استقامت عمل ہے، جس کا نام مداومت ہے، یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے، اس پر مرتے دم تک مداومت رہے، اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجئے اور کبھی نہ کیجئے کہ اس سے طبیعت کی کمزوری اور اس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے، نماز پڑھنا انسان

کے سب سے اچھے کاموں میں سب سے اچھا کام ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف ان مسلمانوں کی کی ہے جو اس پر مداومت رکھتے ہیں، فرمایا:

﴿ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج :۲۲۔۲۳)

''لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں (یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں)۔''

اخلاق کی یکسانی، اخلاق کا بڑا جوہر ہے اور اس کی مشق مداومت عمل سے ہوتی ہے اس لیے آنحضرت ﷺ نے بار بار اس کی تلقین فرمائی ہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کو کون سا عمل نیک سب سے زیادہ محبوب تھا؟ فرمایا: ''وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے۔'' ❶ خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔'' ❷

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة العمل:٦٤٦٥۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة العمل:٦٤٦٤۔

حق گوئی

یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح میدان جنگ میں دونوں طرف کی مسلح فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں ہاتھ پاؤں سے شجاعت اور پامردی کا اظہار کرتی ہیں، بعینہٖ اسی طرح جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت میں جو آواز بلند کی جاتی ہے، اسی کا نام حق گوئی ہے۔

حق گوئی کا اظہار اس وقت سب سے زیادہ قابلِ ستائش سمجھا جاتا ہے، جب مادی طاقت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقتور ہو اور اسلام نے اسی قابل ستائش حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور خود رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا ہے:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ۝ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ﴾ (۱۵/ الحجر:۹۴۔۹۶)

”پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے، اس کو کھول کر سنا دو اور مشرکین کی مطلق پروا نہ کرو، ہم تم کو تمہاری ہنسی اڑانے والوں کے مقابلہ میں جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود قرار دیتے ہیں، کافی ہیں۔“

یعنی اب مخفی طور پر دعوتِ توحید کا زمانہ گزر گیا اور علانیہ اس کی دعوت دینے کا وقت آ گیا ہے، اس لیے کھلم کھلا اللہ کے اس حکم کو بیان کرو اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائیں تو ان کے تمسخر و استہزا کی مطلق پروا نہ کرو، بلکہ ان کی قوت و طاقت کی بھی پروا نہ کرو، سب کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بس ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے وہ خوف ہے، جس کی مختلف قسمیں ہیں، ایک خوف تو لعنت ملامت کا ہے، جس کو اس آیت میں بے اثر کیا گیا ہے اور ایک دوسری آیت میں اس کو مسلمانوں کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے:

﴿وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ (۵/ المآئدۃ:۵٤)

”یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔“

یعنی اہل ایمان حق کے اظہار میں لوگوں کے لعن وطعن کی پروا نہیں کرتے۔

لعنت ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزوں کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھتا ہے، لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل میں ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: ”کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے چاہیے کہ انسانوں کا خوف مانع نہ ہو۔“ [1] ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا: ”کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے۔“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! ہم میں کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر کیونکر سمجھ سکتا ہے؟

[1] ابن ماجه، ابواب الفتن، باب الامر بالمعروف والنهي عن المنكر: ٤٠٠٧ ومابعد میں یہ تمام حدیثیں مذکور ہیں۔

فرمایا: ''اس طرح کہ اس کو اللہ کے بارے میں ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے، ایسے شخص سے اللہ قیامت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہے گا کہ انسانوں کا خوف، ارشاد ہوگا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہیے تھا۔'' ❶ انسانوں کے مختلف گروہوں میں سب سے زیادہ ہیبت ناک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہوں کی ہوتی ہے، اس لیے ان کے سامنے حق گوئی کو آپ ﷺ نے سب سے بڑا جہاد قرار دیا اور فرمایا:

((افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر)) ❷

''بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کا کہنا ہے۔''

دوسری روایت میں ''کلمہ حق'' کا لفظ ہے۔ ❸

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو مدارج قرار دیے گئے ہیں، ان میں دوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے۔ چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان تم نے سنت کی مخالفت کی، آج تم نے منبر نکالا حالانکہ آج منبر نہیں نکالا جاتا تھا، نماز سے پہلے خطبہ دیا حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں دیا جاتا تھا، اس پر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد میں نے سنا ہے کہ ''تم میں جو شخص برائی دیکھے اور اس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے، لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔'' ❹

صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا مرتبہ حق گوئی میں بدرجہ کمال تھا، یہ وہی تھے جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفار قریش کے بھرے مجمع میں حرم میں جا کر توحید کا نعرہ بلند کیا اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک مار کھاتے کھاتے بے دم نہ ہو گئے، لیکن اس پر بھی ان کا نشہ نہیں اترا اور دوسرے دن پھر جا کر اعلانِ حق کیا اور وہی سزا پائی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی مدح میں فرمایا کہ ''آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابو ذر رضی اللہ عنہ سے زیادہ حق گو کوئی نہیں''۔ ❺ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں وہ جب شام میں تھے تو وہاں کے مسلمانوں میں سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہو رہی تھی اس پر انھوں نے بے محابا دارو گیر کی اور اس میں امیر معاویہ کی پروا انھوں نے ذرا بھی نہیں کی۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا جس میں فرمایا: ''ہشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے جو تم کو معلوم ہے''۔ یہ سن کر حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ روئے اور فرمایا کہ افسوس ہم نے ایسی باتیں دیکھیں اور ہیبت میں آ گئے۔ ❻

❶ ابن ماجه، ابواب الفتن، باب الامر بالمعروف: ٤٠٠٨۔ ❷ ایضاً: ٤٠١١۔ ❸ ایضاً: ٤٠١٢۔
❹ ایضاً: ٤٠١٣۔ ❺ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب ابی ذر الغفاری: ٣٨٠١۔
❻ ترمذی، ابواب الفتن، باب ما اخبر النبی ﷺ اصحابه: ٢١٩١۔

استغنا

استغنا کے معنی بے نیازی کے ہیں اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے:

﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران :۹۷)

''اور جو (مقدور رکھے پیچھے نعمت کی) ناشکری کرے (اور حج کو نہ جائے) تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہے۔''

اور اس بے نیازی میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے، وہی ایک بے نیاز ہے اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے:

﴿ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ﴾ (٤٧/ محمد:٣٨)

''اور اللہ تو بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔''

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اس ذاتِ بے نیاز کے سوا دوسروں سے بے نیاز ہو اور یہی چیز اسلامی بے نیازی کے سبق کو بے نیازی کے دوسرے اسباق سے ممتاز کرتی ہے۔ اسلام کے آئینِ اخلاق میں اس استغنا اور بے نیازی کی تعلیم دو اصولوں پر قائم ہے، اول یہ کہ جو کچھ ملتا ہے، اس کا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے اس کے سوا کسی اور کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے، قرآن مجید کی وہ سورت جس کو ہم ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں دہراتے ہیں، اس کی ایک درمیانی آیت یہ ہے:

﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۝ ﴾ (۱/ الفاتحة: ٤)

''(اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

اللہ نے جا بجا اپنے کو بندہ کا اصلی کارساز اور کارفرما بتا کر ان کے مضطرب دلوں کو تسکین دی ہے، فرمایا:

﴿ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۝ ﴾ (۳/ آل عمران :۱۷۳)

''اور کیسا اچھا کارساز۔''

﴿ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل:٦٥)

''اور تیرا رب کارساز بس ہے۔''

﴿ أَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل:۲)

''میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ۔''

﴿ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۝ ﴾ (٤/ النسآء:۸۱)

''اور اللہ کارساز بس ہے۔''

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے:

﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳٦)

''کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں۔''

اس لیے کسی شاہ، امیر اور دولت مند کے دروازہ کو جھانکنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا اصول جس پر اسلامی استغنا کی بنیاد ہے، وہ قناعت ہے۔ یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملا ہے، اسی پر طمانیت حاصل کی جائے اور زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے:

﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ (٤/ النسآء:٣٢)

''اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی اس کی ہوس مت کرو۔''

﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ ﴾ (٢٠/ طٰهٰ:١٣١)

''اور اپنی آنکھیں نہ پسار اس کی طرف جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے لوگوں کو سامان دیا ہے۔''

بعض لوگ باوجود دولت مند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں، مال و دولت سے ان کی نیت نہیں بھرتی اور اس کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں، اس لیے وہ باوجود دولت مند ہونے کے محتاج ہوتے ہیں، لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولت مند نہیں ہوتا، تاہم اللہ نے جو کچھ اس کو دیا ہے، اس پر قانع رہتا ہے اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا، اس لیے وہ باوجود مال کی کمی کے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ اس بنا پر استغنا و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے، بلکہ روح اور قلب سے ہے اور اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

((ليس الغنى عن كثرة العرض ولكن الغنى غنى النفس)) [1]

''دولت مندی مال و اسباب کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ اصلی دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔''

اسی حدیث کا ترجمہ شیخ سعدی نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے ''تونگری بدل است نه به مال''

ایک اور حدیث میں اس نکتہ کو آپ ﷺ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابوذر! تمہارے خیال میں مال کی کثرت کا نام بے نیازی ہے؟'' میں نے کہا، ہاں۔ فرمایا: ''تو تمہارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟'' میں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: ''بے نیازی دل کی بے نیازی ہے اور محتاجی دل کی محتاجی۔'' [2] اس بنا پر بے نیازی درحقیقت رضا و

---

[1] صحيح بخاری، كتاب الرقاق، باب الغنى غنى النفس:٦٤٤٦۔

[2] صحيح ابن حبان، كتاب الرقائق، باب الفقر والزهد...... :٦٨٤۔

تسلیم سے پیدا ہوتی ہے، مال و دولت سے پیدا نہیں ہوتی، یعنی اللہ انسان کو جو کچھ دے دے اگر وہ اس پر دل سے راضی ہو جائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے، یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جو ہر نفس میں پیدا ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہی تعلیم دی اور ان سے فرمایا کہ ''جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے اگر تم اس پر راضی ہو جاؤ تو تم سب سے زیادہ بے نیاز ہو جاؤ گے۔'' ❶ ایک بار چند انصاریوں نے آپ ﷺ سے مال کا سوال کیا اور آپ نے ان کا سوال پورا کیا، لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور پھر سوال کیا اور آپ نے پھر ان کا سوال پورا کیا، جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ ''میرے پاس جو کچھ مال ہو گا تم سے بچا کر جمع نہ کروں گا، جو شخص خودداری چاہتا ہے، اللہ اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے، اللہ اس کو بے نیاز کر دیتا ہے۔'' ❷ اسی طرح ایک بار حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے بار بار مال کا سوال کیا اور آپ نے ہر بار ان کا سوال پورا کیا، لیکن اخیر میں فرمایا کہ ''اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے، جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے، اللہ اس میں برکت دیتا ہے اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے، اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے، لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔'' ان پر اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے اس کے بعد کسی کا عطیہ نہیں قبول کیا۔ ❸

فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خوشخبری ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی اور اس کی روزی ضرورت کے مطابق ہے اور اللہ نے اس کو اس پر قانع بنا دیا ہے۔'' ❹ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جبریل امین نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ ''مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جانا ہے۔'' ❺

❶ فتح الباری، ج ١١، ص: ٢٣٤۔

❷ ابو داود، کتاب الزکوٰۃ، باب فی الاستعفاف: ١٦٤٤۔

❸ ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، باب ان ھذا المال خضرۃ۔۔۔: ٢٤٦٣۔

❹ صحیح ابن حبان، کتاب الرقائق، باب الفقر والزھد۔۔۔: ٧٠٣۔

❺ مستدرك حاکم، کتاب الرقاق، ج ٤، ص: ٣٢٥۔

رذائل

رذائل کے معنی

رذائل (یعنی بری خصلتیں) وہ اخلاق ذمیمہ ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے۔ جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے، جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گناہگار ٹھہرتے ہیں، جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے اور جن کے بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے، بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں، یعنی اس کی دینی و دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے۔

رذائل کے قرآنی نام

اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں، مثلاً: اکثر ان کو مُنْکَر (بری باتیں اور فحشاء (بے حیائی) اور کبھی فَاحِشَۃٌ (فحش) سَیِّئَۃٌ (برا) سُو (برائی) مَکْرُوْہ (ناپسندیدہ) خطأ (ناصواب یا بھول) اثم (گناہ) عُدْوَانٌ (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے۔ ان ہی لفظوں سے اندازہ ہوگا کہ رذائل سے متصف ہونا کتنا گھناونا اور نفرت کے قابل ہے اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں، جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بدنما ہیں، فرمایا:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝ .... وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۳۱۔۳۲۔۳۷۔۳۸)

”اور اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے مت مار ڈالو، ہم ہیں ان کو اور تم کو روزی پہنچاتے، بے شبہ ان کا مار ڈالنا بڑی چوک ہے اور زنا کے پاس مت جاؤ بے شبہ یہ بے حیائی اور بری راہ ہے ....اور زمین میں اترا کر نہ چل کہ تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ لمبائی میں پہاڑ کو پہنچ جائے گا، ان میں سے جو بری بات ہے وہ تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔“

رذائل کے لئے قرآن پاک کا سب سے عام لفظ منکر ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں جن برائیوں کی روک ٹوک نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے، ان کو ایک ہی لفظ منکر سے ادا کیا گیا ہے:

﴿ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۷۹)

”وہ ایک دوسرے کو اس منکر سے جو کرتے تھے روکتے نہ تھے، کیا برا کام ہے جو وہ کرتے تھے۔“

ایک بدکار قوم کی برائیاں گنائی جا رہی ہیں، اس سلسلہ میں ہے:

آیت میں ممانعت نہ کی ہو۔ [1] اس آیت میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں، فحشا اور منکر اور بغی ان میں سے ہر لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

فحشا کے معنی

ان میں پہلا لفظ فَحْشَاءَ ہے، جس کی دوسری صورت فَاحِشَۃٌ کی ہے، یہ لفظ فحش سے نکلا ہے، جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ [2] اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبح یعنی برائی کے ہیں، کیونکہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کر دی ہے، اس سے آگے بڑھنا قبح یعنی برائی ہے، یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی فحشا کہلاتی ہے، قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدودالٰہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوت شہوانی کی تسکین کے لئے کچھ حدیں مقرر فرما دیں، اب جو ان حدوں سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدی حدود اور فحشا اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے، فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۵۔۷)

''اور جو اپنی شرم گاہوں کی نگہبانی کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر، تو انھیں ملامت نہیں کی جائے گی، پھر جو کوئی اس کے سوا کوئی ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

اسی لیے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے اور اس کے معنی ہی امرِ قبیح کے ہو گئے ہیں، قرآن نے کہا ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۳۲)

''اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ کیونکہ یہ ''فاحشہ'' (یعنی قبیح بات) اور بری راہ ہے۔''

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے، جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

منکر کے معنی

دوسرا لفظ منکر ہے، اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے، وہ تو جانا پہچانا کام ہے، اسی لئے اس کو معروف (شناسا) کہتے ہیں اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے، وہ منکر (ناشناسا) ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آ جاتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں:

﴿ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر: ۶۲ و ۵۱/ الذاریات: ۲۵)

---

[1] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور جزء: ۱۴، ص: ۱۰۰۔

[2] الصحاح للجوهری لفظ فحش ولسان العرب لفظ فاحش زیر "فحش" ج ۲، ص: ۱۰۵۶۔

آیت میں ممانعت نہ کی ہو۔ [1] اس آیت میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں، فحشا اور منکر اور بغی ان میں سے ہر لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

فحشا کے معنی

ان میں پہلا لفظ فَحْشَاءَ ہے، جس کی دوسری صورت فَاحِشَۃٌ کی ہے، یہ لفظ فحش سے نکلا ہے، جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ [2] اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبح یعنی برائی کے ہیں، کیونکہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کر دی ہے، اس سے آگے بڑھنا قبح یعنی برائی ہے، یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی فحشا کہلاتی ہے، قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدودِ الٰہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوت شہوانی کی تسکین کے لئے کچھ حدیں مقرر فرما دیں، اب جو ان حدوں سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدی حدود اور فحشا اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے، فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون: ۵۔۷)

''اور جو اپنی شرم گاہوں کی نگہبانی کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر، تو انھیں ملامت نہیں کی جائے گی، پھر جو کوئی اس کے سوا کوئی ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

اسی لیے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے اور اس کے معنی ہی امرِ قبیح کے ہو گئے ہیں، قرآن نے کہا ہے:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۳۲)

''اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ کیونکہ یہ ''فاحشہ'' (یعنی قبیح بات) اور بری راہ ہے۔''

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے، جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

منکر کے معنی

دوسرا لفظ منکر ہے، اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے، وہ تو جانا پہچانا کام ہے، اسی لئے اس کو معروف (شناسا) کہتے ہیں اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے، وہ منکر (ناشناسا) ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آجاتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں:

﴿ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر: ۶۲ و ۵۱/ الذاریات: ۲۵)

---

[1] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور جزء: ۱۴، ص: ۱۰۰۔

[2] الصحاح للجوہری لفظ فحش ولسان العرب لفظ فاحش زیر "فحش" ج ۲، ص: ۱۰۵۶۔

''لوگ ان جانے اوران پہچانے ہیں۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے جب ان کے بھائی آئے تو انھوں نے تو پہچان لیا، مگر وہ لوگ ان کو پہچان نہ سکے، اس موقع پر قرآن میں ہے:

﴿ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكِرُوْنَ ﴾ (۱۲/ یوسف:۵۸)

''یوسف نے تو ان کو پہچان لیا، مگر وہ ان کو نہ پہچان سکے۔''

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے اور اس کے طور و انداز سے بداہتہً ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے، یہ کیفیت بھی منکر ہے، فرمایا:

﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ ﴾ (۲۲/ الحج:۷۲)

''اور جب ان (کافروں) کو ہماری کھلی ہوئی آیتیں سنائی جائیں، تو کافروں کے چہروں میں تو منکر کو (بگڑی ہوئی شکل) پہچانے گا، نزدیک ہوتے ہیں کہ وہ ان پر جو ہماری آیتیں سناتے ہیں، حملہ کر بیٹھیں۔''

اس آیت میں ناخوشگواری کے اثر سے چہرہ میں جو بدنمائی پیدا ہوتی ہے، اس کو منکر کہا گیا ہے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ منکر وہ کام ہیں، جن کو ہر شخص فطرۃً اور بلاشبہ ناپسند کرتا ہے اور ان کی برائی ایسی کھلی ہوتی کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی سبب ہے کہ ہر مذہب وملت اور ہر اچھے تمدن وتہذیب میں وہ یکساں برے سمجھے جاتے ہیں۔

بغی کے معنی

تیسرا لفظ بغی ہے، جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہیں:

﴿ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ ﴾ (۳۸/ صٓ:۲۲)

''ہم دو جھگڑنے والے ہیں، ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔''

اللہ فرماتا ہے کہ اگر لوگوں کو بے انتہا دولت دے دی جائے تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں:

﴿ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۲۷)

''اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لئے روزی پھیلا دے تو وہ زمین میں زیادتی کریں۔''

اسی سورہ میں ہے:

﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ﴾

(۴۲/ الشوریٰ:۴۲)

''راہ ان ہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں زیادتی کرتے ہیں۔''

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ بغی کے معنی دوسروں پر زیادتی اور تعدی کے ہیں۔

اخلاق ذمیمہ برے کیوں ہیں

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین یعنی: فحشاء ، منکر اور بغی میں منحصر ہیں۔ صفاتِ ذمیمہ فحشا یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام ہیں اور ایسی باتیں ہیں، جن کو سارے انسان فطرۃً ناپسند کرتے ہیں اور ان کے جائز کر دینے سے دوسروں کے حقوق پر تعدّی لازم آتی ہے۔

سورۂ اعراف کی ایک آیت ہے:

﴿ قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾

(۷/ الاعراف:۳۳)

''اے پیغمبر! کہہ دے کہ میرے پروردگار نے برائی کے سارے کاموں (فواحش) کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو منع کیا ہے۔''

اس آیت میں بھی رذائل کو تین لفظوں میں منحصر کیا ہے، ایک فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہوں یا چھپے، دوسرے گناہ کے کام اور تیسرے ناحق زیادتی، ان اخلاقِ ذمیمہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکساں برا کہا ہے، اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت برائی اور بے حیائی کے کام ہیں اور دین وشرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں اور اگر ان کو جائز ٹھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے ایمان اٹھ جائے اور کسی کی جان و مال اور عزت وآبرو سلامت نہ رہے۔ [1]

رذائل کی ترتیب

ان رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جاسکتی ہے، ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ اور عدم رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے۔ اوپر کی آیت میں ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں گویا تقسیم کر دیا گیا ہے، سب سے پہلے فحشا پھر منکر، پھر بغی فَحْشَآء میں جس برائی کی طرف اشارہ ہے، وہ اساسًا ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے، جیسے ننگے رہنا، بدکاری میں مبتلا ہونا وغیرہ۔ منکر سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے، جیسے شوہر کا ظلم، باپ کی سنگدلی، اولاد کی نالائقی اور بغی جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک وملت کو چھا لیتی ہے، جیسے چوری، قتل، ڈاکہ وغیرہ۔

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی۔ دوسرے نظریہ کے رو سے پہلے صفاتِ ذمیمہ ہیں جن سے اللہ کی رحمت چھن جاتی ہے، پھر وہ برائیاں ہیں، جو اللہ کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں اور پھر وہ ہیں جو رضائے الٰہی سے خالی ہیں۔

[1] منطقی اصطلاح میں فحشاء، منکر اور بغی میں مانعة الخلو ہے، یعنی کسی بداخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہوسکتا ہے، مگر کوئی بداخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی، یعنی ہر بداخلاقی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

جھوٹ

انسان کے سارے اخلاقِ ذمیمہ میں سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے۔ یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر ہو جائے، کیونکہ ہمارے اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہوں اور جھوٹ ٹھیک اس کی ضد ہے، اس لئے یہ برائی ہر قسم کی قولی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے، انسان کے دل کے اندر کی بات سوا اللہ کے کوئی دوسرا نہیں جانتا، کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا ہے یا باور کر سکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اس کو ظاہر کرے۔ اب اگر وہ اپنی اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہیں ظاہر کرتا بلکہ اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے، ایسے شخص میں دنیا کی جو برائیاں بھی نہ ہوں وہ کم ہے، کیونکہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑ ڈالا ہے، جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے۔

اسی لئے نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو، چنانچہ بعض پیغمبروں کے لئے یہ صفت کے طور پر بولا گیا ہے، فرمایا:

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ۙ ﴾ (۱۹/ مریم:۵۶)

''اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کر، وہ بے شک بڑا سچا نبی تھا۔''

اسی لیے جو کاذب ہے وہ نبی نہیں ہو سکتا، کیونکہ پھر اس کے دعویٰ اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیونکر ہو گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ فرعون کے سامنے پیش کیا اور اس نے اس کے ماننے سے انکار کیا تو اس کے ایک درباری نے جو دل میں مسلمان تھا، فرعونیوں کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صدقِ نبوت پر ان کی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی اور کہا کہ جھوٹا اللہ کا نبی نہیں ہو سکتا:

﴿ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝ ﴾

(۴۰/ المؤمن:۲۸)

''اگر یہ جھوٹا ہو گا تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا اور اگر سچا ہو گا تو تم پر پڑے گا کوئی وعدہ جو تم کو دیتا ہے، بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو بے باک جھوٹا ہو۔''

اس میں یہ تلمیح بھی چھپی ہے کہ مدعی نبوت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کر گزرنے میں بے باک اور جھوٹا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے انبیا علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں اور کفار کے طور و طریق پر چلتے ہیں۔ روم کے قیصر نے بھی اپنے دربار میں ابوسفیان سے جو باتیں پوچھی تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کا مدعی اپنے دعوائے نبوت سے پہلے کیا جھوٹ بھی بولا کرتا تھا؟ ابوسفیان نے جواب دیا نہیں۔ قیصر نے کہا، جو

بندہ پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ اللہ پر جھوٹ باندھے گا؟ [1] یہ نہیں ہوسکتا۔

قرآن پاک میں نبی کی صداقت کی دلیل میں ایک اور آیت ہے:

﴿ تَنَزَّلُ عَلٰی كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍۙ۝ یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَؕ۝ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۲۲۳)

''شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گناہگار پر، لا ڈالتے ہیں سنی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں۔''

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت اور روش کے سراسر خلاف ہے، اسی لیے جو جھوٹا ہوتا ہے اس کے دل سے اللہ کی روشنی (ہدایت) بجھ جاتی ہے، ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳)

''بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹا ہے، احسان نہیں مانتا۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جھوٹ گناہ (فجور) کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ میں اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔'' [2] حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! جنت میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا: ''سچ بولنا، جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے اور جو نیکی کا کام کرتا ہے، وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا۔'' اس نے پھر پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا: ''جھوٹ بولنا، جب بندہ جھوٹ بولے گا، تو گناہ کے کام کرے گا اور جب گناہ کے کام کرے تو کفر کرے گا اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے گا۔'' [3]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آجاتا ہے، جس سے زیادہ بری چیز کوئی دوسری نہیں اور جس کے لیے نجات کا ہر دروازہ بند ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ وسیع ہے، وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو گھیرے ہوئے ہے، اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کررہی ہے، مگر رحمتِ الٰہی کے اس گھنے سایہ سے وہ باہر ہے، جس کا منہ جھوٹ کی باد سموم سے جھلس رہا ہے۔

اسلام کے لغت کا سخت ترین لفظ ''لعنت'' کے معنی ''اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی'' کے ہیں، قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان بتایا گیا ہے اور اس کے بعد یہودیوں، کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے، لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹا الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت کی جائے مباہلہ کے موقع پر

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ۷۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قوله تعالی: ﴿وكونوا مع الصادقين﴾: ۶۰۹۴ وجامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الصدق: ۱۹۷۱ وابوداود، کتاب الادب، باب التشديد فی الكذب: ۴۹۸۹۔ [3] مسند احمد، ج ۲، ص:۱۷۶۔

فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدائے تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو:

﴿ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۶۱)

''پھر دعا کریں، پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔''

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا:

﴿ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۝ ﴾ (۲۴/ النور:۷)

''اس پر اللہ کی لعنت ہو، اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس کا مرتکب ہوتا ہے، وہ کافروں اور منافقوں کی طرح کی بددعا کا مستحق ہوتا ہے۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر کوئی انجان بن جائے، حق کا علم رکھ کر اس کے اظہار سے باز رہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے جھوٹوں پر بھی لعنت فرمائی ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۵۹)

''بے شک جو چھپاتے ہیں جو اتارے ہم نے صاف حکم اور راہ کے نشان، اس کے بعد کہ ہم نے کتاب میں ان کو انسانوں کے لیے کھول کر کہہ دیا ہے، ان پر اللہ لعنت بھیجتا ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔''

یہ جھوٹ کی سلبی صورت ہے، کیونکہ اس خاموشی اور اخفا سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں اور اس کو جھوٹا سمجھیں، اس لیے وہ جھوٹ کے گو قولاً نہیں، لیکن عملاً مرتکب ہوتے ہیں اور نفاق کی پرورش کرتے ہیں۔ نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ، اس لیے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا ہوگا، چنانچہ قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے، فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ۝ ﴾ (۶۳/ المنافقون:۱)

''اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔''

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے، فرمایا کہ ''منافق کی پہچان تین ہے، جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدے کرے پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔'' [1] لفظوں میں تو یہ باتیں تین ہیں، لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں، جھوٹ باتیں کرنا

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قولہ تعالیٰ: ﴿یایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین﴾: ۶۰۹۵۔

تو جھوٹ ہے ہی مگر وعدہ کر کے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے۔ کیونکہ جو امین بنتا ہے وہ معناً اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا۔ جھوٹ اکیلی برائی نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں، بیسیوں قسم کی دوسری برائیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری بری صفتیں بھی ظاہر کی ہیں، جیسے:

﴿ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۲۲۲)

''جھوٹ بولنے والا گناہگار۔''

﴿ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳)

''جھوٹ بولنے والا، احسان کا حق نہ ماننے والا۔''

﴿ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴾ (۴۰/ المؤمن:۲۸)

''بے باک جھوٹا۔''

ان آیتوں نے بتایا کہ جھوٹا گناہوں میں لت پت ہوتا ہے، کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے جھجکتا نہیں، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر میں اس کو چھپا لوں گا، اس لیے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جو جھوٹا ہو گا وہ اپنے کسی محسن کا احسان بھی نہیں مانے گا، کیونکہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت میں جھوٹا ہی سمجھے گا اور اگر وہ زبان سے کہے بھی کہ میں مانتا ہوں تو کسی کو اس بات پر یقین کاہے کو آنے لگا۔ اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے اس کو کسی برے سے برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، وہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے۔

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہیں، یا اس کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو، لیکن یہ کذبِ قولی یعنی زبان کا جھوٹ ہے۔ کذبِ عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے:

﴿ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴾ (۹/ التوبۃ:۷۷)

''اس لیے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لیے کہ جھوٹ بولتے تھے۔''

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلوں میں نفاق نے جگہ پکڑی، قسم کھا کر اور وعدہ کر کے کسی کام کو طاقت رکھ کر پھر نہ کرنا، ایک قسم کا فریب تو ہے ہی، مگر جھوٹ بھی ہے اور ایسا جھوٹ جو مہلک ہے:

﴿ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ (۹/ التوبۃ:۴۲)

’’اور وہ قسم کھائیں گے کہ ہم کو مقدور ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ لڑائی میں چلتے، وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور اللہ کو معلوم ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔‘‘

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے ان صادقین کا ذکر فرمایا ہے، جنہوں نے اپنی سچائی کا عملاً ثبوت دیا اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے ان کو منافق کا خطاب دیا ہے، فرمایا:

﴿ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۲٤)

’’تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کے سبب سے اجر دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا ان پر رجوع ہو (یعنی مسلمان ہو جائیں تو معاف ہو جائے)۔‘‘

انسان کی طرح اس کا عضو عضو بھی جھوٹ کا مرتکب ہو سکتا ہے، فرمایا:

﴿ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴾ (۹٦/ العلق:۱٦)

’’جھوٹی خطاکار پیشانی۔‘‘

ہر چند کہ اس کو استعارہ کہیے، پھر بھی پیشانی کا جھوٹ کلنک کا ٹیکا ہے، جو مٹ نہیں سکتا۔

اسی طرح ریاکاری کرنا اور جو نہیں ہے اپنے کو وہ دکھانے کی کوشش کرنا بھی عملاً جھوٹ ہے:

﴿ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (۳/ آل عمران:۱٦۷)

’’انھوں نے کہا اگر ہم جانیں کہ لڑائی ہوگی تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں، وہ اس وقت ایمان سے زیادہ کفر سے قریب ہیں، وہ منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں۔‘‘

دل کے ان بیماروں کے متعلق جو مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو آ کر اپنی صلح پسندی کا جھوٹا یقین دلاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (٤/ النسآء:٦۳)

’’یہ وہ ہیں جن کے دل کا حال اللہ جانتا ہے۔‘‘

ایسے ہی وہ شخص جو اپنے آپ کو وہ دکھانا چاہے جو وہ نہیں ہے یا اپنے میں وہ باور کرانا چاہے جو اس میں نہیں ہے جھوٹا ہے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ! میری ایک پڑوسن (سوتن) ہے، کیا اگر میں یہ ظاہر کروں کہ مجھے شوہر نے یہ دیا یہ دیا اور واقعہ یہ نہ ہو صرف اس کو جلانا مدنظر ہو تو کیا یہ بھی گناہ ہے؟ فرمایا: ’’جو جتنا نہیں دیا گیا اتنے کا دکھاوا کرنے والا جھوٹ کے دو جامے پہننے والے کی طرح ہے۔‘‘ [1] حدیث کے شارح کہتے ہیں کہ دو جامے یوں کہ جو اس کے پاس نہیں اس کا ہونا اپنے

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب فیمن یتشبع بمالم یعط:٤۹۹۷۔

پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامہ ہوا اور جس نے جو نہیں دیا، اس کا دینا بتانا اس پر جھوٹ باندھنا ہے، یہ جھوٹ کا دوسرا جامہ ہوا۔ اسی طرح جو عالم نہیں وہ اپنے کو عالم باور کرانے کی کوشش کرے، جو دولت مند نہیں وہ دولت مندی کا دکھاوا کرے، یعنی کسی کے پاس جو چیز نہیں اس کو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا، درحقیقت دوسروں کو فریب دینے کی کوشش ہے۔ غالباً اسی لیے اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہوں، اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالوں کو لمبا بنائے، آنحضرت ﷺ نے اس کو بھی زُور فرمایا ہے۔ ❶

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہیں، اچھے اچھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو برا نہیں جانتے، جیسے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لیے ان سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان وعدوں کو تھوڑی دیر میں بھول جائیں گے اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے، مگر جھوٹ بہر حال جھوٹ ہے۔ اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی ہے، ایک کمسن صحابی عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا اور حضور انور ﷺ میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے، تو ماں نے میرے بلانے کے لیے کہا کہ یہاں آ تجھے کچھ دوں گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم کہتی ہو مگر تم اس کو کچھ دینا نہیں چاہتی ہو۔'' ماں نے کہا، اس کو کھجور دے دوں گی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتیں تو یہ جھوٹ بھی تمہارا لکھا جاتا۔'' ❷

اس تعلیم کا منشا یہ تو ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال میں بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلودہ نہیں کرنا چاہیے، لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید فرمانا اس لیے بھی ہے کہ ماں باپ کی غلط تعلیم و تربیت سے بچے پر برا اثر پڑے گا، وہ بچپن میں جو کچھ دیکھے اور سنے گا، اسی سانچے میں ڈھلے گا۔ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ بچوں سے بھی جھوٹ نہ بولیں۔ بعض لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب ان کو کھانے کے لیے یا کسی اور چیز کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ تصنع اور بناوٹ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ مجھے خواہش نہیں، حالانکہ ان کے دل میں اس کی خواہش موجود ہوتی ہے اور وہ انکار کرتے ہیں تو یہ بھی جھوٹ ہے، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا، کہ ہم میں سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے اور پھر کہہ دے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا؟ ارشاد ہوا کہ ''ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی جھوٹ لکھا جاتا ہے۔'' ❸ اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش گپی کے موقع پر محض لطفِ صحبت کے لیے بولا جاتا ہے، اس سے بھی اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ بعض موقعوں پر یہ ایک دلچسپی کی چیز بن جاتا ہے، تاہم اسلام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو شخص لوگوں کے ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا

---

❶ صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب الوصل الشعر: ٥٩٣٨۔

❷ ابوداود، کتاب الادب، باب التشدید فی الکذب: ٤٩٩١۔ ❸ مسند احمد، ٦/٤٣٨ وطبرانی کبیر (مجمع الزوائد ہیثمی، کتاب العلم، باب فی ذم الکذب) ج١، ص: ١٤٠۔

ہے،اس پر افسوس،اس پر افسوس۔'' ❶ کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس شخص کا سچ جھوٹ برابر ہے۔اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتیں ہیں،ان کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کیے ہیں۔ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابلِ اعتبار سمجھتا ہے،اس لیے اس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے،لیکن وہ شخص اس کے علم ویقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب ونقصان میں مبتلا کر دیتا ہے۔اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درآنحالیکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو۔'' ❷ اس سے بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے،جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت وآبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو،یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو زُور اور اِفک وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے،جس کے معنی منحرف ہونے اور الٹ پلٹ دینے کے ہیں۔جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ﴾ (۲۲/ الحج:۳۰)

''بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو۔''

زُور اگرچہ ایک عام لفظ ہے،جس میں کذب وبہتان وغیرہ سب شامل ہیں،لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر شہادت مراد ہے۔جامع ترمذی میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ''کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا،ہاں یارسول اللہ ﷺ! فرمایا کہ ''شرک اور باپ ماں کی نافرمانی''۔راوی کا بیان ہے کہ آپ ﷺ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتًہ اٹھ بیٹھے اور کہا کہ ''جھوٹی شہادت'' یا ''جھوٹی بات۔'' اور برابر یہی کہتے رہے،یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ ﷺ خاموش ہو جاتے۔ ❸

اس آیت پاک اور اس کی اس تشریحی حدیث میں غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ شرک کے بعد ہی جو برائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی وہ یہی جھوٹ ہے،اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا۔اِفْكٌ اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے،اس کے معنی ہیں کسی پر جھوٹ باندھنا۔مشرک اللہ پر جو جھوٹ باندھا کرتے تھے،ان کو قرآن نے افک کہا ہے۔اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے۔منافقین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جو بہتان لگایا تھا،اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ ''افک'' سے

❶ سنن ابی داود، کتاب الادب، باب التشدید فی الکذب: ٤٩٩٠۔

❷ ادب المفرد، باب اذا کذبت لرجل ھو لك مصدق: ٣٩٣۔

❸ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة باب ماجاء فی حقوق الوالدین: ١٩٠١۔

تعبیر کیا ہے۔ (سورۃ النور) اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ افک بڑے خبث طینت کا کام ہے، فرمایا:

﴿ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۲۲۲)

''اور شیطان (تو) اترا کرتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے بدکردار پر۔''

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے، ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے اور سوسائٹی میں اس کی بات کی کوئی قدر نہیں ہوتی، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ)) [1]

''آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ کہتا پھرے۔''

ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے:

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۱)

''جھوٹ کے بڑے سننے والوں۔''

کا خطاب دیا ہے۔ یہودیوں کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا:

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۱)

''جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں۔''

[1] صحیح مسلم، المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع: ۷۔

جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت میں شہادت یعنی گواہی ہے۔ جو شخص کسی بات کو اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہے، وہ اصل میں اپنے بیان کی سچائی پر اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور سچائی سے دور ہیں وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ لوگ ان کے بیان کو سچا نہیں سمجھتے اس لیے وہ لوگوں کو فریب دینے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔

اول تو بے ضرورت قسم کھانا ہی برا ہے۔ پھر جھوٹی قسمیں کھانا تو اور بھی برا ہے، اسی لیے قرآن پاک میں اس قسم کے کھانے والوں کی بہت برائی آئی ہے، یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے، جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ اللہ کو بھی شریک کرتا ہے۔ اسی لیے کسی آیندہ کی بات پر اگر کوئی قسم کھا لے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور اگر کسی سبب سے پورا نہ کر سکے تو وہ گناہگار ہوتا ہے اور اس پر کفارہ لازم آتا ہے، کفارہ یہ ہے کہ وہ کوئی غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑے پہنائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے اور اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ کسی کو قسم کھانے کے بعد اگر دوسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے۔ [1]

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ﴾

(٥/ المآئدۃ:٨٩)

''اللہ تم کو تمہاری بے فائدہ قسموں پر نہیں پکڑتا، لیکن اس قسم پر پکڑتا ہے جس کو تم نے گرہ باندھا، تو اس قسم کے توڑنے کا کفارہ دس محتاجوں کو کھلانا بیچ کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے ہو، یا ان کو کپڑا دینا، یا ایک غلام آزاد کرنا، تو جس کو یہ پیدا نہ ہو تو تین دنوں کا روزہ رکھنا، یہ ہے تمہاری قسموں کا اتار جب تم قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کو نگاہ رکھو۔''

قسموں کو نگاہ رکھنا یہ ہے کہ جس بات پر نیت کر کے قسم کھائی جائے، اگر وہ کوئی خلاف شرع یا غیر انسب نہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے اور اس کو حتی المقدور پورا کیا جائے اور اگر پوری نہ کی جا سکے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔ یہ کفارہ اسی لیے مقرر کیا گیا ہے، تاکہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے۔

---

[1] ابوداود، کتاب الایمان والنذور، باب الحنث اذا کان خیرًا: ٣٢٧٦ تا ٣٢٧٨۔

کسی خلاف شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے، بعد کو غیر انسب معلوم ہو، تو اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا درست ہے، اللہ نے فرمایا:

﴿ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ ﴾ (٦٦/ التحریم:٢)

''اللہ نے تم کو اپنی قسموں کا کھول ڈالنا ٹھہرا دیا ہے۔''

اور احادیث میں اس کی جزئی تصریحات مذکور ہیں۔

گزشتہ یا موجودہ واقعات پر قسم کھانا جیسا کہ کہا جا چکا حقیقت میں گواہی اور شہادت ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ گواہی اور شہادت میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے، اسی لیے ایسا شخص جو بات بات پر قسمیں کھاتا رہتا ہے، حد درجہ بے اعتبار اور ناقابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایسے شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو انسان کا بڑا عیب بتایا ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے:

﴿ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۙ﴾ (٦٨/ القلم:١٠)

''اور بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہنا نہ مان۔''

سمجھنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانیں اور اس کا اعتبار کریں، لیکن اللہ تعالیٰ سرے سے اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت اور اس کی بے قدری اور بے اعتباری کا اعلان فرماتا ہے۔

چونکہ اس طرح کی قسمیں کھانے والے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں، اسی لیے یہ نفاق کی بڑی نشانی ہے اور قرآن پاک میں اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے، منافقوں کے تذکرہ میں ہے کہ جب ان پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہمارا یہ منشا نہ تھا، ہماری نیت نیک تھی، اللہ فرماتا ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کی بات خوب معلوم ہے:

﴿ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۤ ﴾ (٤/ النساء:٦٢)

''پھر کیسا جب ان کو اپنے ہی کرتوت سے کوئی تکلیف پہنچے، پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے آئیں کہ ہماری غرض بھلائی اور ملاپ کی تھی، یہ وہ ہیں جن کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم ہے۔''

یعنی اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کچھ ہے اور زبانوں پر کچھ ہے، ایسے لوگ یہ چاہا کرتے ہیں کہ قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر متعلق اشخاص کو خوش کر دیں، اللہ فرماتا ہے کہ اگر ان کے پاس ایمان ہو تو ان کو چاہیے کہ سچائی اختیار کر کے اللہ اور رسول کو خوش کریں:

﴿ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝﴾

(۹/ التوبۃ:۶۲)

''تمہارے (مسلمانوں کے) آگے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، تاکہ وہ تم کو راضی کرلیں اور اللہ اور رسول کو راضی کرنا زیادہ ضروری ہے، اگر وہ ایمان دار ہیں۔''

ایسے منافقوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بری بات منہ سے نکالتے ہیں اور اس پر پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے تو فوراً مکر جاتے ہیں:

﴿ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا ﴾ (۹/ التوبۃ:۷۴)

''اللہ کی (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے نہیں کہا، حالانکہ انھوں نے بے شک کفر کی بات کہی۔''

ایک موقع پر منافقوں نے ایک نامعقول کام کیا، اللہ نے فرمایا کہ تم جاکر ان سے پوچھو گے تو وہ اللہ کی قسم کھاجائیں گے۔ سَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ (۹/ التوبۃ:۹۵) چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴾ (۹/ التوبۃ:۹۶)

''تمہارے آگے قسمیں کھاتے ہیں، تاکہ تم ان سے راضی ہوجاؤ، تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں۔''

اس لیے جو لوگ اللہ کی بات دل سے مانتے نہیں اور زبان سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ مانتے ہیں، وہ فاسق اور نافرمان ہیں۔

اسی موقع پر کچھ منافقوں نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد الگ کھڑی کرلی تھی، اللہ نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھو گے تو جھٹ قسم کھا بیٹھیں گے کہ ہماری نیت اچھی تھی، فرمایا:

﴿ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۷)

''اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔''

اہل نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے:

﴿ وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴾ (۵۸/ المجادلۃ:۱۴)

''وہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں۔''

﴿ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً ﴾ (۵۸/ المجادلۃ:۱۶و۶۳/ المنافقون:۲)

''انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہے۔''

یعنی قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ اور اس کو اپنے بچاؤ کے لیے ڈھال بنایا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید فرمائی:

﴿ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ ﴾ (١٦/ النحل:٩١۔٩٢)

''اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑمت ڈالو اور تم نے اپنے پر اللہ کو ضامن بنایا ہے، بے شک اللہ تمہارے کاموں کو جانتا ہے اور اس عورت کے جیسے نہ بنو جو اپنے کاتے سوت کو محنت کیے پیچھے توڑ کر ٹکڑے کر دیتی ہے، تم اپنی قسموں کو آپس میں بیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو کہ ایک فریق دوسرے فریق سے بڑھ چڑھ کر ہو۔''

اللہ کا نام لے کر کوئی معاہدہ کرنا اور اس کو توڑ ڈالنا اللہ کے مقدس نام کی تحقیر ہے، اسی لیے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی اس پر اس نے گویا اللہ کو ضامن ٹھہرایا، اس لیے قسم کھا کر توڑا نہ کرو اور لوگوں کو دھوکا نہ دیا کرو، پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے، جیسا عرب کی ایک بیوقوف عورت کا تھا، جو سوت کات کات کر کھول دیتی یا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی۔

جب ایک فریق دوسرے فریق سے اللہ کا نام لے کر معاہدہ کرتا ہے تو گویا وہ اللہ کی ضمانت پر دوسرے کو مامون بناتا ہے، اب اگر وہ کوئی قوت پا کر بدعہدی کرتا ہے اور اس فریق سے ٹوٹ کر کسی دوسرے طاقتور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنا اللہ کے نام پر جھوٹ بولنا ہے اور یہ ایک کی بجائے دو گناہوں کا مجموعہ ہے، یعنی غصب اور جھوٹ اور وہ بھی اللہ کے پاک اور مقدس نام پر، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰۗىِٕكَ لَا خَلَاقَ لَھُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُھُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾

(٣/ آل عمران:٧٧)

''بے شک جو لوگ اللہ کے قرار اور اپنی قسموں پر (دنیا کا) تھوڑا سا مال خریدتے ہیں، آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، نہ اللہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا قیامت میں اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

شان نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیوں کی بددیانتیوں کی تصویر ہے، مگر آیت اپنے حکم

کے لحاظ سے بہر حال عام ہے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ صحابی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ’’جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال لینا چاہے گا تو جب وہ اللہ کے پاس جائے گا تو اللہ اس پر غضب ناک ہوگا‘‘۔ اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ صحابی نے کہا، اللہ کی قسم! یہ آیت میرے واقعہ میں اتری ہے۔ میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی، اس نے میری ملکیت سے انکار کیا، میں نے یہ مقدمہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا، حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے؟ میں نے کہا نہیں، تو آپ ﷺ نے اس یہودی سے فرمایا کہ ’’تم قسم کھاؤ‘‘ تو میں نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! وہ تو اب قسم کھا جائے گا اور میری چیز لے لے گا، اس وقت یہ آیت اتری۔ [1]

ابن جریر کی بعض روایتوں میں ہے کہ یہ آیت ان سوداگروں کی شان میں ہے جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا سامان بیچتے ہیں، اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے تین دفعہ فرمایا: ’’تین آدمی ہیں، جن کی طرف اللہ قیامت کے دن نہ دیکھے گا، نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے‘‘۔ صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے کہا کہ وہ لوگ جو ناکام ہوئے اور خسارے میں پڑے، وہ کون ہیں؟ یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا: ’’جو اپنا لباس گھٹنوں کے نیچے تک لٹکاتا ہے، (کیونکہ یہ غرور کی علامت ہے) اور جو احسان جتاتا ہے اور جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال بیچتا ہے۔‘‘ [2] بہر حال جیسا کہ معلوم ہے کہ شان نزول سے مراد وہ واقعہ ہے جس پر کوئی آیت پوری طرح صادق آ جائے، اس لیے ان تمام واقعات پر آیت کا حکم یکساں جاری ہوگا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو اللہ اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کرے گا۔‘‘ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! کیا اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو، فرمایا: ’’درخت (اراک) کی ڈالی ہی کیوں نہ ہو۔‘‘ [3] حضرت انس رضی اللہ عنہ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ’’بڑے بڑے گناہ یہ ہیں، اللہ کا شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، کسی بے گناہ کی جان لینا اور جھوٹی قسم کھانا۔‘‘ [4] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جس شخص سے قسم کھلوائی جائے اور وہ جھوٹ قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرہ لے کر دوزخ میں ٹھکانا پائے گا۔‘‘ [5] چہرہ کی

---

[1] ابوداود، کتاب الایمان والنذور، باب فی من حلف لیقتطع بھا مالا:۳۲۴۳ وابن جریر، ج۳، ص:۲۰۸ سورہ آل عمران۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان غلظ تحریم اسبال : ۲۹۳؛ ابوداود، کتاب اللباس، باب ما جاء فی اسبال الازار: ۴۰۸۷؛ ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فیمن حلف علی سلعة کاذبا: ۱۲۱۱؛ نسائی، کتاب الزینة، باب اسبال الازار: ۵۳۳۵؛ ابن ماجه، ابواب التجارات:۲۲۰۸۔ [3] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین:۳۵۳۔ [4] سنن نسائی، کتاب المحاربة، باب ذکر الکبائر: ۴۰۱۵۔ [5] سنن ابی داود، کتاب الایمان والنذور، باب التغلیظ فی یمین الفاجر:۳۲۴۲۔

خصوصیت شاید اس لیے ہے کہ اس نے انسانی عزت و آبرو کے خلاف کام کیا اور بڑی ڈھٹائی دکھائی، جس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصل حقیقت بتانے میں جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، اس لیے خاص طور سے رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے، فرمایا: ''جھوٹی قسم مال بکوا دیتی ہے لیکن نفع (کی برکت) کو گھٹا دیتی ہے۔'' [1] روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹتی ہے وہ تو ہے ہی، لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر میں چل کر اس کی عام بے اعتباری کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ اس کی تشریح ایک دوسری روایت میں ہے، حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تجارت میں بہت قسمیں کھانے سے پرہیز کرو، کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے، پھر بے برکتی ہو جاتی ہے۔'' کیسے بلیغ فقرے ہیں: ((فانه ينفق ثم يمحق)) [2] جھوٹی قسموں کے علاوہ عام طور سے بے باکی کے ساتھ قسمیں کھانا بھی اسلامی شرافت کے خلاف ہے۔ قرآن پاک کی آیت اوپر گزر چکی ہے کہ بے سبب قسمیں کھانا ذلت و خواری کا سبب ہے۔

﴿ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ ﴾ (٦٨/ القلم: ١٠) حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قسمیں کھانا قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے، یا ندامت اور شرمساری کا موجب ہے۔'' [3]

---

[1] صحيح بخاری، كتاب البيوع، باب يمحق الله الربا: ٢٠٨٧؛ صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب النهى عن الحلف فى البيع: ٤١٢٥؛ ابوداود، كتاب البيوع، باب فى كراهية الحلف فى البيع: ٣٣٣٥؛ نسائى، كتاب البيوع، باب المنفق سلعته بالحلف: ٤٤٦٦۔

[2] صحيح مسلم، ايضًا: ٤١٢٦؛ نسائى، ايضًا: ٤٤٦٥؛ ابن ماجه، ابواب التجارات، باب ما جاء فى كراهية الايمان: ٢٢٠٩۔ [3] ابن ماجه، ابواب الكفارات، باب اليمين حنث اوندم: ٢١٠٣؛ صحيح ابن حبان، كتاب الايمان: ٤٣٤١۔

وعدہ خلافی

وعدہ کر کے اس کے خلاف کرنا، بہت بڑی برائی ہے اور یہ بھی حقیقت میں جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدوں کے کتنے سچے اور اپنی بات کے کیسے پکے ہیں۔ جب کوئی شخص کوئی وعدہ کر لیتا ہے تو اپنے اوپر ایک ذمہ داری اوڑھ لیتا ہے، فرمایا:

﴿ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۳۴)

"بے شک وعدہ کی باز پرس ہوگی۔"

اور جس کی باز پرس اللہ فرمائے اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی۔

قرآن پاک میں منافقوں کے سلسلہ میں ہے کہ ان کی بدعہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا، فرمایا:

﴿ فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ﴾ (۹/ التوبۃ:۷۷)

"پس اس کا اثر ان کے دل میں اللہ نے نفاق رکھا، اس دن تک جب وہ اس سے ملیں گے، اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے وعدہ کر کے خلاف کیا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔"

صحیحین میں ہے کہ "منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف کرے، جب امانت دار بنایا جائے تو خیانت کرے۔" ❶ (صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے) "اگر چہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزے رکھتا ہو اور سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے۔" ❷ صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "یہ چار باتیں جس میں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو اس میں منافق کی ایک نشانی ہے، جب تک اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت دار بنایا جائے خیانت کرے، جب بولے جھوٹ بولے، جب معاہدہ کرے خلاف کرے، جب جھگڑے گالی بکے۔" ❸

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مجھ سے تین باتوں کا ذمہ لو تو میں تمہارے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں، جب بولو تو سچ بولو اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو اور جب امین بنو تو خیانت نہ کرو۔" ❹

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق:۳۳؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق:۲۱۱۔ ❷ صحیح مسلم، ایضا:۲۱۳، ۲۱۴۔ ❸ صحیح بخاری، ایضا:۳۴؛ صحیح مسلم، ایضا:۲۱۰۔ ❹ احمد، ۵/ ۳۲۳؛ حاکم، ۴/ ۳۵۸، ۳۵۹؛ ابو یعلی: ۴۲۵۷؛ بیهقی فی الشعب: ۴۳۵۵، منذری باب انجاز الوعد۔

خیانت اور بددیانتی

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو، اس کے ادا کرنے میں ایمانداری نہ برتنا، خیانت اور بددیانتی ہے۔ اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اس میں بے جا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے، یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کر کے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے۔ اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو اس کو وہ دیانت داری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا۔ علیٰ ہذا عام مسلمانوں، ائمہ وقت اور اپنے متفقہ قومی و ملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بددیانتی ہے، دوست ہو کر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے، بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے، دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے۔ اسلام کی اخلاقی شریعت میں یہ ساری خیانتیں یکساں ممنوع ہیں، فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝ ﴾

(۸/ الانفال :۲۷)

”اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں جان کر بددیانتی کرو۔“

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کر کے پورا نہ کیا جائے، ایمان داری سے ان کے حکموں کی تعمیل نہ کی جائے، دین و ملت کے مصالح کے ساتھ غداری کی جائے اور اللہ و رسول اور مسلمانوں کے دشمنوں کو چھپے چوری امداد پہنچائی جائے، یا مسلمانوں کے چھپے راز ان کو بتائے جائیں۔ اسی طرح آپس کی امانتوں میں خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو اس میں وہ ناجائز تصرف کرے اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو، اس کو دوسروں پر ظاہر کر دے۔ یہ حدیث کئی دفعہ اوپر آ چکی ہے کہ ”منافق کی تین علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے، تو وہ اس میں خیانت کرے“۔ [1] ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ کی راہ میں مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے، لیکن امانت کا، قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا، اگرچہ وہ اللہ کی راہ میں شہید ہی ہوا ہو اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کرو، وہ کہے گا خداوندا! اب کیسے لاؤں، دنیا تو ختم ہو چکی، کہا جائے گا اس کو دوزخ کے طبقہ ہاویہ میں لے جاؤ، وہاں امانت کی چیز مثال بن کر اصل صورت میں سامنے آئے گی، تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان جائے گا اور اس کے پیچھے گرے گا، یہاں تک کہ اس کو پکڑ لے گا اور اس کو اپنے کندھوں پر لاد کر لے چلے گا، جب دوزخ سے نکلنا چاہے گا تو وہ بوجھ اس کے کندھے سے گر پڑے گا اور وہ پھر اس کے پیچھے ہمیشہ ہمیشہ گرتا چلا جائے گا۔ پھر انھوں نے فرمایا: نماز امانت

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق:۳۳؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ۲۱۲۔

ہے، وضو امانت ہے، تول بھی امانت ہے، ناپ بھی امانت ہے اور بہت سی چیزیں گنا کر فرمایا اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزوں کا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ صحابی کو سنائی، انہوں نے تصدیق کی اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ﴾ (٤/ النسآء:٥٨)

''بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو ادا کر دیا کرو۔'' ❶

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلائے گواہی دیں گے، خیانت کریں گے، امانت داری نہیں کریں گے اور نذر مانیں گے تو پوری نہ کریں گے۔'' ❷

آنحضرت ﷺ جن بری باتوں سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے، ان میں سے ایک خیانت بھی ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ''الٰہی! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا، کہ یہ بہت برا اندرونی ساتھی ہے۔'' ❸ خیانت کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسی جماعت میں شامل ہو کر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر میں لگے رہنا۔ چنانچہ منافقین جو دل میں کچھ رکھتے تھے اور زبان سے کچھ کہتے تھے، وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشوں میں لگے رہتے تھے، مگر ان کی یہ چال کارگر نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ ان کا بھید کھل جاتا تھا، فرمایا:

﴿ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ﴾ (٥/ المآئدة:١٣)

''اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے ان کی ایک خیانت کی۔''

یعنی ان کی کسی خیانت کی خبر رسول کو ملتی ہی رہتی تھی۔

جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان بین عزیز سے کرائی، اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لیے کیا:

﴿ ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ ﴾

(١٢/ یوسف:٥٢)

''تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے چوری چھپے اس سے خیانت نہیں کی اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو نہیں چلاتا۔''

حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں نے اپنے مقدس شوہروں سے بیوفائی کی، ان کی بیوفائی

❶ مسند احمد، بیهقی فی الشعب: ٥٢٦٦؛ منذری، باب الترغیب فی انجاز الوعد، ج ٢، ص: ٢٠١۔
❷ صحیح بخاری، کتاب الشهادات: ٢٦٥١ وصحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة: ٦٤٧٥۔
❸ ابو داود، کتاب الوتر، باب فی الاستعاذة: ١٥٤٧؛ نسائی، کتاب الاستعاذة: ٥٤٧١۔

یہ تھی کہ وہ توقع کے خلاف اپنے شوہروں پر ایمان نہیں لائیں اور کافروں کا ساتھ دیتی رہیں، اللہ نے فرمایا:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ (٦٦/ التحریم:١٠)

''اللہ نے کافروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان کی، یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں، تو ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی، تو یہ دونوں (پیغمبر ہو کر بھی) اپنی بیویوں کو اللہ سے ذرا نہ بچا سکے۔''

یہ دل کی خیانت تھی۔

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک ایک عضو سے ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ چشم و ابرو کے اشاروں سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپی کی ہر حرکت سے ہر وقت باخبر رہتی ہے تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو۔ اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے خیانتوں کا خاتمہ کرتا ہے، فرمایا:

﴿يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ۝﴾ (٤٠/ المؤمن:١٩)

''اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری کو اور جو چھپا ہے سینوں میں۔''

پھر اس سے چھپ کر کیونکر کوئی کام کر سکتا ہے۔

غداری اور دغابازی

غداری اور دغابازی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پا کر اس کے خلاف کیا جائے۔ قرآن پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔ عربی میں اس کو عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں، اسلام نے اس کی شدید برائی کی ہے۔ کفار میں سے جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کر کے بدل جاتے تھے اور بار بار بدعہدی کرتے تھے، ان کے ذکر میں اللہ فرماتا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ۝ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۝ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۝ ﴾ (۸/ الانفال: ۵۶۔۵۸)

''جن سے تو نے معاہدہ کیا، پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ تقویٰ (اللہ کا لحاظ) نہیں رکھتے، سو اگر ان کو تو کبھی لڑائی میں پائے تو ان کو ایسی سزا دے کہ ان کے پچھلے دیکھ کر بھاگیں، شاید وہ عبرت پکڑیں اور اگر تجھ کو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو ان کو تو برابر کا جواب دے، اللہ کو دغا باز خوش نہیں آتے۔''

اس آیت میں گو ان کافروں کا ذکر ہے جو ہر دفعہ عہد کر کے بدعہدی اور دغابازی کرتے تھے، مگر دو باتیں اس میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں، ایک یہ کہ بدعہدی، سراسر تقویٰ کے خلاف ہے، دوسری یہ کہ یہ غداری، دغابازی اور بدعہدی اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے۔ بدر کے قیدیوں کو فدیہ اور وعدہ لے کر چھوڑ دینے کی اجازت جہاں دی گئی ہے، وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر یہ خیانت اور دغا کریں تو اللہ ان سے سمجھ لے گا، پھر ان کو دوبارہ تمہارے قابو میں لے آئے گا، فرمایا:

﴿ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝ ﴾

(۸/ الانفال: ۷۱)

''اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ اس سے پہلے اللہ سے بھی خیانت (دغا) کر چکے ہیں، تو اللہ نے ان پر قابو دے دیا اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔''

اللہ سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے، تو اللہ تو سب کا حال جانتا ہے اور ہر مصلحت اس کو معلوم ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے، اس نے ان کے چھوڑنے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن ہر غدار کا ایک جھنڈا ہوگا۔'' [1] یعنی اس

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب تحريم الغدر: ۴۵۲۹۔

سے اس کی بدعہدی اور غداری کی تشہیر ہوگی۔ آنحضرت ﷺ اپنی فوج کے افسروں کو جو نصیحتیں فرماتے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ ''بدعہدی نہ کرنا۔'' [1] یعنی دشمنوں سے معاہدہ کر کے پھر غداری نہ کی جائے۔ ظالم بادشاہوں، حاکموں، افسروں، سپہ سالاروں کا ایک چلتا ہوا حیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن وامان کا وعدہ کر کے کسی کو اپنے پاس بلاتے ہیں اور جب وہ ان کے قابو میں آ جاتا ہے تو اس کو سزا دے دیتے یا مروا دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس نے کسی کو جان کا امن دیا پھر مروا ڈالا تو میں اس سے الگ ہوں، اگرچہ مقتول کافر ہی کیوں نہ ہو۔'' [2] اللہ فرماتا ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ۬ ﴾ (٥/ المآئدۃ:١)

''اے ایمان والو! اپنی گرہوں (قول وقرار) کو پورا کرو۔''

عقود کی تعمیم میں وہ تمام شرطیں، وعدے اور معاہدے داخل ہیں جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے۔ یہاں تک کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے بھی جو معاہدہ کریں اس کا حرف بحرف پورا کرنا ضروری ہے۔ ایک دفعہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں سے مدت متعینہ کے لیے کوئی معاہدہ کیا۔ اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو امیر موصوف اپنی فوجیں لے کر ان کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہو اور ادھر وہ حملہ کر دیں۔ یہ دیکھ کر عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ نامی ایک صحابی سوار ہو کر نکلے اور چلائے اللہ اکبر! اللہ اکبر! بدعہدی نہیں۔ امیر معاویہ نے بلوا کر پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جب کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اس کی کوئی گرہ نہ باندھی جائے نہ کھولی جائے۔'' (یعنی نہ اس میں سے کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے) اور یا اس کو پہلے سے خبر دے کر معاہدہ کو یک قلم رد کر دیا جائے''۔ یہ سن کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ واپس چلے آئے۔ [3] غور کی بات یہ ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے معاہدہ کے لفظوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی۔ لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا۔ رسول اکرم ﷺ کے تربیت یافتوں نے اس کو بھی بدعہدی سمجھا اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب تامیر الامام الامراء...... ٤٥٢٢۔ [2] سنن ابن ماجه، ابواب الدیات: ٢٦٢٨ وصحیح ابن حبان؛ منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد، ص: ٢٠٢، ٢٠٣۔

[3] سنن ابی داود، کتاب الجهاد، باب فی الامام یکون بینه وبین العدو عهد فیسیر نحوه: ٢٧٥٩۔

بہتان

بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے، یا اس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا برائی منسوب کی جائے۔ یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے۔ بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔

بعض بہتان ایسے ہوتے ہیں جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا لیکن شرارت کی راہ سے کسی بے گناہ کے سر اس لیے تھوپا جاتا ہے کہ اس کی بدنامی ہو۔ قرآن نے اس کا نام افک رکھا ہے۔ یہ دونوں باتیں جھوٹ ہونے کے علاوہ حد درجہ شرافت کے خلاف ہیں اور اسی لیے جو لوگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس بہتان باندھنے میں شریک ہو جاتے ہیں وہ بھی گناہگار اور خیانت کار ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں طعمہ نامی مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے گھر میں چوری کی۔ مسلمانوں کو اس پر شبہ ہوا تو اس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا۔ وہ تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا۔ اس منافق کے گھر والوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس کو بری ٹھہرایا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے موافق فیصلہ کرنا چاہا تو وحی الٰہی نے دفعۃً حقیقت کا پردہ چاک کر دیا۔ [1] دوسری روایت یہ کی جاتی ہے کہ طعمہ کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امانت رکھنے کو دی۔ اس نے خیانت کی اور واقعہ سے انکار کر دیا اور زرہ دوسرے کے گھر میں پھینک دی۔ لوگوں نے اس کو پکڑا۔ آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا۔ آپ ﷺ نے ظاہر حال پر فیصلہ کرنا چاہا۔ اس وقت یہ وحی آئی۔ [2] بہرحال واقعہ جو کچھ ہوا۔ امر مشترک یہ ہے کہ گناہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گناہگار ٹھہرانے کے متعلق یہ آیتیں ہیں:

﴿ إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ۝ وَٱسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ وَلَا تُجَٰدِلْ عَنِ ٱلَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ۝ يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱلنَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ ٱلْقَوْلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١٠٥-١٠٨)

''ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر)! یہ سچی کتاب اتاری ہے کہ تو لوگوں کے درمیان اس کے ذریعہ جو اللہ نے تجھ کو سوجھایا انصاف کر اور خیانت کاروں کی طرف سے نہ جھگڑ اور اللہ سے قصور معاف کرا، بے شک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے اور ان کی طرف سے نہ جھگڑ جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں۔ بے شک اللہ خیانت کار گناہگاروں کو دوست نہیں رکھتا۔ وہ لوگوں سے چھپنا

[1] جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ النساء: ۳۰۳۶۔

[2] تفسیر طبری، سورۃ نساء آیت ﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَابَ﴾ ج ۵، ص: ۱۵۹۔

چاہتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپنا چاہتے اور وہ ان کے ساتھ ہی ہے۔ جب رات کو وہ سازش کرتے ہیں، جو اللہ کو پسند نہیں اور اللہ ان کے کاموں کو گھیرے ہے۔‘‘

آگے چل کر ہے:

﴿ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـــًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١١٢)

’’اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر وہ اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے۔ اس نے طوفان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔‘‘

ان آیتوں میں خیانت کا راز تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے۔ سب سے پہلے تو رسول ﷺ کو انصاف کی تاکید ہے۔ پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کاروں کی حمایت اور ان کی طرف سے کوئی وکالت نہ کرے۔ پھر فرمایا: جو ایسے خائن ہیں وہ بڑے گناہگار ہیں اور اللہ کی محبت سے محروم ہیں۔ یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے انسانوں سے چھپنے کے لیے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے۔ جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے اور ان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے۔ اس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہے۔ اگر یہی یقین کسی کو ہو جائے تو وہ کسی پر تہمت اور بہتان باندھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد یہ سرزنش اس کو سنائی گئی کہ جس نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا، اس نے بہتان باندھا اور گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لادا۔ پہلے عرب میں دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی، وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کر دیتی تھی، یا مجہول بچہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی طرف نسبت دیتی تھی۔ اللہ نے اس کو بہتان کہا اور آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے۔ اس سے یہ بیعت لی جائے کہ وہ آیندہ اس جرم سے باز رہے گی:

﴿ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ ﴾ (٦٠/ الممتحنة:١٢)

’’اور یہ کہ وہ بہتان نہ باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں۔‘‘

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بری بات ہے۔ پھر بن کیے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اس کو دلی تکلیف پہنچانا کتنی بری بات ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾

(٣٣/ الاحزاب:٥٨)

’’اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بن کیے (تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے ہیں۔ انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔‘‘

شریف بیویوں پر بہتان باندھنا چونکہ ان کی عزت پر حرف رکھنا ہے۔ اس لیے دنیا ہی میں اس کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ جو اس بہتان کا مرتکب ہو اور شرعی گواہی پیش نہ کر سکے۔ اس کو کوڑے مارے جائیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا ﴾

(۲۴/ النور:۴۔۵)

''اور جو لوگ شریف بیویوں کو عیب لگاتے ہیں پھر نہ لائے چار گواہ، تو ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی نہ مانو اور وہ فاسق ہیں، مگر جنہوں نے توبہ کی۔''

اس بہتان کی برائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ بہتان باندھنے والا اللہ تعالیٰ کے حضور میں فاسق ٹھہرایا گیا اور اس کی گواہی ہمیشہ کے لیے بے اعتبار ہو گئی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے گا، حالانکہ وہ بے گناہ ہو۔ یعنی اس نے وہ جرم نہیں کیا تھا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا۔''[1] یہ گویا قذف یعنی تہمت بے جا کی مثالی سزا ہوگی۔ ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس میں جو برائی نہیں اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان ہے۔''[2] یعنی اس سے بچنا چاہیے۔

[1] سنن ابوداود، کتاب الادب، باب فی حق المملوك:۵۱۶۵۔
[2] سنن ابوداود، کتاب الادب، باب فی الغیبة:۴۸۷۴۔

چغل خوری

چغل خور کا کام یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھوٹی سچی باتیں بیان کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکائے اور اپنا رسوخ جتائے اور چونکہ ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی ایسی بات دوسرے کو پہنچاتے ہیں، جس سے دوسرے کو پہلے پر غصہ آئے اور اس سے نفرت پیدا ہو، اسی لیے قرآن نے ان لوگوں کے اوصاف میں جن کی بات نہیں ماننی چاہیے یہ لفظ کہے ہیں: ﴿ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ ﴾ (٦٨/ القلم:١١) ''جو چغلی کھاتا پھرتا ہے۔''

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہیں تو اس کی بات ہی نہ مانی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی میں کوئی ایسی حرکت کر لی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو۔ فرمایا:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓاْ أَن تُصِيبُواْ قَوْمًۢا بِجَهَٰلَةٍ فَتُصْبِحُواْ عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَٰدِمِينَ ﴾ (٤٩/ الحجرات:٦)

''اے ایمان والو! اگر کوئی گناہگار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو۔ کہیں کسی قوم پر نادانی سے جا نہ پڑو۔ پھر اپنی کیے پر پچھتانے لگو۔''

اس آیت میں غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبریں پھیلانے والے کو اللہ نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور چونکہ اس بداخلاقی کا مقصد زیادہ تر دو شخصوں، بالخصوص، عزیز و اقارب اور دوست واحباب میں نااتفاقی پیدا کرانا ہوتا ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے برے لوگ کون ہیں؟ پھر خود ہی فرمایا:

((المشاون بالنميمة المفسدون بين الاحبة)) [1]

''جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات خراب کرتے ہیں۔''

صحیحین میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک قبرستان کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ''ان میں سے ایک پر اس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا۔'' [2]

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((الا انبئكم ما العضة هى النميمة القالة بين الناس)) [3]

''کیا میں تم کو بتاؤں کہ غصہ کیا ہے؟ وہ چغل خوری ہے جو لوگوں کے درمیان بیان کی جاتی ہے۔''

لغت میں غصہ کے معنی تفریق اور سحر کے ہیں۔ اس لیے اگر اس حدیث میں تفریق کے معنی لیے جائیں

---

[1] مسند احمد، ج ٦، ص: ٤٥٩ عن اسماء بنت يزيد۔ [2] صحيح بخاري، كتاب الوضوء، باب من الكبائر ان لايستتر من بوله: ٢١٦ وصحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب الدليل على نجاسة البول: ٦٧٧۔

[3] مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم النميمة: ٦٦٣٦۔

تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں علیحدگی کرنا چغل خوری کی حقیقت میں داخل ہے۔ لیکن اگر سحر کے معنی لیے جائیں تو اس صورت میں بھی سحر اور چغل خوری میں مشابہت و مناسبت ہے۔ کیوں کہ سحر سے بھی دو شخصوں بالخصوص میاں بیوی میں علیحدگی کرائی جاتی ہے۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے:

﴿ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۰۲)

''اس پر بھی ان (ہاروت و ماروت) سے ایسی باتیں سیکھتے ہیں، جن کی وجہ سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔''

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہیں، جو لوگ ہاروت و ماروت سے سیکھتے تھے۔ لیکن بعض علما کے نزدیک یہ مقصد چغل خوری سے حاصل کیا جاتا تھا۔ [1]

عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے۔ مثلاً: یہ کہ فلاں شخص تمہاری نسبت یہ کہتا تھا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ ہدایت کی تھی:

((لا يبلغني احد من اصحابي عن احد شيئاً فاني احب ان اخرج اليكم و انا سليم الصدر)) [2]

''میرے اصحاب میں سے کوئی مجھ تک کسی کی بات نہ پہنچائے۔ کیوں کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس آؤں تو میرا دل صاف ہو۔''

لیکن اس قسم کی باتیں عام طور پر دہ ہوتی ہیں، جو معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو خود وہ شخص اس کو معیوب سمجھتا ہے جو دوسرے تک اس کو پہنچاتا ہے۔ بعض حالتوں میں جس شخص تک وہ بات پہنچائی گئی ہے، اس کو ناگوار گزرتی ہے۔ بعض موقعوں پر دوسرے لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی ہے اور جو لوگ اس بداخلاقی میں مبتلا ہوتے ہیں، وہ اس قسم کی ناپسندیدہ باتوں کی ٹوہ میں لگتے رہتے ہیں، تاکہ ان کو پھیلا کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائیں۔ اسی بنا پر اہلِ عرب چغل خوروں کو ہیزم بردار کہتے ہیں۔ یعنی جس طرح لکڑیاں بیچنے والے لکڑیاں چن چن کر لاتے ہیں اور ایندھن کے لیے گھوم گھوم کر بازاروں میں فروخت کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پھیلاتے ہیں اور آتشِ فتنہ و فساد کے لیے ایندھن بہم پہنچاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ابولہب کی بی بی کو بعض مفسرین کی رائے کے مطابق ''حَمَّالَةَ الْحَطَبِ'' یعنی ہیزم بردار کا خطاب اسی لیے دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کی چغلیاں کھاتی پھرتی تھی۔ [3]

ان میں بعض لوگ استراقِ سمع کرتے ہیں۔ یعنی چھپ چھپ کر لوگوں کی باتیں سنتے ہیں اور پھر ان کو

---

[1] تفسیر کبیر، ج۱، ص:۴۴۳ و ما بعد۔ [2] ابوداود، کتاب الادب، باب فی رفع الحدیث:۴۸۶۰۔

[3] تفسیر کبیر، ج۶، ص:۶۷۱۔

دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔اس قسم کے لوگوں کو لغت میں قتات کہتے ہیں اوران کی نسبت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لایَدخل الجنّة قتات)) [1]

''جنت میں چغل خور داخل نہ ہوگا۔''

اس قسم کی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں، تا کہ ان کا اثر بڑھ جائے،اسی لیے عربی زبان میں چغلخوری کو ''وشایه'' کہتے ہیں جس کے معنی نقش ونگار کے ہیں اور ادھر کی اُدھر لگانے کے لیے چغل خوروں کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے۔اسی مناسبت سے چغل خوری کو ''سعایه'' بھی کہتے ہیں جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں۔

یہ کام اگرچہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے،لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہیں ہے۔بلکہ تحریر و کتابت اور رمز واشارات سے چغل خوری کی جاسکتی ہے اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہیں، بلکہ اعمال بھی اس میں داخل ہیں۔یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہیں کہا جاسکتا کہ''فلاں شخص یہ کہتا تھا'' بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ''فلاں شخص یہ کام کرتا تھا۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ''محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا'' چغلی کی مکمل تعریف نہیں ہے۔بلکہ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہوجائے۔

اس بنا پر چغل خوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں کے جو حالات دیکھے یا سنے ان کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے اور رسول اللہ ﷺ نے''ترک مالا یعنی'' کی جو ہدایت مسلمانوں کو کی ہے،اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔

چغل خوری ایک فتنہ پردازی ہے،جس کے نتائج بعض حالتوں میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور قتل وخونریزی تک کی نوبت پہنچتی ہے۔اسی کے ساتھ وہ متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے اور اس میں غیبت، بہتان، تجسس، کذب وفریب، نفاق، غرض مختلف بداخلاقیوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔اس لیے وہ ان نتائج اوران عناصر کے لحاظ سے گناہ کبیرہ ہے۔لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن ومعاشرت کا ایک جزو ہوگئی ہے۔اگر امرا کے درباروں میں تملق وخوشامد کے لیے چغل خوری کی جاتی ہے تو عام صحبتوں میں اس سے تفریحِ خاطر اور لطفِ صحبت کا کام لیا جاتا ہے۔اس لیے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے اور اس کو لوگ گناہِ کبیرہ نہیں سمجھتے۔اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب فی القتات: ٤٨٧١۔

مردوں کی آواز سنی جن پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا تھا۔ فرمایا: ''ان پر عذاب ہو رہا ہے۔ لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ بڑے گناہ کے کام ہیں۔ ان میں ایک تو پیشاب آڑ میں نہیں کرتا تھا اور دوسرا لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرتا تھا''۔ [1]

اس حدیث شریف کی شرح میں محدثین نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہیں۔ پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہِ کبیرہ ہے تو اس کو منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے۔ محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونوں بداخلاقیاں اس قدر عام ہوگئی ہیں کہ ان کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ معمولی چیز نہیں بلکہ کبائر وموبقات میں داخل ہیں۔

قرآن مجید میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔ چنانچہ افک عائشہ رضی اللہ عنہا کے عام چرچے کے متعلق ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴾ (۲۴/ النور: ۱۵)

''جب تم لگے اپنی زبانوں سے اس کی نقل درنقل کرنے اور اپنے منہ سے ایسی باتیں کہنے جس کی تم کو مطلق خبر نہیں اور تم نے اس کو ایسی ہلکی (سی) بات سمجھا، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی (سخت بات) ہے۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہیں، عام دلچسپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کی جاتی ہیں، حالانکہ وہ معمولی نہیں ہوتیں۔ کشفِ عورت اور کشفِ عیوب میں جو مناسبت ہے وہ بھی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بداخلاقی زیادہ تر نہایت دنی الطبع، پست حوصلہ، مبتذل اور ناقابل اعتبار اشخاص میں پائی جاتی ہے۔ بغض وانتقام لینے یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہاں رسوخ حاصل کرنے یا سوسائٹی میں شریک ہونے کے لیے اور کوئی ذریعہ نہیں پاتے تو چغل خوری سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے ان کے شر وفساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان کی بات ناقابلِ اعتبار قرار دی جائے اور ان کا کہنا نہ مانا جائے اور قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے:

﴿ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۙ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ ۙ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۙ ﴾

(۶۸/ القلم: ۱۰-۱۲)

''اور تو ایسے کا کہنا نہ مان جو بہت قسمیں کھاتا ہے۔ آبرو باختہ ہے (لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے۔ چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔ اچھے کاموں سے (لوگوں کو) روکتا رہتا ہے۔ حد سے آگے بڑھ گیا ہے۔ بدکار ہے۔''

[1] بخاري، كتاب الادب، باب النميمة من الكبائر: ۶۰۵۵۔

غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی عزت و آبرو محفوظ رہے۔ اور ان کے باہمی تعلقات خوشگوار رہیں۔ اس بنا پر جن بداخلاقیوں سے مسلمانوں کی عزت و آبرو کو صدمہ پہنچتا ہے اور ان کے تعلقات میں ناگواری پیدا ہوتی ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجموعی طور پر ان کو ایک جگہ بیان کر دیا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

(۴۹/ الحجرات: ۱۱۔۱۲)

''مسلمانو! مرد مردوں پر نہ ہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (اللہ کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں پر ہنسیں، عجب نہیں کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو نام دھرو۔ ایمان لائے پیچھے بدتہذیبی کا نام ہی برا ہے اور جو (ان حرکات سے) باز نہ آئیں تو وہی (اللہ کے نزدیک) ظالم ہیں۔ مسلمانو! (لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو، کیوں کہ بعض شک داخل گناہ ہیں اور ایک دوسرے کی ٹٹول میں نہ رہا کرو اور تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برا نہ کہے۔ بھلا تم میں سے کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، تو تم کو گھن آئے اور اللہ سے تقویٰ کرو۔ بے شک اللہ رجوع ہونے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قول و عمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طریقے سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے، وہ غیبت ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ تعریض، تصریح، رمز و اشارات، تحریر و کتابت اور محاکات و نقالی، ہر طریقہ سے دوسروں کے عیوب بیان کیے جا سکتے ہیں اور ایک شخص کے نسب اخلاق، دین و دنیا، جسم، کپڑے لتے، غرض ہر چیز میں عیب نکالا جا سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت پر زور طریقہ سے اس کی ممانعت کی ہے [1] اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہ دی ہے۔ جس میں بلاغت کے بہت سے نکتے ہیں۔

[1] احیاء علوم الدین، ج ۳، ص: ۱۰۱۔

① انسان کا گوشت محض اس کی عزت وحرمت کی وجہ سے حرام ہے۔اس لیے جو چیز اس کی عزت وحرمت کو نقصان پہنچاتی ہے، وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے۔

② لڑائی جھگڑے میں جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدت غضب میں اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہیں۔اگر چہ یہ بھی ایک برا فعل ہے، تاہم اس میں ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے۔لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مرجانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص رو در روکسی کو برا کہے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے، تاہم اس میں بزدلی نہیں پائی جاتی۔لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا نہایت بزدلانہ کام ہے اور بعینہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے۔

③ لوگ شدتِ محبت سے بھائی کی مردہ لاش کا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔اس لیے جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے، اس سے اس کی سخت قساوت وسنگدلی اور بغض وعداوت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اس لطف ومحبت کے منافی ہے، جس کو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

④ مردار گوشت کا کھانا سخت اضطرار کی حالت میں جائز ہے اور اس وقت بھی اگر کسی کو انسان کی بجائے بکری کا مردار گوشت مل جائے تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند نہ کرے گا۔اس لیے غیبت اس وقت تک جائز نہیں ہوسکتی، جب تک کوئی شرعی، معاشرتی، اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کرے اور اس حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہو، علانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہیے اور صرف رمز واشارہ سے کام لینا چاہیے۔اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے متعدد حدیثوں میں نہایت بلیغ طریقہ پر غیبت کی برائی بیان کی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''شبِ معراج میں میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا، جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ ان سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔میں نے جبرائیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ بولے، یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزت وآبرو لوٹ لیتے تھے۔'' [1] اعمال اور اعمال کی جزاوسزا میں مناسبت ہوتی ہے۔یہ لوگ چونکہ لوگوں کا گوشت نوچ کھاتے تھے۔یعنی ان کی غیبت کرتے تھے، اس لیے عالم برزخ میں ان کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ خود اپنا گوشت نوچتے رہیں۔

ایک بار سخت بدبو پھیلی تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہا کہ ''جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں۔'' [2] اس حدیث میں بھی اعمال اور جزاوسزا کی مناسبت ظاہر ہے۔مردار گوشت اکثر بدبودار ہوتا ہے اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے۔اس لیے یہ بدبو اسی مردارخوری کا نتیجہ تھی۔اس حدیث میں ایک نکتہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے عیوب

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب فی الغیبۃ: ٤٨٧٨۔ [2] ادب المفرد، باب أخطار الغیبۃ: ٧٣٢، ٧٣٣۔

کی تشہیر و تفضیح کی جائے۔ اس لیے جس طرح غیبت کرنے والے لوگوں کے عیوب کو عام طور پر پھیلاتے ہیں، اسی طرح ان کے اس عمل کی نجاست و گندگی کی بو بھی دنیا میں پھیل کر لوگوں کو ان سے متنفر کرتی ہے۔ اسی نکتہ کو آپ ﷺ نے دوسری حدیث میں بلا تشبیہ و تمثیل کے نہایت واضح طور پر بیان کیا اور فرمایا: ''اے وہ لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے ہو، لیکن ایمان تمہارے دلوں کے اندر جاگزیں نہیں ہوا ہے۔ نہ مسلمانوں کی غیبت کرو نہ ان کے عیوب کی تلاش میں رہو، کیوں کہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش میں رہے گا، اللہ تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کرے گا اور اللہ جس کے عیب کی تلاش کرے گا خود اس کے گھر ہی کے اندر اس کو رسوا کر دے گا۔'' ❶

لغت کی رو سے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کے بیان کو کہتے ہیں۔ مگر مذہبی تعلیم میں شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لیے کوئی ضروری قید نہیں۔ اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی برائیاں ظاہر کی جائیں تو یہ غیبت نہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد سے ان دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے۔'' کہا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جس کو میں بیان کرتا ہوں؟ تو فرمایا: ''اگر وہ عیب اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔'' ❷

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جز نہیں۔ بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہوگی۔ لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہلِ لغت کے نزدیک غیبت صرف اس بدگوئی کا نام ہے، جو کسی کے پیٹھ پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی میں کی جائے۔ باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب کا بیان کرنا تو یہ غیبت نہیں ہے۔ بلکہ سب و شتم میں داخل ہے۔ اس طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ کے ذریعے بھی غیبت کی جاسکتی ہے۔ کسی شخص کی نقل کرنا مثلاً: ایک شخص لنگڑا ہے تو اس کے اس عیب کے نمایاں کرنے کے لیے لنگڑا کر چلنا بھی غیبت ہے۔ ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ ❸ اس طرح چشم و ابرو کے اشارے سے کسی کے عیب کی پردہ دری کرنا بھی غیبت ہے اور قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں غیبت کے ان ہی مخفی طریقوں کی برائی بیان کی ہے۔

﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ﴾ (٦٨/ القلم:١١)

---

❶ ابوداود، کتاب الادب، باب فی الغیبة:٤٨٨٠۔

❷ ابوداود، کتاب الادب، باب فی الغیبة ٤٨٧٤۔

❸ ابوداود، کتاب الادب، باب فی الغیبة:٤٨٧٥۔

''(لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے (اِدھر کی اُدھر اُدھر کی اِدھر) چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔''

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝﴾ (٤/ الهمزة١:١)

''ہر شخص جو (لوگوں کی) عیب چینی کرتا (اور ان پر) آوازے کستا ہے، اس کی (بھی بڑی) تباہی ہے۔''

ان آیتوں میں غیبت کے جن مخفی اور دلخراش طریقوں کی مذمت کی گئی ہے، ان کی توضیح ترجمہ سے نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کے لیے اہل لغت کی تصریحات پیش نظر رکھنی چاہئیں جو حسب ذیل ہیں:

① هُمز، سامنے اور لُمز، پیٹھ پیچھے برائی کرنا۔

② هُمز، خاص طور پر لوگوں کے نسب کی برائی بیان کرنا۔

③ هُمز، ہاتھ کے اشارے سے اور لُمز، زبان سے غیبت کرنا۔

④ هُمز، زبان سے اور لُمز، آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا۔

⑤ هُمز، برے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرنا۔

⑥ لُمز، آنکھ۔ ہاتھ۔ سر اور ابرو کے اشارے سے ہم نشینوں کی برائی بیان کرنا۔

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ غیبت کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

کسی کی برائی بیان نہ کرنا اخلاقاً بڑی اچھی چیز ہے۔ لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی واقعی برائی بیان کی جائے، تاکہ ان کو تنبیہ اور ندامت و شرمندگی ہو، اگر بروں کی برائی بیان کرنے کو یک قلم بند کردیا جائے تو ان کی برائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہوسکے گی۔ اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ قرآن پاک میں کافروں، مشرکوں اور منافقوں کی علانیہ برائیاں کی گئی ہیں، مگر کہیں کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ہمیشہ عموم کے ساتھ پردہ میں یا صیغۂ مجہول کے ساتھ یا وصف کے ساتھ یوں کہا گیا ہے کہ جو جھوٹ بولتے ہیں یا کفر کرتے ہیں، ان کا حال یہ ہے۔ اس طریقہ تعبیر میں یہ فائدہ ہے کہ بروں کی برائی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کو ناگواری کا حق بھی نہیں پہنچتا اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لیے گئے ہیں، وہ اس لیے کہ ان کی یہ برائیاں عالم آشکارا تھیں۔

لیکن معاملات میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں، جہاں تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے، قرآن پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے ان موقعوں کی تعیین بھی معلوم ہوتی ہے، قرآن پاک کا چھٹا پارا اس آیت سے شروع ہوتا ہے:

﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِـيْمًا ۝﴾

(٤/ النسآء:١٤٨)

''اللہ کو بدگوئی پسند نہیں آتی لیکن جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔''

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی کسی کی برائی کو پکار کر کہتا پھرے، لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگوں سے بیان کرے اور ظالم کے ظالمانہ کاموں کو آشکارا کرے، اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے، ظالم کو اس کے برے اعمال کی سزا دے گا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں باریابی کی اجازت طلب کی، آپ ﷺ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ ''یہ اپنے خاندان میں کس قدر برا شخص ہے۔'' لیکن جب وہ پاس آیا تو اس سے نہایت لطف وکرم کے ساتھ گفتگو کی۔ [1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کے شر وفساد سے لوگوں کو آگاہ کرنے اور بچانے کے لیے اس کے احوال واقعی کا اظہار جائز ہے، غرض جس اظہار میں دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو، یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدنی مقصد حاصل نہ ہوسکتا ہو، اس کو یا تو غیبت ہی نہیں کہہ سکتے یا کہہ سکتے ہیں تو شریعت اس کو جائز رکھتی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں ان مقاصد کو چھ صورتوں میں محدود کر دیا ہے۔

① حاکم کے مظالم کی بارگاہِ سلطانی میں فریاد کرنا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ((لصاحب الحق مقالا)) [2]

② مذہبی اور اخلاقی برائیوں کا انسداد کرنا یعنی بغرضِ احتساب، (چنانچہ اسی بنا پر کفار اور منافقوں کی برائیاں قرآن نے طشت از بام کی ہیں)

③ فتویٰ طلب کرنا، اسی بنا پر حضرت ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بخل کی شکایت کی، (اور آپ ﷺ نے سن کر اس کا مناسب جواب دیا) [3]

④ ایک شخص کے شر وفساد سے لوگوں کا بچانا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسی غرض سے ایک شخص کو ((بئس ابن العشیرہ)) (قبیلہ کا برا آدمی) کہا تھا۔ [4]

⑤ ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گو اس کا عیب ظاہر ہو، مگر غایت شہرت کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑ نہ ہو، مثلاً: اعمش یا اعرج، کیونکہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار پا گیا ہے اور یہ اس کو ناگوار بھی نہیں ہوتا، رسول اللہ ﷺ نے خود ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو ذوالیدین (دو ہاتھوں والے) کے لقب سے پکارا تھا۔ [5]

⑥ علانیہ فسق وفجور کرنے والے کی برائی بیان کرنا (تاکہ اس کو تنبیہ اور دوسروں کو عبرت ہو) مثلاً: مخنث کو مخنث کہنا۔ [6]

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب مایجوز من اغتیاب اهل الفساد والریب: ٦٠٥٤۔ [2] بخاری، کتاب الاستقراض، استقراض الابل: ٢٣٩٠۔ [3] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ذکر هند بنت عتبه: ٣٨٢٥۔ [4] ابو داود، کتاب الادب، باب فی حسن العشرة: ٤٧٩١۔ [5] بخاری، کتاب الصلاة، باب تشبیك الاصابع فی...... ٤٨٢۔ [6] احیاء العلوم الدین، ج٣، ص:١٠٦۔

دورخاپن

اگر دو شخصوں میں اختلاف ہو تو ایک شخص خلوص و صداقت کے ساتھ دونوں سے تعلقات رکھ سکتا ہے، لیکن اس قسم کے تعلقات میں دورخاپن نہیں پایا جانا چاہیے، یعنی دونوں کا دوست بن کر ایک کی بات دوسرے تک پہنچا کر دونوں کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہیے۔ بلکہ یہ بداخلاقی چغل خوری سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ چغل خور صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دورخاپن آدمی دونوں کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے۔

دورخے پن کے لیے صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے اور اس کے پاس سے نکلے تو اس کی ہجو کرنے لگے تو بھی وہ دورخا کہلائے گا، نفاق میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو بھی نفاق سمجھتے تھے۔ ایک بار حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ ”ہم لوگ امرا اور حکام کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور جب ان کے یہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں“۔ بولے ”ہم لوگ عہدِ رسالت میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے“۔ [1] اور قرآن مجید میں بھی نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے:

﴿ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ۝ ﴾ (٢/ البقرة: ١٤)

”اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے تو کہتے ہیں ہم (بھی تو) ایمان لا چکے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مسلمانوں کو بناتے ہیں۔“

معاشرتی اور دنیوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاقی منافقوں کو اردو میں دورخا اور عربی میں ذوالوجہین کہتے ہیں اور احادیث میں اس قسم کے لوگوں کے لیے وعید شدید آئی ہے، مثلاً: فرمایا: ”قیامت کے دن اللہ کے نزدیک تم سب سے برا دورخے کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور“۔ [2]

ایک اور حدیث میں فرمایا: ”دنیا میں جس کے دورخ ہوں گے قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔“ [3] یہ گویا اس کی اس عادت ذمیمہ کی تمثیل ہوگی کہ وہ لوگوں سے دورنگ کی باتیں کیا کرتا تھا۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب مایکرہ من ثناء السلطان: ٧١٧٨۔

[2] بخاری، کتاب الادب، باب ماقیل فی ذی الوجهین: ٦٠٥٨ وصحیح مسلم، کتاب البر والصلة: ٦٦٣٠ تا ٦٦٣٢ ومالك كتاب الكلام: ١٨٦٤۔

[3] ابوداود، کتاب الادب، باب فی ذی الوجهین: ٤٨٧٣۔

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کام میں بد نیتی ہی بد نیتی معلوم ہوتی ہے اور کسی کے کام میں اس کو حسن نیت نظر نہیں آتا۔ دوسرے کی طرف ان ہوئی باتیں منسوب کرنے لگتا ہے۔ دوسرے کو بھی اس کا خیال ہوتا ہے اور وہ بھی اس سے کترانے لگتا ہے۔ اس سے آپس میں نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ ﴾

(۴۹/ الحجرات:۱۲)

''اے ایمان والو! بہت بدگمانی سے بچا کرو، بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بغض و حسد اور دوسرے کے معاملات کے تجسس وتلاش کی ممانعت فرمائی، کیونکہ وہ بدگمانی کے اسباب یا لازمی نتیجے ہیں، فرمایا: ''تم بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، تم دوسروں کے ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوس کرو اور نہ آپس میں حسد اور نہ بغض رکھو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے کہ آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ''۔ [1] یہ بھی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی ایسا کام کر رہا ہو، یا کسی ایسی حالت میں ہو، جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے، تاکہ دوسرا فتنہ میں نہ پڑے۔ اس کی مثال خود آنحضرت ﷺ نے پیش فرمائی ہے۔ ایک دفعہ آپ ﷺ اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات کو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے کوئی آپ سے ملنے آئیں آپ ان کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں دو انصاری آپڑے، وہ آپ کو کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھے اور واپس پھرنے لگے، آپ ﷺ نے فوراً آواز دی اور فرمایا: ''یہ میری بیوی فلاں ہیں۔'' انھوں نے عرض کی، یا رسول اللہ! اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپ ﷺ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا: ''شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے۔'' [2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قوله: ﴿یاایها الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن﴾: ۶۰۶۶ ومسلم: ۶۵۳۶ وابوداود: ۴۹۱۷ وترمذی: ۱۹۸۸ ومالك، کتاب حسن الخلق، باب ما جآء فی المهاجرة: ۱۶۸۳۔

[2] صحیح مسلم، کتاب السلام، باب انه یستحب لمن رؤی خالیا بامرأة...... ۵۶۷۸۔

مدّاحی اور خوشامد

مداحی اور خوشامد، اخلاق کی پستی، دنائت اور ذلت کی علامت ہے اور ساتھ ہی جھوٹ کی بھی ایک صورت ہے اور یہ اس کے لیے بھی تباہی کا سامان ہے جس کی مداحی اور خوشامد کی جاتی ہے۔ خوشامد اور مداحی کرنے والا تین گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفیں کرتا ہے جو واقع کے مطابق نہیں ہوتیں، یہ جھوٹ ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ منہ سے جو تعریفیں کرتا ہے اس کو اپنے دل میں خود درست نہیں سمجھتا، یہ نفاق ہے۔ تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدوں کے لیے اربابِ قدر و جاہ کی خوشامدانہ تعریف کر کے ان کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنے کو ذلیل و رسوا کرتا ہے، جس سے اس کی دنائت اور ذلت ظاہر ہوتی ہے۔ بے جا تعریفوں سے ممدوح میں بھی دو برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ایک غرور اور دوسری اپنی نسبت غلط فہمی تعریفیں سن کر وہ خوش ہوتا ہے اور پھر اپنے اس مفروضہ کمال یا مبالغہ آمیز بیان پر مغرور ہو کر دوسرے کو آنکھ نہیں لگاتا ہے اور پے در پے تعریفیں سن کر اس کو یقین آ جاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے اور توقع رکھتا ہے کہ ہر شخص اس کو ایسا ہی سمجھے۔ بادشاہوں، امیروں، دولت مندوں اور بڑے لوگوں میں اس کے بدولت جو مضحکہ انگیز برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جس طرح وہ برخود غلط ہو جاتے ہیں، اس کی نظیر تاریخ کے ہر دور میں مل سکتی ہے۔

قرآن پاک میں یہودیوں اور منافقوں کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے۔ اور ان کے انجام کی یہ خبر ان کو دی ہے:

﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴾ (۳/ آل عمران :۱۸۸)

''اور جو اپنے کارناموں پر اتراتے ہیں اور جو انہوں نے نہیں کیا اس پر تعریف کیے جانے کو پسند کرتے ہیں، تو ان کو نہ سمجھنا، پھر نہ سمجھنا کہ وہ سزا سے بچ جائیں گے اور ان کے لیے درد ناک سزا ہے۔''

ان آیتوں کا شانِ نزول گو خاص ہے، مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام ہے۔ [1] اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کیے ہوئے کاموں پر اترانا اور بن کیے کاموں پر اپنی تعریف چاہنا اتنی بری بات ہے کہ بن توبہ کے اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے، مگر یہ کہ مغفرت الٰہی دستگیری فرمائے اور قرآن پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہیں، ان کے کرنے پر اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گناہگار ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو ایسی مداحی اور خوشامد کا ننگ گوارا کرتے ہیں، اس گناہ میں کسی نہ کسی درجہ میں شریک ہیں۔ جس کی تفصیل بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ آمیز تعریف

[1] فتح القدیر شوکانی، ج ۱، ص: ۳۷٤۔

کرتے ہوئے سنا تو فرمایا: ''تم نے اس کو برباد کر دیا۔'' ❶ ایک اور موقع پر ایک صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی تو فرمایا: ''تم نے اپنے ساتھی کی گردن ماردی، اگر تم کو کسی کی تعریف ہی کرنی ہو تو یوں کہو کہ میں یہ گمان کرتا ہوں بشرطیکہ اس کے علم میں وہ واقعی ایسا ہو اور قطعیت کے ساتھ غیب پر حکم نہ لگایا جائے۔'' ❷

مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی تو وہ اس کو سن کر مغرور ہو جائے گا، اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا، اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لیے بھی حکم نہیں لگانا چاہیے کہ کسی کو دوسرے کا اندرونی حال اور غیب کی خبر نہیں معلوم۔ ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفیں جو لوگوں کے منہ پر کی جاتی ہیں، ان کو سن کر ان کے نفس موٹے ہو جاتے ہیں اور ان کی اپنے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھوں کی روشنی زائل ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے منہ پر ان کی تعریفیں کیں، تو حضرت مقداد رضی اللہ عنہ صحابی نے اس کے منہ میں خاک جھونک دی اور فرمایا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''مداحی کرنے والوں سے ملو تو ان کے منہ میں خاک جھونک دو۔'' ❸ ادب المفرد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے، آپ نے کسی سے پوچھا کہ ''یہ کون ہے؟'' تو اس نے اس کی بڑی تعریفیں شروع کیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو سنا کر مت کہو کہ اس کو برباد ہی کر دو۔'' ❹

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما یکره من التمادح: ٦٠٦٠۔

❷ صحیح بخاری، ایضًا: ٦٠٦١ ومسلم: ٧٥٠١ وابوداود: ٤٨٠٥۔

❸ صحیح مسلم، کتاب الزهد، باب النهی عن المدح: ٧٥٠٥ وابوداود، باب فی کراهية التمادح: ٤٨٠٤۔

❹ باب یحثی فی وجوه المداحین: ٣٤١؛ مسند أحمد، ج ٤، ص: ٣٣٨۔

بخل

بخل بھی اساسی بداخلاقیوں میں سے ہے، یعنی ایسی بد اخلاقی جو بہت سی بداخلاقیوں کی جڑ ہے۔ خیانت، بددیانتی، بے مروتی بعض دفعہ بے رحمی، بدسلوکی اور دنائت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ حرص، طمع، لالچ، تنگ نظری، کم ہمتی، پست طبعی اور بہت سی برائیاں اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اس نے کلہاڑی ماری اور بھوکوں کو کھلانا، ننگوں کو پہنانا محتاجوں کو دینا، یتیموں کی خبر گیری اور مقروضوں کی امداد مسلمانوں کا ضروری فرض قرار دیا، ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ اور اس کے مصارف ہیں، جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جبریل علیہ السلام کی آمد کا حال سنایا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو آپ کی نبوت کا یقین جن دلیلوں کی بنا پر دلایا وہ یہ ہیں:

''یارسول اللہ ﷺ! آپ قرابت والوں کا حق اور مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کو سرمایہ دیتے ہیں، مہمانوں کو کھلاتے ہیں اور حق کے مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔'' [1]

غور کیجئے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتوں کے اندر جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ نبی ''بخیل'' نہیں ہوتا، ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کی خصوصیات قرار نہ پاتے۔ بخالت ان بیماریوں میں سے ہے جو درحقیقت اعمال کی جزا و سزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں، کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہیں رکھتا، وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہوسکتا۔ سورۂ مدثر آغاز نبوت کی سورتوں میں سے ہے، اس میں دوزخیوں کے سوال و جواب کا ایک مکالمہ ہے، ان سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ڈالے گئے ہو؟ تو کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، مخالفوں کے ساتھ مل کر ہم دینِ حق پر اعتراض کیا کرتے تھے اور یہ سب اس لیے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزا وسزا کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے:

﴿ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ ﴾ (۷۴/ المدثر:۴۲۔۴۶)

''تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی، کہیں گے ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھلاتے نہ تھے اور بحث کرنے والوں کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے اور روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے۔''

اس سے ظاہر ہوگا کہ بخل کی برائی دوزخ پہنچا کر رہتی ہے اور وہ عمل کی جزا و سزا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ جیسا کہ کہا گیا جو مذہبی جزا و سزا کا قائل نہیں، وہ اخلاص سے دوسروں کے ساتھ فیاضی بھی نہیں

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف بدء الوحی:۳۔

کر سکتا، یہی نکتہ سورۂ ماعون میں جو مکہ کی پرانی سورتوں میں سے ہے دہرایا گیا ہے، فرمایا:

﴿ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ ﴾ (۱۰۷/ الماعون:۱۔۳)

''کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کے دن کو جھٹلاتا ہے، پس یہی وہ ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور فقیر کو کھانے پر آمادہ نہیں کرتا ہے۔''

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کیے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہیں، کیونکہ یہ فیاضی اس اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر نہیں ہو سکتی، جو قبولیت کی سب سے پہلی شرط ہے، بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اس دنیا میں پانے کا متوقع رہتا ہے اور جہاں کہیں اس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتی، وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں یہ یقین نہیں کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا اللہ کے پاس ہے اور وہ کبھی ضائع نہیں ہو سکتی۔

اور ایک مکی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کا تذکرہ کیا جس کی روزی زیادہ نہیں ہے، اس لیے اس کو اپنے اللہ سے گلہ رہتا ہے کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے، اللہ فرماتا ہے:

﴿ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ ﴾ (۸۹/ الفجر:۱۷۔۲۰)

''یہ خیال صحیح نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ تم بن باپ کے بچہ کی توقیر نہیں کرتے اور فقیر کے کھانے پر ایک دوسرے کو رغبت نہیں دلاتے اور مردہ کے متروکہ مال کو کھا جاتے ہو اور مال و دولت سے بڑی محبت رکھتے ہو۔''

ان آیتوں میں باتیں کئی بیان کی گئی ہیں، مگر یہ سب کی حب بخل کی مختلف صورتوں کی تشریح ہیں، سورۂ ہمزہ میں اس بخیل کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو دولت کی تھیلیوں کو اپنی حیاتِ جاوید کی اکسیر جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان کی بدولت وہ ہمیشہ کی زندگی پائے گا اور یہ چیز اس سے کبھی علیحدہ نہ ہوگی، حالانکہ یہ کتنا خیالِ خام ہے فرمایا:

﴿ اِلَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ ﴾

(۱۰۴/ الهمزه:۲۔۴)

''جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گن گن کر رکھا اس کو، سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا، ہرگز یوں نہیں، وہ بالضرور دوزخ میں ڈالا جائے گا۔''

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت کر رکھنے اور کارِ خیر میں خرچ نہ کرنے والے کو اس دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے، جو کھال تک کھینچ لے:

﴿ كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ ۝ تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ۝ وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ ۝ ﴾

(۷۰/ المعارج:۱۵۔۱۸)

''ہرگز نہیں وہ تپتی آگ ہے، کھال کھینچ لینے والی، پکارے گی اس کو جس نے (حق سے) پیٹھ دی اور پھر گیا اور اکٹھا کیا اور سینتا۔''

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہیں، بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ سونے چاندی کی اینٹیں خود بخود روٹی، کپڑا اور مکان کی چہار دیواری نہیں بن سکتیں، اس لیے ان کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان کو ضروری اور اعلیٰ مقصودوں کے حصول میں خرچ کرنا ہی ان کا صحیح مصرف ہے اور یہی اعلیٰ مقصود ہیں جن کو اللہ نے اپنی راہ کہا ہے، جو اس راہ میں خرچ نہیں کرتا، وہ اپنے لیے درہم و دینار نہیں جمع کرتا، اپنے سینہ اور پیشانی کے داغ کا سامان اکٹھا کرتا ہے، فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۳۴۔۳۵)

''اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو درد ناک سزا کی خوش خبری سنا دے، جس دن اس کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیاں، کروٹیں اور پیٹھیں داغی جائیں گی، (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے لیے گاڑ رکھا تھا، تو جس کو گاڑ کر رکھا کرتے تھے، اس کا مزہ چکھو۔''

یہ بخیل اس حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہیں جماعت کی دولت ہے، اس کو چلتا پھرتا رہنا چاہیے، اس کو ایک جگہ روک کر رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے خلاف اور اس جماعت کے لیے مضر ہے، جس کے رکن وہ خود ہیں:

﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۸۰)

''اور جو لوگ اس مال کو جو اللہ نے اپنے مہربانی سے ان کو دیا ہے، روکے رکھتے ہیں، وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں، بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہے، جس مال کا وہ بخل کرتے ہیں، اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں قیامت کے دن پہنایا جائے گا۔''

یعنی جس دولت کو انھوں نے بخالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا ہے، وہ قیامت کے عالمِ مثال واقعی ان کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا، حدیث میں ہے کہ ''یہ مال زہریلے سانپ کی صورت میں

گلے میں پڑا ہوا نظر آئے گا۔'' 1

جو بخیل ہوتا ہے، اس کو خلق اللہ اور اللہ کے کاموں سے قطعاً محبت نہیں ہوتی، اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہیں گے:

﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ﴾

(۵۷/ الحدید:۲۳۔۲۴)

''اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز سے محبت نہیں کرتا، جو آپ بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔''

اور جس سے اللہ محبت نہ کرے اس سے کون محبت کر سکتا ہے، اسی لیے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال بچے اور عزیز واقربا بھی محبت نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کو جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے، اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ ان کو اپنے مال و دولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سوا دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے بندوں کی نگاہوں میں بھی ذلیل وخوار ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں بخل کی سب سے بڑی مثال کا نام قارون بتایا گیا ہے، جس کا ذکر سورۂ قصص میں ہے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان ہی کی قوم کا ایک آدمی تھا، اتنا مالدار تھا کہ (تمدن کے اس ابتدائی دور میں جب ایک تالے کی ایک ہی کنجی بنتی تھی اور وہ بھی اللہ جانے کتنی بھاری اور بھدی ہوتی ہوگی) خزانے تو الگ رہے خزانوں کی کنجیوں کے گچھوں کو کئی آدمی مل کر بھی مشکل سے اٹھا سکتے تھے، تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا، کہ اس نے اپنے فضل وکرم سے اس کو اتنا مالدار بنایا، کہتا کہ یہ مال و دولت تو میری محنت اور میرے ہنر کا نتیجہ ہے، اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا میں اس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے دولت مند گزر چکے ہیں، جن کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے، چنانچہ اس قارون اور اس کی دولت کا بھی یہ انجام ہوا کہ وہ زمین میں دھنس کر رہ گئی، اللہ نے فرمایا:

﴿ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ﴾

(۲۸/ القصص:۷۸)

''کیا وہ نہ جانا کہ اللہ اس سے پہلے قوموں میں سے اس سے زیادہ طاقتور اور اس سے زیادہ دولت مند کو تباہ کر چکا ہے۔''

زمانہ محمدی ﷺ کے قارون ابولہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی اور صاف کہہ دیا گیا:

---

1 صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب اثم مانع الزکوٰۃ:۱۴۰۳۔

﴿ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ ﴾ (۱۱۱/ اللھب:۲)

''ابولہب کو اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔''

نفس کسی شخص یا کسی قوم کے چند افراد کے پاس دولت کا ہونا اس شخص یا قوم کی بھلائی کا سبب نہیں ہو سکتا، جب تک وہ دولت جماعت یا جماعت کے افراد کی ضرورتوں میں خرچ نہ کی جائے، بخیل آدمی چاہتا ہے کہ یہ کل کی کل تنہا اسی کی ضرورت میں کام آئے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کا اتنا حصہ بے کار ہو جاتا ہے اور اس کا ضرر پوری جماعت کو پہنچتا ہے، جس کا وہ بھی ایک فرد ہے۔

﴿ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ ﴾ (۴۷/ محمد:۳۸)

''ہاں! تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلایا جا رہا ہے، تو تم میں کوئی بخل کرتا ہے اور جو کوئی بخل کرتا ہے سو اپنے ہی سے بخل کرتا ہے اور اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔''

یعنی اس کے بخل کے برے نتیجے اسی کو بھگتنے پڑیں گے۔ بخیل آدمی دنیا میں بھی طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں میں گرفتار رہتا ہے کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اس کو نہ اچھا کھانا میسر آتا ہے، نہ اچھا پہننا، نہ قرینہ کا گھر، نہ عزت، نہ آبرو، ہر شخص اس کو ذلیل وخوار جانتا ہے، ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے، فقرا اس کے لیے بددعا کرتے ہیں، یہاں تک کہ بیوی بچے جن کے لیے وہ سب کچھ کرتا ہے، وہ بھی اس سے خوش نہیں رہتے، ہر ایک اس کی دولت کا خواہاں رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ سانپ راستہ سے ہٹ جائے تو اس پر قبضہ کر لے چور اس کے درپے، ڈاکو اس کے لاگو، زہر وہ پاتا ہے، حملے اس پر ہوتے ہیں، مگر ان تمام مصیبتوں کو وہ سہتا ہے اور اپنی زندگی بھر اس میں سے کچھ خرچ نہیں ہونے دیتا، لیکن ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر اس کے وارثوں نے اللے تللے سے اس کو اڑا دیا، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لیے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے، وہ اس مالِ مفت کو دم کے دم میں اڑا دیتی ہے اور ہزاروں بری عادتوں میں مبتلا اور آخر میں مفلس وقلاش ہو جاتی ہے۔ اللہ اپنے رسول ﷺ کی زبانی فرماتا ہے:

﴿ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۝ ﴾ (۹۲/ اللیل:۸۔۱۱)

''اور لیکن جس نے دینے سے بخل کیا اور (اللہ کی یا نیکی کی باتوں کی) پروانہ کی اور اچھی بات کو جھٹلایا، تو ہم اس کو سخت کام کے لیے آسان بنائیں گے اور جب وہ گرے گا تو اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا۔''

وہ سخت کام جس کو اللہ اس کے لیے بطور سزا کے آسان کر دیتا ہے، وہ بری عادت وخصلت اور برے

کردار ہیں جن میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے اور ان کو صرف اس لیے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے، بڑی آسانی سے کر گزرتا ہے۔ بھوکا وہ رہتا ہے، ننگا وہ رہتا ہے، میلا وہ رہتا ہے، مصیبتیں وہ جھیلتا ہے، راتوں کو آرام سے سو نہیں سکتا، دنیا کی کسی چیز سے دل بھر کر لطف نہیں اٹھا سکتا، عزیز و اقارب دوست و احباب سے اس کی مسرت نہیں ہوتی، وہ سب سے نالاں اور اس سے سب نالاں رہتے ہیں، پھر جب وہ کسی افتاد یا مصیبت یا دوزخ کے گڑھے میں گرتا ہے یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محبوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے نہ آئے گی، اس وقت افسوس آئے گا، تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی ہشیار کر دیتا ہے:

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝﴾ (٦٣/ المنافقون: ١٠)

''اور ہم نے تم کو جو روزی دی ہے، اس میں سے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، (ایسا نہ ہو کہ موت آنے لگے) تو کہے کہ میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی دیر اور کہیں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات کرتا اور نیکوکاروں میں سے ہو جاتا۔''

اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، یہ وقت ٹالے ٹل نہیں سکتا، اس کے لیے سامان پہلے سے چاہیے تھا۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ غریب ہوتے ہیں تو بڑی بڑی دعائیں کرتے ہیں، خوب خوب وعدے کرتے ہیں کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے دولت دی تو ہم یہ کریں گے، وہ کریں گے، مگر جب اللہ تعالیٰ ان کو دولت دے دیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتے ہیں اور نیکی کے ہر راستہ سے منہ موڑ لیتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان لفظوں میں کھینچا ہے:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝﴾ (٩/ التوبة: ٧٥-٧٦)

''اور ان میں کوئی ایسا ہے جس نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اللہ نے ہم کو اپنے فضل سے دیا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور نیکوکاروں میں سے ہوں گے، پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخالت کرنے لگے اور ٹل کر پھر گئے۔''

اللہ فرماتا ہے کہ اس بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں نفاق نے گھر کر لیا:

﴿ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (٩/ التوبة: ٧٧)

''تو اللہ نے ان کے دلوں میں اس کا نتیجہ نفاق رکھا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کر دیتی ہے، شاید اسی لیے آنحضرت ﷺ نے

فرمایا کہ ''دو خصلتیں سچے مومنوں میں جمع نہیں ہوتیں، بخل اور بد خلقی۔'' ❶ رسول اللہ ﷺ جن برائیوں سے بچنے کی اللہ سے دعائیں مانگا کرتے تھے، ان میں سے ایک بخل بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ ''خداوندا! میں بخل، کسلمندی، کبرسنی، قبر کے عذاب اور زندگی اور موت کی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔'' ❷

اسلام میں زکوٰۃ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ زکوٰۃ کی فرضیت اور صدقات ومبرّات کی ترغیبات شریعت محمدی ﷺ میں اسی لیے ہیں کہ انسانوں کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک وصاف رہیں۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال ودولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اللہ نے اپنے فضل سے جس کو جو کچھ دیا ہے، مثلاً کسی کو علم دیا ہے، کسی کو عقل دی ہے، کسی کو جسمانی قوت دی ہے، تو جو لوگ اللہ کی ان بخششوں کا حق ادا نہیں کرتے، وہ بھی ایک قسم کے بخیل ہیں اور وہ بھی اپنے درجہ کی سزاؤں کے مستحق ہیں، جس کو علم ملا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے علم کو پھیلائے اور دوسروں کو بتائے، جو ایسا نہیں کرتا وہ علم کا بخیل ہے، اسی لیے علم کا چھپانا اور جان کر نہ بتانا گناہ ہے:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۰)

''اور کون اس شخص سے زیادہ ظالم ہوگا جو اللہ کی شہادت کو جو اس کے پاس ہے چھپائے۔''

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا اور اس کو پھیلایا۔'' ❸ اس لیے لامحالہ جس نے علم رکھ کر علم کے فرض کو انجام نہیں دیا، اس کا شمار بخیلوں میں ہوگا۔

یہ کئی دفعہ کہا گیا ہے کہ ایمان کے بعد اسلام نے اعمال کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے، اللہ کے حق اور بندے کے حقوق کا اجمالی مجموعہ نماز اور بندوں کے حقوق کے مجمل مجموعہ زکوٰۃ یعنی مستحق لوگوں کے ساتھ بخشش ہے، دیکھیے کہ ذیل کی آیتوں میں ان ہی دونوں کی عدم بجا آوری کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دیا گیا ہے:

﴿ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ ﴾

(۷۴/ المدثر:۴۲۔۴۴)

''کیا چیز تم کو دوزخ میں لے گئی، کہیں گے کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے اور نہ محتاجوں کو کھلاتے تھے۔''

پہلا گناہ حقوق الٰہی کی بجا آوری سے انحراف اور دوسرا بندوں کے حق سے تغافل ہے، یہی بات سورۂ ماعون کے آخر میں ہے:

---

❶ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی البخل: ۱۹۶۲۔

❷ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التعوذ من العجز و……: ۶۸۷۶۔

❸ مشکوۃ، کتاب العلم الفصل الثالث: ۲۵۰، بحواله شعب الایمان للبیهقی: ۱۷۶۷ تحقیق ناصر الدین البانی۔

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝ ﴾ (۱۰۶/ الماعون: ٤_٧)

''پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی جو اپنی نماز سے بے پروا رہتے ہیں، وہ جو دکھاوا کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو مانگے نہیں دیتے۔''

پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے کہ وقت پر نہیں ادا کرتے ہیں اور صرف دکھاوے کے لیے پڑھتے ہیں، یہ حقوقِ الٰہی سے تغافل ہے اور دوسری آپس میں مانگنے کی معمولی معمولی چیزوں میں جیسے نمک، آگ، پانی اور ایسی ہی دوسری بے حقیقت چیزوں میں بخل سے کام لینا ہے، یہ بندوں کے حقوق سے غفلت ہے۔ اس تشریح سے معلوم ہوا ہوگا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصہ کے عدم تعمیل کا سبب بنتا ہے اور اس لیے اس کی برائی جتنی بھی کی جائے کم ہے۔

حرص وطمع

حرص وطمع یا لالچ وہ برائی ہے، جس میں نفس کی دنائت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔خصوصاً وہ حرص وطمع جس میں بخالت کی بھی آمیزش ہو۔عربی میں اس کو شُحّ کہتے ہیں۔جس کی برائی قرآن میں کئی موقعوں پر آئی ہے۔خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔گھر کا مالک زیادہ دینا نہیں چاہتا اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہیں۔شوہروں کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے۔اس لیے وہ زیادہ خرچ نہیں دیتے اور بیویاں لالچ سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہیں، یا ایک شخص کی کئی بیویاں ہوں تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے کہ شوہر پر میرا حق زیادہ رہے اور شوہر کو اس بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے، اس سے خانگی معاملوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور سارا گھر روحانی تکلیف میں رہتا ہے۔اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان وایثار کا سلوک ہو اور ہر ایک دوسرے کے لیے اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے۔تو پھر وہی گھر جو پہلے غم کدہ تھا، عشرت کدہ بن جائے گا۔میاں بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ میں قرآن کی تعلیم ہے:

﴿ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١٢٨)

''اور طبیعتوں (نفوس) میں حرص دھری ہے اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ کو تمہارے کاموں کی ساری خبر ہے۔''

یعنی میاں بیوی دونوں حرص اور لالچ چھوڑ دیں اور احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں تو اللہ جو ہر ایک کے کاموں سے واقف ہے، سب کو ان کے کاموں کے مطابق جزا دے گا۔اس کاروباری دنیا میں ہر چیز کا ایک اقتصادی پہلو بھی ہوتا ہے۔جب تک انسان اپنی حرص وطمع کو روک کر، اچھے کاموں میں روپیہ خرچ نہیں کرے گا وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی۔فرمایا:

﴿ وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

(٦٤/ التغابن:١٦)

''اور خرچ کرو، اپنے لیے بھلائی کرو اور جو اپنے جی کی حرص سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔''

ایک اور موقع پر ہے کہ ان مسلمانوں کا وصف یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں:

﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ڲ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ (٥٩/ الحشر:٩)

''اور اپنے اوپر (اوروں کو) مقدم رکھتے ہیں۔اگرچہ خود ان کو ضرورت ہو اور جو اپنے جی کی

لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔''

اسی کا نام ایثار ہے، یہ ہر قوم کی دینی و دنیاوی کامیابی کا زینہ ہے اور یہ زینہ اس وقت تک کسی کو مل نہیں سکتا، جب تک حرص و طمع کا خاتمہ نہ ہو۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا، جو حرص و آز سے پاک ہوں گے وہی کامیاب ہوں گے۔

لالچی یہی نہیں کہ اپنے مال کو خرچ نہیں کرتا، بلکہ دوسرے کے مال پر بھی نگاہ رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ سب کا سب اسی کو مل جائے، اسلام نے ایسی آرزو کی ممانعت کی ہے۔ کیوں کہ اس میں دو اور بداخلاقیاں شامل ہیں۔ ایک بخل اور دوسری حسد۔ فرمایا:

﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَسْــَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝﴾

(٤/ النسآء:٣٢)

''اور اس کی ہوس نہ کرو جس میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔ مردوں کے لیے ان کی کمائی ہے اور عورتوں کے لیے ان کی اور اللہ سے مانگو، اس کے فضل میں سے حصہ، بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کسی چیز میں کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرا اس کی ہوس اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیوں مل گئی، کاش خود اسے ملتی، بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض و کرم میں سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لیے ہاتھ پھیلانا چاہیے۔ اگر اس کی مصلحت کا اقتضا ہوگا تو وہ عنایت کرے گا۔ اس تعلیم پر عمل کرنے سے طبیعت میں قناعت پیدا ہوگی۔ ساتھ ہی دوسرے پر حسد کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا۔ اسی لیے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ ﴾ (١٥/ الحجر:٨٧۔٨٨)

''اور بے شک ہم نے تجھ کو دیں سات آیتیں اور قرآن جس کا درجہ بڑا ہے، تو اپنی آنکھیں ان چیزوں پر مت پسار، جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ اٹھانے کو دی ہیں۔''

یعنی جس کو قرآن جیسی دولت ملی اس کی نظر میں دنیاوی دولت کیا چیز ہے؟ یہی حرص و طمع کا جذبہ ہے جو ایک کو دوسرے کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ''حرص و طمع سے بچو کہ اسی نے تم سے پہلوں کو برباد کیا۔ اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ انہوں نے خون بہایا اور حرام کو حلال سمجھا۔'' [1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ صحیح ابن حبان اور حاکم میں اس سے زیادہ مفصل ہے۔ فرمایا:

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم:٦٥٧٦۔

’’حرص سے بچو، کیوں کہ اسی نے اگلوں کو اس کی دعوت دی کہ انہوں نے (بے گناہوں کا) خون بہایا۔ اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ انہوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا اور اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھا۔‘‘ ❶ آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا: ’’حرص سے بچو، کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں۔ اسی نے ان کو کہا تو انہوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا۔ اسی نے کہا تو انہوں نے بخل کیا۔ اسی نے ان کو فسق وفجور کے لیے کہا تو انہوں نے فسق وفجور کیا‘‘۔ ❷ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ’’انسان میں سب سے بری بات کڑھانے والی حرص اور گھبرا دینے والی نامردی ہے۔‘‘ ❸ حریص آدمی اس لیے ہمیشہ غم میں کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا فلاں کے پاس یہ ہے، میرے پاس نہیں۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے حرص کو ہمیشہ غم اور کڑھن میں رکھنے والی فرمایا۔ نسائی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’’ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔‘‘ ❹ سبب ظاہر ہے کہ ایمان کامل کا نتیجہ صبر، توکل اور قناعت ہے اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی، بے صبری اور ہوس ہے۔ ایک دفعہ برائی کے لہجہ میں فرمایا کہ ’’انسان بوڑھا ہوتا ہے، مگر اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں، جینے کی خواہش اور مال کی حرص۔‘‘ ❺ کئی صحابیوں کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ’’دو بھیڑیئے جو بکریوں کے جھنڈ میں چھوڑ دیے جائیں، وہ ان کو اتنا برباد نہیں کرتے، جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین وایمان کو برباد کر دیتی ہے۔‘‘ ❻

❶ صحیح ابن حبان، کتاب الغضب: ۵۱۵۴؛ مستدرك حاکم، کتاب الایمان، ج۱، ص: ۱۲۔

❷ ابوداود، کتاب الزکوٰۃ، باب فی الشح: ۱۶۹۸۔

❸ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الجرأة والجبن: ۲۵۱۱۔ ❹ نسائی، کتاب الجهاد، باب فضل من عمل فی سبیل الله علی قدمه: ۳۱۱۲۔ ❺ ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء فی قلب الشیخ شاب علی...... ۲۳۳۹ ومستدرك حاکم، کتاب الرقاق، ج٤، ص: ۳۲۸۔

❻ ترمذی، ابواب الزهد: ۲۳۷٦ احمد، ۳/ ٤٥٦؛ الترغیب والترهیب منذری، باب الترغیب فی الزهد فی الدنیا، ج۲، ص: ۲۳۸۔

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے اور وہی اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے۔کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے۔اسی اصول کی بنا پر ہر شخص کی ملکیتیں محفوظ اور مامون ہیں اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے۔اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یا دھوکے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے، وہ فطرت کے نظامِ عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔اسلام نے اس نظام عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصر سی آیت میں بیان کردیا ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَـٰطِلِ ﴾ (٤/ النسآء: ٢٩)

''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے مت کھاؤ۔''

اس آیت نے ان تمام طریقوں کا جو ایمانداری کے خلاف ہیں اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے چار لفظوں میں خاتمہ کردیا ہے۔یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا اور فریب سے لے یا زور وظلم سے لے یا غصب کرے، یا چوری کرے یا اس میں خیانت کرے یا رشوت لے یا سود کھائے، غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے، اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھایا اور جس نے ہم (مسلمانوں) کو دھوکا دیا وہ ہم (مسلمانوں) سے نہیں''۔ [1] جان اور مال معاملات میں دو اہم چیزیں ہیں۔آنحضرت ﷺ کے اس مختصر سے فقرہ نے دونوں کی حفاظت کی اہمیت بتادی۔ایک دفعہ آنحضرت ﷺ بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک جگہ غلہ کا ایک ڈھیر پڑا دیکھا۔آپ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا اور باہر سوکھا ہے۔آپ ﷺ نے غلہ والے سے پوچھا کہ ''یہ کیا ہے؟'' عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے۔فرمایا: ''تو پھر اس کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ لیں۔جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہیں''۔ [2] یعنی رسول سے اس کا تعلق منقطع ہوجاتا ہے۔ارشاد ہوا: ''جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لیے جھوٹی قسم کھائے گا وہ اللہ سے ملے گا تو اللہ اس پر غضب ناک ہوگا۔ [3] ایک دفعہ ایک معاملہ میں ایک شخص نے اسی طرح قسم کھانا چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر اس نے قسم کھالی، تاکہ وہ ظلم سے مال لے لے، تو اللہ سے جب وہ ملے گا تو اللہ اس سے منہ پھیر لے گا۔'' [4]

کسی کے مال و جائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو ''غصب'' کہتے ہیں۔غصب کر لینا ظالمانہ فعل

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ: من حمل علینا السلاح فلیس منا: ۲۸۰ تا ۲۸۳۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ من غش فلیس منا: ۲۸٤۔

[3] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم: ۳۵۵۔

[4] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم: ۳۵۸۔

ہے۔ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے قصہ میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے، جو غریب مچھیروں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۝ ﴾ (۱۸/ الکھف :۷۹)

''وہ جو کشتی تھی سو کچھ غریبوں کی تھی۔ جو دریا میں محنت کرتے تھے۔ تو میں نے چاہا کہ اس میں کچھ عیب کر دوں اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو چھین کر لیتا تھا۔''

یہ ایک ایسی کھلی ہوئی برائی تھی کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا۔ اس برائی کو برائی کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھر زمین بھی دبائے گا ((طَوَّقَهُ اللّٰهُ فِيْ سَبْعِ اَرْضِيْنَ)) [1] تو اس کو زمین کے ساتوں طبقوں میں سے ہر ایک سے اتنے حصہ کے اٹھانے کو کہا جائے گا''۔ یا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اس کے گلے میں زمین کے یہ ساتوں طبق ہار کی طرح ڈالے جائیں گے۔ [2]

بے ایمانی کی سب سے عام قسم وہ ہے جو مقدمہ بازی سے متعلق ہے، کتنے لوگ ہیں جو وکیلوں کی قوت بیان اور حکام کے ناجائز فیصلوں کے زور سے غیروں کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیز نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''فریقین میں سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے اور وہ اپنے دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں، اگر میں نے اس کو کوئی ایسی چیز دلا دی جو اس کی نہیں تو وہ خود نہ لے۔ کیونکہ میں نے اس کو آگ کا ٹکڑا دیا ہے''۔ [3]

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہیں جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گو حق پر ہے، مگر اس کے پاس ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہیں، اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جا کر فریق کے دعوے کو بے ثبوت ٹھہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجبی مطالبہ کو ساقط کرا دیتے ہیں:

﴿ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۸)

''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ اور نہ پہنچاؤ حاکموں تک اس کا معاملہ، تا کہ کھا جاؤ لوگوں کا کچھ مال گناہ سے اور تم جان رہے ہو۔''

---

[1] صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب تحریم الظلم وغصب الارض، :۴۱۳۳ یہ عبارت کئی طرح سے ہے فی سبع ارضین، من سبع ارضین، الی سبع ارضین دیکھیں صحیح مسلم: ۴۱۳۵، ۴۱۳۶۔ [2] شرح نووی بر مسلم حدیث مذکور، ج۱۱، ص:۴۸۔ [3] ابوداود، کتاب الاقضیۃ، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ:۳۵۸۳۔

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمہارا دعویٰ اور تمہارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے، اسی طرح کمزوروں کو بے بس سمجھ کر یا اپنے بس میں پا کر ان کا مال خلافِ انصاف نہیں کھانا چاہیے، جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝﴾ (٤/ النسآء: ١٠)

''بے شک جو یتیموں کا مال ظلم سے کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے ہیں اور اب وہ آگ میں بیٹھیں گے۔''

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینے کی سب سے کمینہ حرکت کا نام چوری ہے۔ اسی لیے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے۔ یعنی ہاتھ کاٹ ڈالنا:

﴿ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳۸)

''اور جو کوئی چور ہو مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو سزا ان کی کمائی کی۔ تنبیہ اللہ کی طرف سے اور اللہ ہے زور آور حکمت والا۔''

چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے، دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے۔ اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔ بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا۔ مرتکبِ فعل کے خبثِ باطن کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر اس کی بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے۔ اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں اور چونکہ چور بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پالیتا ہے۔ اس لیے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کر دیتا ہے اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے۔ بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفائے جرم کی خاطر برباد کر ڈالتا ہے۔

اہلِ عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لیے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی ضروری سمجھی۔ سورۂ ممتحنہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے، جن کا عہد مسلمان ہونے والی بیویوں سے لیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''وہ چوری نہ کریں گی۔'' فتح مکہ کے دن جب مکہ کی خواتین اسلام قبول کرنے آئیں تو آپ ﷺ نے ان سے بھی اس کا عہد لیا۔ اس موقع پر ابوسفیان کی بیوی ہند نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں وہ میرے اور میرے بچوں کے لیے پورا خرچ نہیں دیتے۔ مگر یہ کہ میں ان کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں۔ فرمایا: ''تم ان کے مال سے اتنا لے لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو۔'' [1]

اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اسلام کا جوش مسلمانوں میں ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہند کو اتنی صفائی کے ساتھ اپنے گھر کا بھید کھولنے کی حاجت نہ تھی۔ دوسری یہ کہ جس کا نفقہ ہمارے ذمہ ہے، اگر ہم اس کو ادا نہ کریں اور وہ حسب ضرورت ہم سے پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے

[1] صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب نفقۃ المرأۃ اذا غاب عنها زوجها ونفقۃ الولد:، ۵۳۵۹۔

لے تو یہ چوری نہیں۔

یہ عہد صرف عورتوں ہی سے نہیں بلکہ مسلمان مردوں سے بھی آپ ﷺ نے لیا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہم سے عہد کرو کہ تم شرک، چوری اور بدکاری نہ کرو گے۔ پھر آیت پڑھی، جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے اور جو ان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو دے دی گئی تو اس کے اس گناہ کا کفارہ ہو گیا اور اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کیا اور اللہ نے اس کو چھپا دیا تو اس کی بخشش اللہ کے ہاتھ میں ہے چاہے معاف کرے چاہے سزا دے۔'' ❶

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے چور پر لعنت بھیجی۔ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خود یا رسی چراتا ہے، پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔'' ❷

چوری کا گناہ بھی بندہ اسی لیے کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین نہیں رکھتا، یا کم از کم یہ کہ فعل کے ارتکاب کے وقت اس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ جب بندے نہیں دیکھتے تو اللہ بھی ہم کو نہیں دیکھتا، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا۔'' ❸

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ ''تم میں سے ہر ایک کا مال دوسرے پر حرام ہے، مگر حق کے ساتھ۔'' ❹ یعنی جس کا مال ہو اس کی خوشی اور اجازت سے لو، یا اس کا کوئی کام کر کے معاوضہ میں حاصل کرو، یہی بات قرآن پاک کی اس آیت میں فرمائی گئی:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ﴾ (٤/ النسآء:٢٩)

''اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ، لیکن یہ کہ لین دین ہو آپس کی خوشی سے۔''

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے، جس میں ہر اس مال کو حرام بتایا گیا ہے، جو کسی سے جائز طریق سے حاصل نہ کیا گیا ہے۔

عرب میں قبیلہ مخزوم کی ایک عورت تھی، جو لوگوں سے چیزیں عاریت لے کر مکر جاتی تھی، یہ مقدمہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی، اچھے اچھے لوگوں نے اس کی سفارش کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے قومیں اس لیے

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب الحدود کفارة:٦٧٨٤۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب قول اللّٰه: السارق والسارقة:٦٧٩٩۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب مایحذر من الحدود:٦٧٧٢۔
❹ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب الخطبة أیام منی:١٧٣٩ تا ١٧٤٢۔

تباہ ہوئیں کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو ان کو سزا دیتیں اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتیں، اللہ کی قسم! اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا۔'' ❶

ایک صحابی رضی اللہ عنہ ایک چادر سرھانے رکھ کر سو رہے تھے، ایک چور آیا اور اس نے چالاکی سے ان کے سرہانے سے اس کو کھینچ لیا، وہ پکڑا گیا تو صحابی موصوف نے آ کر سفارش کی کہ یا رسول اللہ! یہ چادر صرف تیس درہم کی تھی، کیا تیس درہم کے لیے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، میں نے یہ چادر اس کے ہاتھ بیچ دی اور قیمت اس کے ذمہ رہی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ تک معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں کر لیا۔'' ❷

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نماز میں مصروف تھے کہ عین نماز کی حالت میں آپ کو جنت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا، نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں نے دوزخ میں اس کو بھی دیکھا جو اپنی آنکڑی سے حاجیوں کا سامان چرا لیتا تھا اور اگر مالک ہوشیار ہو جاتا تو کہہ دیتا تھا کہ اتفاق سے اس میں پھنس کر چلا آیا اور اگر وہ بے خبر رہتا تو لے جاتا تھا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے اس کو دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹتا پھرتا تھا۔'' ❸

❶ ابوداود، کتاب الحدود، باب فی الحد یشفع فیه: ٤٣٧٣۔

❷ ابوداود، کتاب الحدود، باب فی من سرق من حرز: ٤٣٩٤۔

❸ صحیح مسلم، کتاب الکسوف، باب ما عرض علی النبی ﷺ فی صلاۃ الکسوف: ٢١٠٢۔

ناپ تول میں کمی وبیشی

چوری کی عام قسم تو وہی ہے، جس کو سرقہ کہتے ہیں اور جس کی پاداش میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہے اور جس کی برائی ہر مذہب اور اخلاقی مسلک نے یکساں کی ہے، لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم یہ ہے کہ اس نے نازک سے نازک ناجائز معاملوں کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہیں سمجھا جاتا، تشریح کی اور ان کی برائیوں کی تشہیر کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی عملی تعلیموں سے ان کی اہمیت کو ظاہر فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم چیز ناپ تول کی کمی وبیشی ہے، جس سے ہر وقت کام پڑتا ہے اور جس میں خاص طور سے تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہیں اور جس سے زیادہ غریبوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین میں سے ایک بڑا قانون عدل ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہو وہ اس کو دے دی جائے، یہی وہ میزان یعنی ترازو ہے، جسے اللہ نے دنیا میں قائم کیا ہے اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہیے، جو شخص دوسرے کا جو حق ہے اس کو نہیں دیتا یا دینے میں کمی کرتا ہے، وہ اس ترازو سے کام نہیں لیتا ہے، فرمایا:

﴿ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝ ﴾ (۵۵/ الرحمان:۶-۹)

''اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی، کہ مت زیادتی کرو ترازو میں اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو اور مت گھٹاؤ تول۔''

اس ترازو سے انسان کا ہر قول وفعل تلتا ہے اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔

ناپ تول میں کمی بیشی کرنا، حقیقت میں دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے، جو کوئی لینے میں تول کو بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے، وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے اور یہ بھی چوری ہی ہے، اسی لیے قرآن پاک میں اس سے بچنے کی خاص طور پر تاکیدیں آئی ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم سوداگری کرتی تھی، اسی لیے ان کی دعوت میں ناپ تول میں ایمانداری کی تاکید بار بار کی گئی ہے، حضرت شعیب علیہ السلام سمجھاتے ہیں:

﴿ أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ۝ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۝ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ ﴾

(۲۶/ الشعرآء:۱۸۱-۱۸۳)

''اور پورا بھر دو ناپ اور نہ ہو نقصان دینے والے اور تولو سیدھی ترازو سے اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت پھرو ملک میں فساد پھیلاتے۔''

یہی حضرت شعیب علیہ السلام مدین والوں کو سمجھا کر کہتے ہیں، جو مشرق و مغرب کے تجارتی قافلوں کے رہ گزر میں آباد تھے:

﴿ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ إِنِّي أَرَاكُمْ بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُحِيطٍ ۝ وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ ﴾ (۱۱/ ھود:۸٤۔۸۵)

''اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو، میں تم کو آسودگی میں دیکھتا ہوں اور ایک گھیر لینے والے دن کی آفت کو تم پر ڈرتا ہوں اور اے میرے لوگو! ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو اور لوگوں کی چیزیں ان کو گھٹا کر مت دو اور ملک میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ ماپ اور تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے، یا ظاہری نظر سے دیکھیے تو یوں کہیے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ماپ تول میں کمی کرتے ہیں، ساکھ جاتی رہتی ہے اور یہ بالآخران کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھا لیں گے مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی یہ نصیحت پھر سورۂ اعراف میں دہرائی گئی ہے:

﴿ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۸۵)

''تو ناپ تول پوری کرو اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت ڈالو، یہ تمہارے لیے بھلا ہے، اگر تم کو یقین ہو۔''

آنحضرت ﷺ کے ذریعہ حضرت شعیب علیہ السلام کی یہ پرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی، اسلام میں جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اس کے بعد ہے:

﴿ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ ﴾ (٦/ الانعام:١٥٢)

''اور ناپ تول کو پورا کرو۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں جو اخلاقی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

﴿ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۳۵)

''اور جب تم ناپو تو ناپ پورا بھر دو اور سیدھی ترازو سے تولو، یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔''

آیت کا اخیر ٹکڑا بتاتا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول گو شروع میں کتنا ہی فائدہ پہنچائے، مگر آخر کار وہ بیوپار کی تباہی کا باعث ہو کر رہتی ہے۔

خوب غور کر کے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس بداخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یہ یقین گم ہو جاتا ہے کہ ان کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھیں ہر وقت کھلی ہیں اور ایک دن آئے گا جب ان کو اللہ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہوگا، سورۂ مطففین میں ہے جہاں اس بداخلاقی کی ممانعت کی گئی ہے، اس بیماری کا علاج بھی بتایا گیا ہے، فرمایا:

﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۝ أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوثُونَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَٰلَمِينَ ۝ ﴾ (۸۳/ المطففین:۱۔۶)

''خرابی ہے ان گھٹا کر دینے والوں کی، جو اوروں سے جب ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ یا تول کر دیں تو گھٹا دیں، کیا ان کو یہ خیال نہیں کہ ایک بڑے بھاری دن کے لیے ان کو اٹھایا جائے گا، جس دن سب لوگ دنیا کے مالک کے لیے کھڑے ہوں گے۔''

چھپا کر لینا

جو سامان واسباب کئی آدمیوں میں ابھی تک مشترک ہو اور وہ بانٹ کر علیحدہ علیحدہ نہ کیا گیا ہو، اس سے کوئی چیز دوسرے ساتھیوں سے چھپا کر لینا غلول کہلاتا ہے، مگر زیادہ تر مال غنیمت میں جو بددیانتی اور چوری کی جائے اس کو کہتے ہیں، غنیمت کا مال کوئی بھی لوٹے مگر وہ سارے سپاہیوں کا حصہ ہے، جب تک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک کا حصہ الگ الگ نہ کردے، یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دے دے، اس میں سے کچھ چھپا کر لے لینا غلول ہے اور یہ ایسی برائی ہے جس میں بددیانتی اور چوری دونوں ملی ہوئی ہیں۔

اس فعل کے مرتکب کو خیال یہ ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز میں ہر ایک کا حصہ ہے تو اس میں سے کسی کا کچھ لے لینا جائز ہونا چاہیے، لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہیں ہوا ہے، اس میں ہر ایک کا برابر برابر حصہ ہے اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لیے حلال نہیں ہوسکتا، دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی اس میں سے کوئی چیز چھپا کر لیتا ہے تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ یہ اس کی تنہا ملکیت نہیں، اسی لیے وہ دوسروں سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے، تیسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کو چھپا کر لے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوہرا حصہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ چھپا کر چوری سے لے اور دوسرا باقاعدہ بانٹ سے پائے اور یہ صریح بے ایمانی ہے۔

قرآن پاک نے تصریح کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیرِ عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ بھی گناہ گار ٹھہرے گا اور چونکہ انبیا علیہم السلام بھی امیر ہوتے ہیں اور وہ گناہوں سے مبرا ہوتے ہیں، اس لیے ان کی نسبت تو کسی کو یہ وہم بھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کا ارتکاب کریں گے، فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۶۱)

''اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ غنیمت میں سے چھپا کر لے لے۔''

پھر فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۶۱)

''اور جو کوئی غنیمت کا مال چھپا کر لے گا تو قیامت کے دن اپنا چھپایا مال لے کر آئے گا، پھر ہر کوئی اپنا کمایا پورا پورا پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

غزوۂ خیبر کے مال غنیمت میں سے مدعم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا، خیبر سے چل کر جب لوگ وادی القریٰ پہنچے تو ایک ناگہانی تیر اس غلام کو آکر ایسا لگا کہ اس کا کام ہی تمام ہوگیا، مسلمانوں نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان

ہے! جس شملہ کو اس نے خیبر میں تقسیم سے پہلے لے لیا تھا، وہ اس پر آگ کا شعلہ ہو رہا ہے۔" لوگوں نے یہ سنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا، اس کو بھی لا کر سامنے ڈال دیا، یہ دیکھ کر حضور ﷺ نے فرمایا: "یہ آگ کا تسمہ ہے، آگ کا۔" ❶

خیبر میں ایک اور واقعہ یہ گزرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی، جب اس کا جنازہ تیار ہوا تو آپ ﷺ سے عرض کیا گیا، آپ نے فرمایا: "تم لوگ اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھ لو۔" یہ سن کر لوگوں کے چہروں کا رنگ بدل گیا اور سمجھے کہ کوئی بات ہوئی ہے، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: "تمہارے بھائی نے مال غنیمت کی ایک چیز چھپا کر لی ہے۔" صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے اسباب کی تلاشی لی تو جھوٹے موتیوں کا ایک ہار نکلا جو چند آنوں سے زیادہ کا نہ تھا۔ ❷ قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہو چکتی تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ تین بار منادی کرتے، سب لوگ اپنا اپنا مال غنیمت لے کر آتے، پھر اس میں سے پانچواں حصہ نکالا جاتا اور اس کے بعد بانٹ دیا جاتا، اس کے بعد جو لے کر آتا وہ قبول نہ ہوتا اور وہ مجرم قرار پاتا، بلکہ کبھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا، ایک دفعہ اسی طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالوں کی ایک لگام لے کر آیا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! یہ ہم نے لوٹا تھا، فرمایا: "کیا تم نے بلال رضی اللہ عنہ کی تین دفعہ منادی نہیں سنی تھی؟" اس نے کہا، سنی تھی، پوچھا: "پھر اس وقت کیوں لے کر نہیں آئے۔" اس نے معذرت کی فرمایا: "تم اس کو قیامت میں لے کر آنا، میں نہیں قبول کرتا۔" ❸ عمال کو ہدایت کی گئی کہ ان کو جو ملے اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں لا کر پیش کریں، فرمایا: "اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو، وہ ایک سوئی بھی چھپا کر لے گا، تو وہ "غلول" ہے، وہ اس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا۔" ❹

❶ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی تعظیم الغلول: ۲۷۱۱۔ ❷ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی تعظیم الغلول: ۲۷۱۰۔ ❸ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الغلول اذا کان یسیرا: ۲۷۱۲۔
❹ سنن ابی داود، کتاب الاقضیة، باب فی هدایا العمال: ۳۵۸۱۔

رشوت

کسی کے مال سے ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک عام صورت رشوت ہے، رشوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کے پورا کرنے کے لیے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے کر اپنے موافق کرلے۔ ❶

پہلے عرب کے کاہن اپنی مفروضہ غیبی طاقت کی بنا پر بعض مقدموں کے فیصلے کرتے تھے، اہل غرض ان کو اس کے لیے مزدوری یا رشوت کے طور پر کچھ نذرانہ دیتے تھے، اس کو حلوان (مٹھائی) کہتے تھے، اسلام آیا تو اوہام کا یہ دفتر ہی اڑ گیا، اس پر آنحضرت ﷺ نے کاہن کے حلوان کی خاص طور سے ممانعت فرمائی۔ ❷ عرب میں یہودیوں کے مقدمے ان کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے اور چونکہ دولت اور تمول نے ان میں اونچ نیچ طبقے قائم کر دیے تھے، اس لیے وہ قانون کی ناہمواری کے دل سے خواہشمند رہتے تھے، قانون کی زد سے بچنے کے لیے علانیہ رشوت دیتے تھے اور ان کے کاہن اور قاضی علانیہ لیتے تھے اور ایک کا حق دوسرے کو دلا دیتے تھے اور اس ذریعہ سے توراۃ کے احکام پر مصالح وضرورت کے اقتضا سے پردہ ڈال دیتے تھے۔ ❸ چنانچہ توراۃ کے قوانین میں تحریف کا ایک سبب یہی رشوت خوری تھی۔ قرآن مجید کی اس آیت میں ان کے اسی گناہ کی پردہ دری کی گئی ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾

(۲/ البقرۃ: ۱۷٤)

"اللہ نے کتاب سے جو اتارا اس کو جو چھپاتے ہیں اور اس کے ذریعہ معمولی معاوضہ حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، اللہ ان سے قیامت کے دن بات نہ کرے گا، نہ ان کو پاک صاف کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

"پیٹ میں آگ بھرنا" اس لیے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں آ کر اللہ کے احکام میں ردوبدل اور منشائے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے، اس لیے یہی سزا ان کو ملے گی۔ ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہودی رئیس اپنے علما کو اس لیے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے جو اوصاف توراۃ میں ہیں، وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں، لیکن قرآن پاک کے لفظ سے یہ

❶ مجمع البحار علامہ فتنی، ج ۲، ص: ۳۲۹۔

❷ ترمذی، ابواب النکاح، باب ما جاء فی کراھیۃ مهر البغی: ۱۱۳۳۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب الرجم بالبلاط: ٦٨١٩۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکامِ الٰہی میں عام طور سے ردو بدل کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعہ سے دنیا کی دولت کماتے تھے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں ان کی اس حرام خوری کا ذکر دو دفعہ ہے، فرمایا:

﴿ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ ﴾ (٥/ المآئدة:٦٢_٦٣)

''اور تو ان میں سے بہتوں کو دیکھے کہ وہ گناہ اور زیادتی اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں، ان کے درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں۔''

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ ﴾ (٥/ المائده:٤٢)

''جھوٹ کے بڑے سننے والے اور حرام کے بڑے کھانے والے۔''

قرآن پاک کی ایک اور آیت جو پہلے گزر چکی ہے یہاں پر بھی استدلال کے قابل ہے:

﴿ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (٢/ البقرة:١٨٨)

''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ، تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔''

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسروں نے اختیار کیا ہے، رشوت کی ممانعت میں صاف وصریح ہے۔

آنحضرت ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ [1] رشوت دینے والے پر یوں کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے اور جرم کی اعانت قانون اور اخلاق دونوں میں منع ہے۔

خیبر کے یہودیوں سے زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی، جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ صحابی کو بھیجتے، وہ ایمانداری سے پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ان دو میں سے جو چاہو لے لو، یہودیوں نے اپنے دستور کے مطابق ان کو بھی رشوت دینی چاہی، آپس میں چندہ کر کے اپنی عورتوں کے کچھ زیور اکٹھے کیے اور کہا کہ یہ قبول کرو اور اس کے بدلہ تقسیم میں ہمارا حصہ بڑھا دو۔ یہ سن کر حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے یہودیو! اللہ کی قسم! تم اللہ کی ساری مخلوق میں مجھے مبغوض ہو، لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ

[1] ابوداود، کتاب الاقضیة، باب فی کراھیة الرشوة:٣٥٨٠۔

حرام ہے، ہم (مسلمان) اس کو نہیں کھاتے''۔ یہودیوں نے ان کی یہ تقریر سن کر کہا کہ ''یہی وہ (انصاف) ہے جس سے آسمان اور زمین قائم ہیں۔'' [1]

اسی لیے آنحضرت ﷺ نے عمال کو رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی۔ [2] ایک دفعہ ایک عامل نے آکر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی، حمد وثنا کے بعد فرمایا:

''عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو بھیجتے ہیں تو آکر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے، تو اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھ کر نہیں دیکھتا کہ اس کو تحفے ملتے ہیں یا نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، وہ اس میں سے جو لے جائے گا وہ قیامت میں اپنی گردن پر لاد کر لائے گا، اونٹ گائے، بکری جو ہو، پھر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا: ''میں نے پہنچا دیا۔'' [3]

اس آیت میں آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا، وہ غلول والی آیت کی تفسیر ہے۔

---

[1] مؤطا امام مالك، كتاب المساقاة: ١٤١٢، ١٤١٣۔

[2] ابوداود، كتاب الاقضية، باب في هدايا العمال: ٣٥٨١ وكتاب الخراج، باب في هدايا العمال: ٢٩٤٦۔

[3] صحيح بخاري، كتاب الاحكام، باب هدايا العمال: ٧١٧٤۔

سودخوری

سودخوری، حرص وطمع، بخل اور ظلم کا مجموعہ ہے، حرص وطمع تو یوں کہ سودخوراس سود کے ذریعہ چاہتا ہے کہ ساری دولت سمٹ کراس کے پاس آ جائے، بخل یوں کہ وہ کسی غریب مقروض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتا اور نہ کسی کارخیر میں دے کراپنے سرمایہ میں کچھ کمی پسند کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سودخوری کا ذکر زکوۃ اور خیرات کے مقابلہ میں کیا ہے اور ظلم یوں کہ وہ سود اور سود در سود کے ذریعہ لوگوں کو ان کی محنتوں کے پھل سے محروم کردیتا ہے اور رحم نہیں کرتا، اسی لیے سود کی ممانعت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے فرمایا:

﴿ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۹)

''نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

یعنی تم نے جتنا دیا ہے اس سے زیادہ لو، تو یہ تمہارا ظلم ہے اور جتنا تم نے دیا ہے اتنا تم کو نہ ملے تو یہ تم پر ظلم ہے۔ اس حرام خوری کی عادت بھی عرب میں یہودیوں کی بدولت پھیلی تھی، وہی سرمایہ کے مالک تھے اور غریب عرب کسان اور مزدور اکثر ان ہی سے سودی قرض لیتے تھے، یہودیوں پر نعمتوں کا دروازہ جو بند کیا گیا، اس کے اسباب کے بیان کے سلسلہ میں ہے:

﴿ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۭ ﴾ (٤/ النسآء:١٦١)

''اور ان کے سود لینے کے سبب سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کے مال کو ناروا طریق سے کھانے کے سبب سے۔''

اسلام آیا تو اس نے سرمایہ داری کی اس لعنت کو جس سے دنیا دبی جارہی تھی، ہمیشہ کے لیے دور کردیا:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۵۔۲۷۶)

''جو سود کھاتے ہیں، وہ ایسے اٹھیں گے، جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے شیطان نے لپٹ کر حواس کھو دیئے ہوں، یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا کہ خرید وفروخت کا معاملہ سود ہی کی طرح ہے اور اللہ نے خرید وفروخت کے معاملہ کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے، تو جس کے پاس اس کے پروردگار کی نصیحت پہنچی اور وہ باز رہا تو اس کا ہے جو پہلے دیا گیا اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو پھر ایسا کرے تو وہ دوزخی ہیں، وہ دوزخ میں رہیں گے، اللہ سود کو مٹاتا اور صدقہ وخیرات کو

بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہگار کو پیار نہیں کرتا۔''

قیامت میں سود خور کا بدحواس ہو کر اٹھنا اس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تمثیل ہوگی، دنیا میں سود خوروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دوسروں کے مال و دولت کے چھیننے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے میں ایسے مشغول رہتے ہیں کہ انھیں کسی کارِ خیر کا خیال نہیں آتا، تو قیامت میں بھی وہ ایسے ہی اپنے حواس کھوئے ہوئے اٹھیں گے، آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے سود خواروں کو ناشکرا گناہگار ٹھہرایا ہے، کیونکہ اللہ نے جو دولت ان کو دی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس سے وہ کار خیر کرتے، غریبوں کو دیتے، مستحقوں کو بانٹتے، مگر انھوں نے اس کے بجائے غریبوں کو اور لوٹا اور ظلم سے ان کی تھوڑی بہت پونجی کو بھی چھین لیا اور یہ نعمت کی ناشکری تھی۔

یہودیوں کی دیکھا دیکھی عربوں میں بھی کچھ ایسے سرمایہ دار پیدا ہو گئے تھے، جو سودی کاروبار کرنے لگے تھے، جیسے حضرت عباس بن عبدالمطلب اور بنو عمرو بن عمیر وغیرہ، اب وہ اور ان کے مقروض جب مسلمان ہوئے اور ان میں سے قرض داروں نے مقروضوں سے پہلے کا سود مانگا، تو اس پر یہ آیتیں اتریں، جو پہلی ہی آیتوں کے سلسلہ میں ہیں:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۝ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۣ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۸۔۲۸۱)

''اے ایمان لانے والو! اللہ کا خیال کرو اور سود جو رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو، اگر تم واقعی مومن ہو، تو اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کے لیے ہوشیار ہو جاؤ اور اگر تم باز آ جاؤ تو تمہارے لیے تمہارا اصل سرمایہ ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے اور اگر وہ (مقروض) تنگ دست ہو تو اس کو کشادگی تک مہلت دو اور معاف کر دینا تمہارے لیے سب سے اچھا ہے، اگر تم کو سمجھ ہو اور اس دن سے ڈرو، جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر کسی کو وہ پورا پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان کا کچھ دبایا نہ جائے گا۔''

ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ ایک دن آئے گا جب سب اللہ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور جس نے کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا، اس کا حساب ہوگا، تو اگر تم نے نیکی کی ہوگی اور مقروضوں کو معاف کیا ہوگا، تو اللہ کے یہاں پورا پورا مل جائے گا۔

جاہلیت میں ربا کی یہ صورت تھی کہ غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادا کر دینے کے وعدے پر مہاجنوں سے قرض لیتے تھے، جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کر سکتے، تو مہاجن کہتے کہ ہم مدت بڑھا دیتے ہیں تم جنس کی مقدار بڑھا دو، مثلاً: ایک روپیہ میں دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر بیس کر دیتے اور اسی طرح جب تک وہ قرض ادا نہ کر دیتے یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی، یہاں تک کہ اصل سے کئی گنا سود ہو جاتا، اللہ نے فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ (۲/ آل عمران: ۱۳۰۔۱۳۱)

”اے ایمان والو! (اصل سے) دو گنا چوگنا سود مت کھاؤ اور اللہ سے تقویٰ کرو، شاید کہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے بچو جو منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔“

اس آیت میں تصریح ہے کہ سود خوری کی سزا جہنم ہے، وہ جہنم جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے ایک رؤیائے صادقہ میں سود خوروں کو جس حال میں دیکھا اس کی تصویر یہ ہے فرمایا: ”میں نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے، اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ میں پتھر لیے کنارے پر کھڑا ہے، پہلا آدمی تھک کر جب کنارے پر آنا چاہتا ہے تو دوسرا آدمی ایسا تاک کر پتھر مارتا ہے کہ اس کا منہ کھل جاتا ہے اور وہ پتھر لقمہ بن کر اس کے پیٹ میں چلا جاتا ہے، وہ پتھر کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے، جبرئیل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ جو خون کی نہر میں تیر رہا ہے، سود خور ہے۔“ [1] سزا کی مماثلت ظاہر ہے، لوگ اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت سے جو روزی پیدا کرتے ہیں، سود خور آسانی سے اس پر قبضہ کر لیتا ہے، تو وہ انسان کے خون میں تیرتا ہے اور جو پتھر لقمہ تر بن کر اس کے منہ میں چلا جاتا ہے، تو وہ، وہ دولت ہے جس کو وہ سود سے جمع کرتا ہے۔

گناہ کے شریک وہ بھی ہیں، جو کسی گناہ کی اعانت میں شریک ہوں، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے (یعنی دینے والے) سود پر گواہ ہونے والے اور سود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی۔ [2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجنائز: ۱۳۸۶ وکتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا بعد صلاۃ الصبح: ۷۰۴۷۔

[2] ابوداود، کتاب البیوع، باب فی اکل الربا وموکلہ: ۳۳۳۳۔

شراب خوری

شراب خوری ان عادات ذمیمہ میں سے ہے جن کی برائی کھلی ہوئی ہے، پھر بھی یہ نئی عجیب بات ہے کہ دنیا کی اکثر قومیں اس میں مبتلا نظر آتی ہیں، اسلام سے پہلے جو مذہب تھے، ان میں بھی اس کی برائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے اور اس کا پینا اچھا نہیں سمجھا گیا ہے، ❶ لیکن اس کو حرام قطعی ٹھہرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے۔ شراب عرب کی گھٹی میں پڑی تھی، شراب پینا، پلانا اچھے اچھے گھرانوں میں لطف اور تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، بیویاں شوہروں ❷ کو اور چھوٹے اپنے بزرگوں کو اپنے ہاتھوں سے پلاتے تھے۔ ❸

اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگوں نے شراب چھوڑ دی تھی، مگر سارا ملک اسی مصیبت میں گرفتار تھا، لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے، جس سے دلوں میں آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی، کبھی ترنگ میں آتے تو جو اونٹ ملتا اس کو پچھاڑ ڈالتے اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس کا ہے۔ ❹ اور ساتھیوں کو اس کے کباب بنا کر کھلا دیتے، ساتھ ہی ساتھ جوا ہوتا اور اس میں مویشیوں کی بازی لگاتے، ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت کے حصے کیے جاتے، ان کو سب مل کر کھاتے اور بچ رہتا تو غریبوں کو بھی کھلاتے۔

اسلام آیا تو اس نے رفتہ رفتہ شراب کی چاٹ گھٹانی شروع کی، پہلے تو یہ کہا کہ نشہ کوئی اچھی چیز نہیں، اللہ نے تم کو کھجور اور انگور دیے جو بڑی نعمت ہیں، لیکن تم ان سے نشہ تیار کرتے ہو اور کھانے کے کام میں بھی لاتے ہو، فرمایا:

﴿ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (١٦/ النحل :٦٧)

''اور کھجور اور انگور کے میوے دیے، تم ان سے نشہ بناتے ہو اور اچھی روزی، اس میں ان لوگوں کے لیے اللہ کی نشانی ہے جو سمجھتے ہیں۔''

اس آیت میں نشہ کو ''رزقِ حسن'' کے مقابل میں رکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نشہ ''رزق حسن'' ❺ نہیں۔ ان آیتوں میں درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں، ❻ اوپر دودھ اور گوبر اور خون اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلائشوں کے اندر سے کیسا پاک وصاف نکلتا ہے، یہی حال کھجور اور انگور کا ہے کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک اور غذا جیسی پاک چیز دونوں پیدا ہوتی ہیں۔

❶ لوقا ۱۔ ۱۵۔ ❷ سبعہ معلقہ میں قصیدہ عمرو بن کلثوم الا ھبی بصحنك، ص:۱۰۴۔

❸ صحيح بخاري، كتاب الاشربة، باب من رأى ان لا يخلط البسر والتمر: ٥٦٠٠۔

❹ سبعہ معلقہ میں طرفہ کا قصیدہ، ص:٦٠ اور صحیح بخاری، کتاب المغازی: ٤٠٠٣ میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قصہ۔

❺ تفسير كبير امام رازي، تفسير سورة نحل، ج ٤، ص ١٥٩۔ ❻ مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔

مدینہ میں آ کر شراب کی حرمت کے مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، حکم ہوا:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (٤/ النسآء:٤٣)

''تم جب نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم جانو کہ تم کیا کہتے ہو۔''

اس آیت نے ہشیاروں کو چونکا دیا، کچھ لوگوں نے بالکل چھوڑ دی اور دوسروں نے اپنے پینے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا، اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا کہ کنایہ تصریح کی صورت اختیار کرے، لوگوں کے دلوں میں آپ سے آپ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوئے کے بارہ میں اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہوگا:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ ﴾ (٢/ البقرة:٢١٩)

''(اے پیغمبر)! تجھ سے شراب اور جوئے کے بارہ میں پوچھتے ہیں، کہہ دے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدہ کی چیزیں بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑا ہے۔''

فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہوتا ہے، صحبت اور تفریحِ طبع کا لطف آتا ہے، لوگ کھاتے پیتے ہیں، دوسروں کو بھی ان کے بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے، لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہیں۔ اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہشیار کر دیا اور وہ شراب سے تائب ہو گئے، لیکن چونکہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہیں آیا تھا، اس لیے اس کے فائدہ کے پہلو کو رخصت سمجھ کر کچھ لوگ پیتے بھی تھے، آخر یہ آیت اتری:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ ﴾

(٥/ المآئدة:٩٠-٩١)

''اے ایمان والو! شراب اور جوا اور چڑھاوے کے بت اور پانسے، گندے کام ہیں شیطان کے، سو ان سے بچتے رہو، شاید تمہارا بھلا ہو، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں شراب اور جوئے سے دشمنی اور بیر ڈال دے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، پھر اب تم باز آتے ہو۔''

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہ نے چلا کر کہا، یا اللہ! ہم باز آ گئے، [1] اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر

[1] ابوداود، كتاب الاشربة، باب تحريم الخمر: ٣٦٧٠۔

طرف گلیوں میں خم الٹے جار ہے تھے اور شراب زمین پر بہائی جارہی تھی۔ [1] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتا دیئے ہیں، اول یہ کہ یہ شیطان کا کام ہے، دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور تیسرا یہ کہ یہ انسان کو اس کے بہت سے ضروری کاموں سے غافل کر دیتی ہے، ان تینوں اسباب کی سچائی روزِ روشن کی طرح آج بھی آشکارا ہے۔

اوپر کی آیت میں شراب اور جوئے کو جو شیطان کا کام بتایا گیا ہے، اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے، یعنی شراب اور جوئے کو چڑھاوے کے بتوں اور بانٹ کے پانسوں کے ساتھ ملا کر شیطان کے ناپاک اور برے کاموں میں شمار کیا ہے، اس لیے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شک ہی نہیں، اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی برائی کا اظہار بھی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ جب ان کے گھونسہ سے اتفاقاً ایک قبطی مر گیا تو فرمایا:

﴿ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ﴾ (۲۸/ القصص:۱۵)

''یہ ہوا شیطان کے کام سے۔''

یعنی بہت ہی برا کام ہوا، اسی طرح اس آیت:

﴿ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۲۷)

''بے شبہ فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔''

کی روشنی میں ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب، جوئے، بتوں کے چڑھاوے اور جیتے ہوئے جانوروں کو بے کار ذبح کر کے پانسوں سے ان کی بانٹ میں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا، مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہے، کون نہیں جانتا شراب خوری، قمار بازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے خاندان اور قوم کی قوم کو تباہ کر دیا ہے، جس کی مثالیں زمانہ کے صفحوں پر لکھی آج بھی ملتی ہیں۔ اس کے بعد ان شیطانی کاموں کی دو برائیاں قرآن نے بتائی ہیں، ایک معاشرتی اور دوسری مذہبی۔ معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور وہ کام کر گزرتے ہیں جن کو وہ ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے۔ کتنے قتل، کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کی بدولت روزانہ پیش آتے ہیں، مذہبی برائی یہ ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اللہ کی یاد اور نماز سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے، غافل ہو جاتا ہے۔ بلکہ خود اپنے مفید دنیاوی کاموں سے بھی ایسا کھویا جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو جاتی ہے۔

[1] صحيح بخاري، كتاب الاشربة، باب نزل تحريم الخمر: ۵۵۸۲۔

شراب کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے، قرآن نے اس کے لیے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے، خمر کہتے ہیں چھا جانے کو، اس لیے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل اور ہوش پر چھا جائے، وہ خمر میں داخل ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر فرمایا: ''شراب (خمر) وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے۔'' (1) آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہر وہ شے جو نشہ پیدا کرے، حرام ہے۔'' (2) فرمایا: ''جس نے دنیا میں شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا۔'' (3) آنحضرت ﷺ جب معراج میں تشریف لے گئے تو آپ کے سامنے دستِ غیب نے دو پیالے رکھے، ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب، سرور کائنات ﷺ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا، ناموس وحی حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: ''اس اللہ کی حمد جس نے آپ کو فطرت کی راہ دکھائی اگر آپ شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔'' (4) گویا شراب مثال کی دنیا میں گمراہی کی تصویر ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی مومن جب شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔'' (5) یہ بھی فرمایا کہ ''قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا۔'' (6) اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم اور متعلقات بھی سد ذرائع کے طور پر حرام کیے، یہاں تک کہ شروع شروع میں ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کیا، جن میں شراب عموماً بنائی جاتی تھی، پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے، تو اس سختی کو اٹھا دیا۔ (7) اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آ چکا ہے کہ ﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (٥/ المائدۃ:٢) ''گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو۔'' کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا، بنانا، بیچنا، خریدنا، لینا، لے جانا، سب حرام ٹھہرایا گیا۔ فرمایا: ''اللہ نے شراب پر، اس کے پینے والے، پلانے والے، خریدنے والے، دوسروں کے لیے نچوڑنے والے، اپنے لیے نچوڑنے والے، اس کے لے جانے والے اور جس کے پاس لے جائی جائے، سب پر لعنت فرمائی ہے۔'' (8) یہ بھی ارشاد ہوا کہ ''ہر نشہ کی چیز حرام ہے اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو اس کا تھوڑا بھی ویسا ہی حرام ہے۔'' (9)

---

(1) صحیح بخاری، کتاب الاشربة، باب الخمر من العنب:٥٥٨١۔ (2) صحیح بخاری، کتاب الاشربة، باب الخمر من العسل:٥٥٨٥؛ مسلم:٥٢١١، ٥٢١٢۔ (3) بخاری، کتاب الاشربة، باب قوله تعالیٰ: انما الخمر......:٥٥٧٥؛ مسلم: ٥٢٢٤۔ (4) بخاری، ایضًا: ٥٥٧٦۔ (5) بخاری، ایضًا، ......: ٥٥٧٨۔

(6) ایضًا:٥٥٧٧۔ (7) ایضًا، باب ترخیص النبی ﷺ فی الاوعية:٥٥٩٣۔

(8) ابوداود، کتاب الاشربة، باب العصیر للخمر: ٣٦٧٤۔ (9) ابوداود، باب ما جاء فی السکر: ٣٦٨١؛ ترمذی، کتاب الأشربة، باب ما جاء ما اسکر کثیره فقلیله حرام: ١٨٦٥، ١٨٦٦۔

غیظ وغضب

غیظ وغضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے بہت سے ظالمانہ اور بے دردانہ کام انسان صرف غیظ وغضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے، اس لیے ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ وغضب کا اظہار نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانوں کی تعریف کی ہے:

﴿ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۳۴)

''کہ وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں۔''

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَإِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ: ۳۷)

''جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔''

انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے، لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہیں ہے، لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے اور معاف کر دے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے کو قابو میں رکھے۔'' ❶

حضرت ابو ہریرہ، ❷ حضرت ابن عمر ❸ حضرت جاریہ بن قدامہ، ❹ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہم ❺ وغیرہ کئی صحابیوں سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے، ارشاد ہوا کہ ''غصہ نہ کیا کرو''۔ اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی تو اس نے دوبارہ سہ بارہ عرض کی آپ ﷺ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ ''غصہ نہ کیا کرو۔'' مسند احمد میں ہے کہ ان صاحب کا بیان ہے کہ پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ میں ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ ❻

مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے عصر کی نماز کے بعد صحابہ کو کھڑے ہو کر نصیحتیں فرمائیں، جن میں سے ایک یہ تھی، فرمایا: ''آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کیے گئے ہیں، ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور سکون جلد ہو جاتا ہے اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے اور دور بھی جلد ہو جاتا ہے، تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آتا ہے اور دفع بہت دیر میں ہوتا ہے، تو ہاں! ان میں سب سے اچھا وہ ہے، جس کو غصہ دیر میں آئے اور دور جلد ہو جائے اور ان سب سے برا وہ جس کو غصہ جلد آتا ہو اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو۔ ہاں! غصہ

❶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة باب فضل من یملك نفسه عند الغضب: ٦٦٤٣ وبخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب: ٦١١٤۔ ❷ بخاری: ٦١١٦؛ ترمذی: ٢٠٢٠؛ احمد، ٢/ ٣٦٢، ٢/ ٤٦٦۔
❸ صحیح ابن حبان: ٢٩٦ عن عبدالله بن عمرو۔ ❹ طبرانی الاوسط: ٧٤٩١؛ صحیح ابن حبان: ٥٦٦٠؛ احمد، ٣/ ٤٨٤۔ ❺ طبرانی الاوسط: ٢٣٥٣۔ ❻ احمد، ٥/ ٣٧٣۔

ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے، دیکھتے نہیں کہ اس کی آنکھیں لال اور اس کی رگیں پھول جاتی ہیں، تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو اس کو چاہیے کہ وہ زمین سے لگ جائے۔'' ❶

ابو داوٗد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے، تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہیے کہ وہ وضو کر لے۔'' ❷ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جس کو غصہ آئے وہ کھڑا ہے تو اسے چاہیے کہ بیٹھ جائے، اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہیے کہ لیٹ جائے۔'' ❸

صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہو گئیں، ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ لال ہو گیا اور رگیں پھول گئیں، تو آنحضرت ﷺ نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا پھر فرمایا: ''مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے اور وہ یہ ہے کہ وہ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کہے۔'' ❹

اس اخیر حدیث کی تائید قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے:

﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ إِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف: ۱۹۹-۲۰۰)

''معاف کرنے کی عادت ڈال، نیکی کی بات کہہ اور نادانوں سے درگزر کر اور اگر شیطان کی چھیڑ تجھ کو ابھار دے تو اللہ کی پناہ پکڑ، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

اسی قسم کی آیت سورۂ حٰم السجدۃ (۴۱: ۳۴-۳۶) میں بھی ہے، جس کا ترجمہ ہے:

''نیکی اور بدی برابر نہیں، برائی کا جواب نیکی سے دے، پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہو گی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے دوست رشتہ والا اور یہ بات ملتی ہے اس کو جو بڑی قسمت والا ہے اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ، بے شک وہی سننے والا جاننے والا ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں۔ ایک روحانی اور دو ظاہری۔ روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے، یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے، اس لیے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہیے کہ یا اللہ! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) اللہ اس کی سنے گا اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کر لے گا، ظاہری طور سے بھی دیکھیے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہوگا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے تو اللہ کے نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا۔ دو ظاہری

❶ ابو داود، کتاب الادب، باب ما یقال عندالغضب: ٤٧٨٢۔ ❷ ایضًا: ٤٧٨٤۔

❸ ایضًا: ٤٧٨٢۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الحذر من الغضب: ٦١١٥ ومسلم، باب فضل من یملك نفسه عند الغضب: ٦٦٤٦۔

علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا، دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کر لے، اس سے منشا یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی۔

بغض وکینہ

دل میں کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیرپا جذبہ رکھنا بغض اور کینہ کہلاتا ہے، یہ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾ (۵۹/ الحشر:۱۰)

''اے ہمارے پروردگار! ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے آگے ایمان میں پہنچے، معاف کر اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کا کینہ مت رکھ، اے ہمارے پروردگار! تو نرمی والا مہربان ہے۔''

جنت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جو لوگ ہوں گے، آپس میں بھائی بھائی ہوں گے، وہاں بغض وکینہ کا گزر نہ ہوگا، فرمایا:

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴾ (۱۵/ الحجر:۴۷)

''اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا، بھائی بھائی ہو کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے۔''

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ﴾ (۷/ الاعراف:۴۳)

''اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا، نہریں ان کے نیچے بہتی ہوں گی۔''

ان آیتوں کے اشارے سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیوں میں کینہ رہے گا، جنت کا تختہ ہاتھ نہ آئے گا۔

آنحضرت ﷺ نے ہم کو جو تعلیم دی ہے اس کا یہ منشا ہے کہ ہم کو دنیا ہی میں جنت کی سی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ فرمایا:

''اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو اور ایک اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ، کسی بھائی کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے۔'' [1]

مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی سبب سے دو بھائیوں میں کوئی ملال کی بات ہو جائے تو اس کو تین دنوں سے زیادہ کوئی اپنے دل میں نہ رکھے، ابوایوب صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑے، دونوں ملیں تو ایک دوسرے سے منہ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماینھی عن التحاسد والتدابر:۶۰۶۵؛ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ:۶۵۲۶؛ ابوداود، کتاب الادب، باب فی ھجرۃ الرجل اخاہ:۴۹۱۰؛ ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ما جاء فی الحسد:۱۹۳۵، مالک، کتاب الجامع، باب ماجاء فی المھاجرۃ: ۱۶۸۴۔

پھیرے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔'' 1 ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ کسی مومن کو تین دن سے زیادہ چھوڑے، تین دن جب ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آ کر ملے، پھر سلام کرے، تو اگر دوسرے نے جواب دیا تو دونوں کو مزدوری ملی اور اگر اس نے جواب نہیں دیا تو وہ (جواب نہ دینے والا) گناہ لے کر لوٹا۔'' 2 کئی حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ کو انسان کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے اللہ کے ساتھ شرک نہیں کیا اللہ اس کو معاف فرماتا ہے، لیکن جن دو آدمیوں میں آپس میں کینہ ہوتا ہے، تو اللہ فرماتا ہے کہ ان دونوں کو ابھی رہنے دو میل کر لیں۔'' 3 اس حدیث کی تشریح ایک روایت سے ہوتی ہے، فرمایا: ''دو شنبہ اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے مغفرت مانگی ہوگی اس کو مغفرت دی جاتی ہے اور جس نے توبہ کی ہوگی اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، لیکن کینہ والوں کے اعمال ان کے کینہ کے سبب سے لوٹا دیے جاتے ہیں، جب تک وہ اس سے باز نہ آئیں۔'' 4 یہ بھی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تین شخصوں کی بخشش نہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جو اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہے۔'' 5 ان حدیثوں پر غور کیجئے شرک اور کینہ دونوں کو ایک خاص پہلو سے برابر کا درجہ دیا گیا ہے، دین دو چیزوں سے عبارت ہے، اللہ کا حق اور بندوں کا حق۔ جب تک شرک رہے گا اللہ کا حق ادا نہیں ہو سکتا، اسی طرح جن دو آدمیوں میں کینہ رہے گا ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا کوئی حق ادا نہ کر سکے گا، غرض جس طرح شرک، حق اللہ سے مانع ہے، بغض و کینہ حق العباد سے باز رکھتا ہے اور انہیں دونوں حقوق سے عہدہ برآ ہونا جنت کی کنجی ہے۔

---

1 صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب السلام للمعرفة وغیر المعرفة: ٦٢٣٧؛ مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الهجر فوق ثلاث: ٦٥٣٢؛ ترمذی، ایضاً، باب ماجاء فی کراهیة الهجر للمسلم: ١٩٣٢؛ ابوداود، کتاب الادب: ٤٩١١؛ موطا مالك: ١٦٨٢۔ 2 ابوداود، ایضاً: ٤٩١٣۔ 3 صحیح مسلم. کتاب البر والصلة، باب النهی عن الشحناء: ٦٥٤٤؛ ابوداود: ٤٩١٦؛ ترمذی: ٢٠٢٣؛ ادب المفرد: ٤١١۔

4 طبرانی فی الاوسط: ٧٤١٩۔ 5 ادب المفرد للبخاری، باب الشحناء: ٤١٣۔

ظلم

ظلم کا لفظ قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، یہاں تک کہ کفروشرک اور عصیان کے معنوں میں بھی کثرت سے آیا ہے، مگر یہاں مراد اس ظلم سے ہے جو بندے بندوں پر کرتے ہیں، قرآن پاک میں اس کے لیے دواور لفظ بَغْیٌ (سرکشی) اور عُدْوَانٌ (تعدی) آئے ہیں، یہ ظلم اسلام کی شریعت میں حرام ہے:

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾

(۷/ الاعراف:۳۳)

''کہہ دے کہ میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ اور حق کے بغیر سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

﴿ وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ﴾ (۱٦/ النحل:۹۰)

''اور اللہ بے حیائی، ناپسندیدہ کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔''

ان دونوں آیتوں میں سرکشی سے مراد حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور ظلم ہے، جس کی روک تھام اگر نہ کی جائے تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن وامان کو برباد کر ڈالے، اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے، اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے، تا کہ لوگ انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں، گو کسی کو تکلیف پہنچانا اچھا نہیں، مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بقدر تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لیے دی گئی، تا کہ یہ برائی آگے نہ بڑھنے پائے، فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴾

(۴۲/ الشوریٰ:۳۹۔۴۰)

''اور جن پر ظلم ہو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا عوض اسی طرح کی برائی ہے۔''

یعنی جیسی برائی کوئی کرے ویسی ہی برائی اس کے ساتھ کی جائے۔

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کر دے، تو مظلوم اپنا انصاف اللہ کے ہاں پائے گا اور ظالم اللہ کی محبت سے محروم رہے گا:

﴿ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۴۰)

''پھر جو کوئی معاف کر دے اور سنوارے، تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔''

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہیں کی جا سکتی۔

﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۴۱)

''اور جو کوئی اپنے ظلم کیے جانے کے بعد بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت کی راہ نہیں۔''

ملامت اس پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرنے میں پہل کرے اور ملک میں ناحق فساد برپا کرے:

﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۴۲)

''راہ ان پر جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق دھوم مچاتے ہیں، ان کے لیے دکھ والی سزا ہے۔''

اگر کوئی کسی کو ظلم سے مار ڈالے تو اس کے ولی کو طلب قصاص کی منصفانہ اجازت دی گئی:

﴿ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴾

(۱۷/ بنی اسرآءیل:۳۳)

''اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث کو ہم نے زور دیا ہے، تو وہ خون کرنے میں زیادتی نہ کرے، بے شبہ اس کو مدد دی جائے۔''

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کی جائے، تاکہ دنیا میں عدل قائم ہو، لیکن مقتول کے وارثوں کو بھی چاہیے کہ انتقام کے جوش میں حد سے آگے بڑھ کر قاتل کے ساتھ اس کے اور عزیزوں اور دوستوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگیں، ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی کبھی ختم نہ ہوگا۔

مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کارروائیوں کو علانیہ بیان کرے، اس کے دو فائدے ہیں، ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے میں کچھ ہچکچائیں گے، دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی، فرمایا:

﴿ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَــهْرَ بِالسُّوْۗءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِـيْمًا ﴾

(۴/ النسآء:۱۴۸)

''اور اللہ کو بری بات کا پکارنا پسند نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سنتا جانتا ہے۔''

اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کو اجازت ملی ہے، سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو اللہ کے قانون کے آگے سرنگوں کریں:

﴿ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَي الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْۗءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾

(۴۹/ الحجرات:۹)

''تو اگر ان میں سے ایک دوسرے پر چڑھ آئے تو سب لڑو اس چڑھائی والے سے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر پھر آئے۔''

یہ تو مسلمانوں کے آپس کی بات تھی، لیکن اگر فریق مخالف کافر ہو تو بھی اس پر زیادتی نہ کی جائے اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کے خلاف کرے تو دوسرے مسلمانوں کو اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیے، فرمایا:

﴿ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۲)

''اور کسی قوم کی دشمنی اس لیے کہ وہ تم کو مسجد حرام سے روکتی تھی، اس جرم پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک وہ سخت سزا والا ہے۔''

اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں مظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا مؤثر حربہ جس کا نام آج کل عدم تعاون اور نان کواپریشن ہے، اسلام نے بہت پہلے پیش کیا ہے اور صاف وصریح حکم دیا ہے کہ گناہ اور ظلم وتعدی کے کاموں میں ظالموں کا ساتھ نہ دیا جائے اور ان کے ظلم کے کاموں میں شریک نہ ہوا جائے، البتہ اس عدم شرکت کی صورتیں زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ ''تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم''۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جا سکتی ہے، مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے؟ فرمایا: ''اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔'' [1] اس طریقہ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالیے، ظالم کی مدد کی ترغیب دلا کر سننے والوں کے دلوں میں توجہ کی خلش پیدا کر دی اور جب بظاہر اس عجیب تعلیم کی طرف وہ بدل و جان متوجہ ہو گئے، تو اس کمال التفات سے فائدہ اٹھا کر آپ ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم کی برائی سے روکا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ یہ حدیث قدسی بڑے مؤثر انداز میں سنائی، فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ اے میرے بندو: میں نے اپنے لیے اور تمہارے لیے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔'' [2]

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا۔'' [3] ظلمات عربی میں اندھیرے کو کہتے ہیں، ظلم اور ظلمات کا مادہ عربی میں ایک ہی ہے، ہماری زبان میں اسی لفظی رعایت کے ساتھ اس کا ترجمہ یوں ہوسکتا ہے کہ اندھیر نہ کیا کرو، کہ قیامت کے دن یہ اندھیرا ہو

[1] صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب اعن اخاك ظالما أو مظلوما: ۲٤٤٤ و صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب نصر الاخ ظالمًا ومظلومًا: ٦٥٨٢۔ [2] صحیح مسلم، باب تحریم الظلم: ٦٥٧٢ ومسند احمد، ج ٥، ص: ١٦٠ وادب المفرد بخاری، باب الظلم: ٤٩٠۔ [3] صحیح مسلم، باب تحریم الظلم: ٦٥٧٦ وصحیح بخاری، کتاب المظالم، باب الظلم ظلمات یوم القیامة: ٢٤٤٧۔

جائے گا، یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہوگی، انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کر بیٹھتا ہے، یہ اندھا پن قیامت کے ہولناک دن میں اندھیرا بن کر نمودار ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، چاہیے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑ دے۔'' [1] براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا اور سات باتوں سے روکا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے۔ [2] حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر جب آپ ﷺ نے یمن بھیجا، تو ان کو نصیحت فرمائی کہ ''مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا، کیونکہ اس کے اور اللہ کے بیچ میں کوئی پردہ نہیں۔'' [3] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی چیز پر ظلم کیا تو اس کو چاہیے کہ آج ہی اس سے پاک ہو لے، اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینار ہوگا نہ درہم، ظلم کے بدلہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظالم کی نیکیاں دلوائی جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم پر لاد دی جائیں گی۔'' [4] فرمایا کہ ''ظالم کو اللہ مہلت دیتا ہے، پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں۔'' [5]

فرمایا: ''اہل ایمان جب دوزخ سے پاک ہو چکیں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل کے پاس روکے جائیں گے، وہاں دنیا میں ایک نے دوسرے پر ظلم کیے تھے، ان کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائے گا، جب اس سے بھی پاک ہو جائیں گے تب ان کو بہشت میں جانے کی اجازت ملے گی۔'' [6]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه: ٢٤٤٢۔ [2] ایضا، باب نصر المظلوم: ٢٤٤٥۔ [3] صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب الاتقاء والحذر من دعوة المظلوم: ٢٤٤٨۔

[4] بخاری، کتاب المظالم، باب من کانت له......: ٢٤٤٩۔ [5] صحیح مسلم، باب تحریم الظلم: ٦٥٨١۔

[6] صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب قصاص المظالم: ٢٤٤٠۔

فخر وغرور

انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں، لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اور لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا ہے، یا کم پایا جاتا ہے، اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں، دنیا میں سب سے پہلے اس بداخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا، اس نے آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکارا:

﴿ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۲)

''میں اس سے بہتر ہوں۔''

وہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا اور فرمایا:

﴿ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا یَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِیْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ۝ ﴾

(۷/ الاعراف:۱۳)

''یہاں سے اتر جا، یہاں تجھے غرور کرنا زیبا نہیں، نکل جا تجھے بڑائی کے بدلہ یہاں ذلت کی چھوٹائی ملی۔''

کبر وغرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے، جس کے لیے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں، بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے، میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن میں تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا: ''نہیں تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔'' [1]

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ بنا دیا۔ پیغمبروں کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے ہیں، جو اپنے آپ کو اور لوگوں سے بڑا سمجھتے ہیں، اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اور غریب اور عام لوگ پیغمبروں کی ہدایت کو قبول کر لیتے:

﴿ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ﴾ (۱٤/ ابراھیم:۲۱)

''اور (قیامت کے دن) سب لوگ اللہ کے روبرو نکل کر کھڑے ہوں گے تو (جو لوگ دنیا

[1] ابوداود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر:٤٠٩٢۔

میں) کمزور (تھے اس وقت) ان لوگوں سے جو بڑی عزت رکھتے تھے، کہیں گے کہ ہم تو تمہارے قدم بقدم چلنے والے تھے، تو کیا (آج) تم عذاب اللہ میں سے کچھ (تھوڑا سا) ہم پر سے ہٹا سکتے ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو بڑی بڑی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے اعیان دولت کے پاس بھیجا، لیکن انھوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول کرنے سے اس لیے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے:

﴿ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۴۶)

''تو وہ سب شیخی میں آ گئے اور وہ تھے (بھی) سرکش لوگ۔''

اسی تکبر کی بنا پر وہ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہو، اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے، ان کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں، اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں:

﴿ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝ ﴾

(۱۱/ ھود:۲۷)

''اس پر ان کی قوم کے سردار جو (ان کو) نہیں مانتے تھے، لگے کہنے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے بشر دکھائی دیتے ہو اور ہمارے نزدیک صرف وہی لوگ تمہارے پیرو ہو گئے ہیں جو ہم میں رذالے ہیں، (اور پیرو ہو بھی گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے اور ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔''

غرض پیغمبروں کی دعوت کے قبول کرنے سے صرف ان ہی لوگوں کو انکار تھا جو اپنے آپ کو مذہبی، قومی، سیاسی یا اور کسی وجہ سے لوگوں سے یا خود پیغمبروں سے بڑا سمجھتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت شدت سے ان لوگوں کی برائی بیان کی ہے اور مختلف الفاظ میں بیان کی ہے، تاکہ کبر و غرور کے تمام مدارج پیش نظر ہو جائیں، عام لفظ تو استکبار اور اس کے مشتقات ہیں، بعض جگہ اس کو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے:

﴿ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝ ﴾ (۳۸/ صٓ:۲)

''لیکن جو لوگ منکر ہیں (ناحق کی) ہیکڑی اور مخالفت میں (پڑے) ہیں۔''

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ جبار اختیار کیا ہے:

﴿ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝ ﴾ (۴۰/ المؤمن:۳۵)

''جتنے مغرور اور سرکش ہیں، اللہ ان کے دلوں پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔''

دو موقعوں پر اس کے لیے مختال کا لفظ آیا ہے، یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو گھمنڈ ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے مغرور اور فخار میری محبت کی عزت سے محروم ہیں:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ﴾ (٤/ النسآء:٣٦)

''اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو مغرور اور فخار ہو۔''

﴿ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ ﴾ (١٦/ النحل:٢٣)

''اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

ان کو جہنم کی خوش خبری بھی یہیں دے دی گئی ہے:

﴿ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْمُتَكَبِّرِينَ ﴾ (٣٩/ الزمر:٦٠)

''کیا جہنم میں مغروروں کا ٹھکانا نہیں۔''

﴿ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ﴾ (٣٩/ الزمر:٧٢)

''تو دوزخ مغروروں کا ٹھکانا ہے۔''

مغروروں کے ساتھ یہ سختی اسی لیے ہے کہ ان کا یہ غرور ان کو حق کے قبول سے باز رکھتا ہے۔

اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے کبر و غرور کے جو ثمرات ظاہر ہوتے ہیں، ان کا کوئی شمار ہی نہیں کیا جا سکتا، مثلاً: ایک متکبر شخص عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں، بلکہ بہت سے لوگوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو، جب لوگوں سے ملتا ہے تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پہلے سلام کریں، راستے میں لوگوں سے آگے چلنا چاہتا ہے، مجلسوں میں صدر بننے کی کوشش کرتا ہے، غرض اس کے ثمرات و نتائج ہزاروں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔'' [1] اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ ''مسلمانوں کے جو مخصوص اخلاق ہیں، وہی جنت کا دروازہ ہیں اور غرور ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے، اس لیے جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا''۔ یعنی دنیا کی طرح آخرت میں بھی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہے گا۔ یہ بداخلاقی چونکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں میں پائی جاتی ہے اور اس کے نتائج گوناگوں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اس لیے ان سب کا استقصا تو مشکل تھا، البتہ شریعت نے اس کے بعض نتائج ظاہر کر دیے ہیں، مثلاً: کبر و غرور کے جو مظاہر امراء و سلاطین سے تعلق رکھتے

[1] ابو داود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الکبر:٤٠٩١۔

ہیں، ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہیں، اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالینا چاہیے“۔ ایک بار آپ ﷺ خود عصا ٹیکے ہوئے نکلے تو صحابہ کرام تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے، فرمایا کہ ”عجمیوں کی طرح تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوا کرو۔“ 1 بڑے آداب والقاب کا اپنے ناموں کے ساتھ اضافہ کرنا، اگر وہ خلاف واقعہ ہوں تو جھوٹ ہے اور اگر واقعہ کے مطابق ہوں تو فخر و غرور کا ذریعہ ہیں، عجمی بادشاہ اپنے آپ کو فخر یہ ملک الملوک اور شہنشاہ کہلاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”سب سے برا نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی اپنے کو ملک الملوک اور شہنشاہ کہلائے۔“ 2

کبر و غرور کی چند عام اور بدنما صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے، مثلاً:

﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۳۷)

”اور زمین میں اکڑ کر نہ چلا کر کیونکہ (اس دھماکے کے ساتھ چلنے سے) تو زمین کو تو پھاڑ نہیں سکے گا اور نہ (تن کر چلنے سے) پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔“

﴿ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴾

(۳۱/ لقمان: ۱۸)

”اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اترا کر نہ چل، بے شک اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جس کو گھمنڈ ہو، فخار ہو۔“

گناہگار کی شان یہ بیان کی ہے:

﴿ ثَانِيَ عِطْفِهِ ﴾ (۲۲/ الحج: ۹)

”اینٹھتا ہوا۔“

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) 3

”جو شخص غرور سے اپنے کپڑے گھسیٹے گا، اللہ اس کی طرف قیامت کے دن نہ دیکھے گا۔“

ایک حدیث میں ہے کہ ”گزشتہ لوگوں میں ایک شخص ایک جوڑا پہن کر اتراتا ہوا نکلا تو اللہ نے زمین کو حکم دیا، جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اس میں دھنسا چلا جا رہا ہے۔“ 4 اس کے برعکس بہت سے افعال ہیں جو تواضع وخاکساری پر دلالت کرتے ہیں اور ان ہی کو اللہ نے اپنی خاص عبودیت کی علامت

1 ابوداود، کتاب الادب، باب الرجل یقوم للرجل: ۵۲۳۰۔ 2 صحیح بخاری، کتاب الادب: ۶۲۰۵، ۶۲۰۶۔ 3 ابوداود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار: ۴۰۸۵۔

4 ترمذی، ابواب صفة القیامة، باب ماجاء فی شدة الوعید للمتکبرین: ۲۴۹۱۔

قرار دیا ہے:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾

(۲۵/ الفرقان:٦٣)

''اور (خدائے) رحمٰن کے (خاص) بندے تو وہ ہیں، جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)۔''

رسول اللہ ﷺ دوزانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے، ایک بدو بھی اس وقت موجود تھا، اس نے کہا، بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: ''اللہ نے مجھ کو شریف بندہ بنایا ہے، متکبر اور سرکش نہیں بنایا ہے''۔ [1]

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے جن کو لوگ مغرور سمجھتے تھے، اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر و غرور کی تردید کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں، حالانکہ میں گدھے پر سوار ہوتا ہوں، کمبل اوڑھتا ہوں اور بکری کا دودھ دوہتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ہے کہ ''جو شخص یہ سب کام کرتا ہے اس میں غرور نہیں پایا جاتا۔'' [2]

کبر و غرور کے اسباب بہت سے ہیں، لیکن عام طور پر دنیادار لوگ جن چیزوں پر غرور کرتے ہیں، وہ یہ ہیں، حسب و نسب، حسن و جمال، مال و دولت، قوت اور اعوان و انصار کی کثرت، اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز فخر و غرور کا ذریعہ نہیں۔

عربوں کے فخر و غرور کا سب سے بڑا ذریعہ حسب و نسب کی برتری کا خیال تھا، اس کو یہ کہہ کر مٹا دیا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ﴾

(۴۹/ الحجرات:١٣)

''لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا اور (پھر) تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں، تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔''

اس کے بعد بتایا کہ شرافت و عظمت کی بنیاد نسب و حسب پر نہیں، بلکہ روحانی فضائل پر ہے:

﴿ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ (۴۹/ الحجرات:١٣)

''اللہ کے نزدیک تم میں بڑا اشریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیز گار ہے۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی مزید تشریح کی اور فرمایا کہ ''خداوند تعالیٰ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا، اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں، مومن پرہیز گار اور بدکار بدبخت، تم لوگ آدم کے بچے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے، لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں، جو جہنم کا

---

[1] ابن ماجه، كتاب الاطعمة، باب الاكل متكئا:٣٢٦٣۔

[2] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الكبر:٢٠٠١۔

کوئلہ ہیں یا اللہ کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹا چلتا ہے۔'' ❶

جہاں تک زیب و زینت اور جسم کی ظاہری آرائش اور پاکیزگی کا تعلق ہے، حسن و جمال کو ایک قابل قدر چیز قرار دیا، چنانچہ ایک خوبرو شخص نے جب آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جوتا عمدہ ہو، تو فرمایا کہ ''اللہ حسن کو پسند کرتا ہے۔'' ❷ یعنی اس کا نام غرور نہیں، البتہ جن صورتوں میں حسن و جمال، غرور و تکبر کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے، چنانچہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے چند اخلاقی نصیحتیں کیں جن میں ایک نصیحت یہ تھی کہ ''تہبند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ کیونکہ یہ غرور کی ایک قسم ہے اور اللہ غرور کو نہیں پسند کرتا۔'' ❸ تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال و دولت کی اہمیت کو قائم رکھا اور اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قوام اور خیر کے لفظ سے کی۔ مال و دولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے، اس کو شہید کا لقب عنایت کیا، لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو فخر و غرور کا ذریعہ بنا لیا جائے تو اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہیں:

﴿ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ ﴾

(۵۷/ الحدید: ۲۰)

''(لوگو!) جانے رہو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشا اور ظاہری زینت اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مال اور اولاد کا خواستگار ہونا، (بس یہی کچھ ہے)۔''

احادیث میں مال و دولت کی برائی جن اسباب کی بنا پر بیان کی گئی ہے، ان میں ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر و غرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بن جاتا ہے، حالانکہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کی جائیں، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم کو مال و دولت کی طلب میں باہمی مسابقت نے غافل کر دیا۔ آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال، حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے، جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا، کھا پی ڈالا اور پہن کر پھاڑ ڈالا۔'' ❹ قوت ایک ایسی چیز ہے، جس کے ذریعہ سے ہر قسم کے تمدنی، مذہبی اور سیاسی کام انجام دیے جا سکتے ہیں، اس لیے اس قسم کے موقعوں پر ایک قابلِ ستائش وصف ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ''قوی امین'' کہا ہے اور حضرت لوط علیہ السلام نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہے:

---

❶ ابو داود، کتاب الادب، باب فی التفاخر بالاحساب: ۵۱۱۶۔

❷ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الکبر: ۱۹۹۹۔

❸ ابو داود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار: ۴۰۸۴۔

❹ ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة الهاکم التکاثر: ۳۳۵۴۔

﴿ قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝﴾ (۱۱/ ھود: ۸۰)

''(لوط) بولے کہ اے کاش (آج) مجھ کو تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔''

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام بنی نوع انسان پر اپنا یہ احسان جتایا ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ﴾ (۳۰/ الروم: ۵۴)

''اللہ (ہی) وہ (قادر مطلق) ہے، جس نے تم لوگوں کو کمزور حالت سے (جو ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے، بنا کھڑا کیا، پھر (بچپن کی) کمزوری کے بعد (جوانی کی) توانائی دی۔''

اور مسلمانوں کو طاقتور بننے اور سامان جنگ سے آراستہ رہنے کا حکم دیا ہے:

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ ﴾ (۸/ الانفال: ۶۰)

''اور (مسلمانو!) سپاہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہو سکے، کافروں کے (مقابلہ کے) لیے ساز و سامان مہیا کیے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے اور (نیز) ان کے سوا دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے (اور) اللہ ان (کے حال) سے (خوب) واقف ہے۔''

قرآن مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ''طاقتور مسلمان اللہ کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے۔'' [1] اگرچہ متعدد حدیثوں میں ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے، تاہم غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ ضعف کی فضیلت نہیں، بلکہ تواضع و خاکساری کی فضیلت ہے، جو ایک قابل ستائش وصف ہے۔ اسی بنا پر بعض حدیثوں میں ضعف کا مقابلہ کبر و غرور کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

((الا اخبركم باهل الجنة كل ضعيف متضعف الا اخبركم باهل النار كل عتل، جواظ متكبر)) [2]

''کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ اس کو کمزور سمجھیں، کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ، بدخو اور مغرور شخص۔''

دوسری حدیث میں ہے:

((احتجت النار والجنة فقالت هذه يدخلني الجبارون المتكبرون وقالت

[1] مسلم، کتاب القدر، باب الایمان بالقدر و الاذعان له: ٦٧٧٤۔

[2] بخاری، کتاب الادب، باب الکبر: ٦٠٧١۔

هذه يد خلني الضعفاء والمساكين)) [1]

''دوزخ اور جنت نے باہم مباحثہ کیا، دوزخ نے کہا: مجھ میں جبار اور متکبر لوگ داخل ہوئے اور جنت نے کہا کہ مجھ میں کمزور اور مسکین لوگ۔''

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ضعف بجائے خود قابل مدح وصف نہیں ہے، بلکہ اس کو صرف اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کا مظہر ہے۔

اعوان وانصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لیے ایک مابہ الامتیاز چیز رہی ہے، بالخصوص غیر متمدن قومیں ہمیشہ کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد پر فخر وغرور کرتی ہیں اور اس فخر وغرور کے نشہ میں دوسروں کو حقیر سمجھتی ہیں، بلکہ اللہ کو بھلا دیتی ہیں، زمانہ سابق میں اسی قسم کا ایک شخص تھا، جس کو اپنی دولت اور اعوان وانصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزیں ہمیشہ قائم رہیں گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی اور اگر آئی بھی تو قیامت میں بھی اس کی یہی شان قائم رہے گی، وہ اس حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے:

﴿ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۝ ﴾ (۱۸/ الکھف: ۳٤)

''میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور (میرا) جتھا (بھی) بڑا زبردست (جتھا) ہے۔''

دوسرا شخص نصیحت آمیز الفاظ میں کہتا ہے کہ ایک حقیر انسان کے لیے اس قدر کبر وغرور جائز نہیں:

﴿ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝ ﴾ (۱۸/ الکھف: ۳۷)

''کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے، جس نے تجھ کو (پہلے) مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا پھر تجھ کو پورا آدمی بنایا۔''

نتیجہ یہ ہوا کہ عذاب الٰہی نے اس کی دولت کو ملیا میٹ کر دیا اور اس کا جتھا ٹوٹ گیا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ناپائیدار چیز فخر وغرور کے قابل نہیں، اہلِ عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ قبیلہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے اور زندوں سے گزر کر مردوں کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے، اس فخر وغرور میں باہم مقابلہ ہوتا تھا اور اس مقابلہ کے لیے ایک خاص لفظ ''تکاثر'' ایجاد ہو گیا تھا، جس نے ان کو دینی امور سے غافل وبے پروا کر دیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سورہ میں انسان کو خطاب کر کے اس پر سرزنش کی:

﴿ اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ ﴾ (۱۰۲/ التکاثر: ۱۔۲)

''تم کو مال اور اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے غافل بنا دیا ہے، یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملتے ہو۔''

لیکن اسی کے ساتھ اسلام میں یہ چیز بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں، بلکہ اجتماعی وتمدنی حیثیت

[1] مسلم، کتاب صفات المنافقین واحکامهم، باب النار یدخلها الجبارون: ۷۱۷۲۔

سے نسلی ترقی ایک قابل فخر چیز ہے، بشرطیکہ فخر وغرور کے بجائے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جائے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم)) [1]

''محبت کیش اور بچے جننے والی عورت سے نکاح کرو، کیونکہ کثرت تعداد میں، میں تم پر دوسری قوموں کے مقابل میں فخر کروں گا۔''

آج تعداد کی اسی اقلیت واکثریت کے مسئلہ نے قوموں اور ملکوں کی سیاست کا رخ بدل دیا ہے اور اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہ تھا۔

[1] ابوداود، کتاب النکاح، باب النھی عن تزویج من لم یلد.....: ۲۰۵۰۔

ریا

ریا کے لغوی معنی دکھاوا اور نمائش کے ہیں، انسانی اعمال کی اصل حقیقت ان کی نیت اور غرض پر مبنی ہے، اس لیے اعمال کی راستی و ناراستی اور اچھائی اور برائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے، صحیح حدیثوں میں ہے کہ

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) [1] ''عمل نیت سے ہے۔''

اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کی غرض و غایت ہی کی بنیاد کو کھوکھلی کر دیتی ہے، جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے۔ نمائش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی برائی کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسن ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا کر کے دکھائے، غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے، کیونکہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ اور نہیں، اسی لیے قرآن نے ان دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی ہے اور ان کی برائی بیان کی ہے، جہاد میں مسلمانوں کو حکم ہوا ہے کہ محض اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمائش تمہاری لڑائی کا مقصد نہ ہو، بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہو، فرمایا:

﴿ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ ﴾ (۸/ الانفال: ۴۷)

''اور ان (کافروں) جیسے نہ بنو، جو مارے شیخی کے اور لوگوں کے دکھانے کے لیے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔''

یہ ریا اور نمائش انسان کے ہر اس عمل میں ظاہر ہوتی ہے، جو خالصۃً لوجہ اللہ نہ کیا جائے، بلکہ اس سے کوئی اور دنیوی غرض مطلوب ہو۔ اسی بنا پر اسلام نے ریا کا نام شرکِ خفی اور شرکِ اصغر رکھا ہے، کیونکہ دنیوی غرض کی آمیزش سے ان اعمال میں اللہ کے ساتھ ایک اور چیز کو شریک کر لیا جاتا ہے، اسی لیے اللہ فرماتا ہے:

﴿ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۴۳)

''کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا اللہ بنا لیا ہے۔''

ایک حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک سے بے نیاز ہوں، تو جو شخص میرے لیے کوئی ایسا عمل کرے جس میں کسی اور کو بھی شریک کرے تو مجھ کو اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ اسی کے لیے ہے، جس کو اس میں شریک کر لیا گیا ہے۔'' [2]

ایک صحابی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ''قیامت کے دن جب اللہ اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی پکارے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل میں جو اللہ کے لیے کیا گیا ہے کسی اور کو شریک کر لیا ہے، وہ اس کا ثواب اسی سے طلب کرے، کیونکہ اللہ شرک سے بے نیاز ہے۔'' [3]

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، کیف کان بدء الوحی: ۱، ۵۴۔

[2] سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الریا والسمعة: ۴۲۰۲۔ [3] ایضا: ۴۲۰۳۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجھ کو اپنی امت کی نسبت شرک کا سب سے زیادہ خوف ہے، لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چاند، سورج اور بتوں کی پرستش کرنے لگیں گے، بلکہ اللہ کے علاوہ اور لوگوں کے لیے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی۔'' [1]

اسلام کے لغت میں کفر کے بعد برائی میں نفاق کا درجہ ہے، نفاق کیا ہے؟ نفاق یہ ہے کہ دل میں کچھ ہو اور زبان سے کچھ کہا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عملِ خیر کی حقیقت ریا اور نمائش کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی ہے، وہ دل سے اللہ کا منکر ہوتا ہے، لیکن خوف وخطر یا دوسرے دنیوی فائدوں کے لیے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجالاتا ہے، اس لیے قدرتی طور پر ان اعمال میں ریاکاری پائی جاتی ہے، اس بنا پر قرآن مجید میں جابجا اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ﴾ (٢/ البقرة:٢٦٤)

''مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور (سائل کو) طعن دے کر اس شخص کی طرح اکارت مت کرو، جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت کا یقین نہیں رکھتا۔''

منافقوں کے ریاکارانہ اعمال کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ ان کا مقصد ایک جماعت میں شامل رہنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں پر اثر ڈالنا اور ان کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ پہلا مقصد چونکہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے، اس لیے وہ نہایت بے پروائی، غفلت اور کاہلی کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں، اس کے برعکس دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے مصنوعی خشوع وخضوع، للّٰہیت اور محویت واستغراق کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔

عہدِ رسالت میں منافقین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہیں، اس لیے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پروائی کے ساتھ ادا کرتے تھے، تاکہ لوگ اس ظاہری نمائش سے ان کو مسلمان سمجھتے رہیں، اسی لیے ایسے شخص کے عمل میں للّٰہیت اور خلوص نہیں پیدا ہوسکتا:

﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَاۗءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ (٤/ النسآء:١٤٢)

''منافق، (مسلمانوں کو دھوکا دے کر گویا) اللہ کو دھوکا دیتے ہیں، حالانکہ (حقیقت میں) اللہ

[1] سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الرياء والسمعة: ٤٢٠٥۔

ان ہی کو دھوکے میں رکھتا ہے اور (یہ لوگ) جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو الکساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں، (ظاہرداری کرکے) لوگوں کو دکھاتے ہیں اور (دل سے) اللہ کو یاد نہیں کرتے، مگر کچھ یوں ہی سا۔“

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ ﴾

(۱۰۷/ الماعون:۴۔۶)

”تو ان (منافق) نمازیوں کی (بڑی) تباہی ہے، جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت کرتے ہیں اور جو (کوئی نیک عمل کرتے بھی ہیں تو) ریا کرتے ہیں۔“

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہ رضی اللہ عنہم مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ آ نکلے اور فرمایا: ”کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟“ صحابہ نے کہا، ہاں۔ فرمایا: ”شرک خفی اور یہ کہ آدمی نماز کے لیے کھڑا ہو اور اس کو زیب و زینت کے ساتھ ادا کرے، اس لیے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے۔“ [1]

چونکہ ریا اور نمائش اعمال کی اصلی شکل وصورت ہی کو بگاڑنا چاہتی ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اس کے ایک ایک ریشہ کی بیخ کنی ضروری سمجھی اور اپنی امت کو اس کی ہر گھات سے آگاہ فرمایا، چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریاکاری کی جو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے ان سب کی ممانعت فرمائی، مثلاً: ان میں پہلی چیز تو داد و دہش ہے، جو عام طور پر نیک نامی، شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، بالخصوص عرب کے فضائل اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی اور لوگ محض نام و نمود کے لیے اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے تھے، اسلام نے صدقہ وخیرات کا حکم دیا تو اس بداخلاقی کے ظاہر ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا، اس لیے قرآن وحدیث میں باقاعدہ زکوٰۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ وخیرات مخفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی، تاکہ اس میں ریاکاری کی آمیزش نہ ہونے پائے:

﴿ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۱)

”لوگو! اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا (کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اس کو چھپاؤ اور حاجت مند کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے (کہ اس میں نام ونمود کا دخل نہیں ہونے پاتا)۔“

ایک حدیث میں ہے کہ ”قیامت کے دن جب کہ اللہ کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا، اللہ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا، جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے

[1] ابن ماجہ، ابواب الزھد، باب الریاء والسمعۃ:۴۲۰۴۔

بائیں ہاتھ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا۔" ❶

عرب کے محاسنِ اخلاق میں سب سے زیادہ نام و نمود کی جو چیز تھی وہ شجاعت تھی اور اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمانوں کے لیے اظہارِ شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا، اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے اور بھی بہت سے ذاتی اور دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، اس لیے وہ ریا کاری کی نمائش گاہ بن سکتا تھا، لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض سے پاک کر کے مسلمانوں کو اس کی اصلی حقیقت بتائی۔ چنانچہ ایک بدو نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لیے، ایک شخص دولت کے لیے اور ایک شخص اظہار شجاعت کے لیے لڑتا ہے، تو ان میں کس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے، فرمایا: "اس شخص کا جو اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔" ❷

آپ ﷺ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہار شجاعت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص قومی حمیت سے اور ایک شخص ریا سے جہاد کرتا ہے، تو کس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے، وہی پہلا جواب ملا۔ ❸

ریا کاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہے اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی، اس لیے اس میں ریا کاری کی جو آمیزش ہو سکتی تھی، اس کے نتائج بد رسول اللہ ﷺ نے نہایت مؤثر طریقے سے بتائے۔ ایک حدیث میں ہے کہ "سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا جس نے شہادت حاصل کی، یہ شخص اللہ کے سامنے لایا جائے گا اور اللہ اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھے گا کہ تم نے ان سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا اور شہید ہوا، اللہ کہے گا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم صرف اس لیے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے، اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا، لوگوں کو علم سکھایا اور قرآن پڑھا۔ اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا اور وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے علم سیکھا، علم سکھایا اور تیرے لیے قرآن پڑھا، ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم نے علم اس لیے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ، قرآن اس لیے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ، پھر اسی طرح وہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اس کے بعد ایک دولت مند شخص لایا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا، وہ کہے گا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھ کو پسند تھے، میں نے سب میں اپنا مال صرف کیا، ارشاد ہوگا جھوٹ بکتے ہو، تم نے یہ سب صرف اس لیے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہیں، پھر اسی طرح اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ ❹

❶ بخاری، كتاب الزكوٰة، باب الصدقة باليمين: ١٤٢٣۔

❷ مسلم، كتاب الامارة، باب من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله: ٤٩١٩۔

❸ ايضًا: ٤٩٢٠۔ ❹ ايضًا، باب من قاتل للرياء والسمعة...... : ٤٩٢٣۔

خود بینی اور خود نمائی

خود بینی، خود نمائی اور خود رائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے، اس میں اور کبر میں یہ فرق ہے کہ کبر ایک اضافی چیز ہے، یعنی متکبر آدمی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے، لیکن خود بینی کے لیے تنہا انسان کی ذات کافی ہے، یہاں تک کہ اگر ایک انسان تنہا پیدا ہو تب بھی وہ اپنے اوصافِ کمالیہ پر غلط ناز کر سکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیاں نظر آتی ہیں، وہ ان پر کبھی ایسا فریفتہ ہو جاتا ہے کہ اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہے اور یہ تمام کمالات اور خوبیاں اس کو ایسی معلوم ہوتی ہیں، گویا وہ خود اس کی اختیاری ہیں اور اسی کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں، اسی کا نام عجب اور خود بینی ہے، اسی سے نفس میں خود نمائی اور خود رائی پیدا ہوتی ہے اور اکثر حالتوں میں وہ کبر و غرور کا سبب بن جاتی ہے۔

حنین کی لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد کافروں سے زیادہ تھی، یہ دیکھ کر مسلمانوں میں عجب پیدا ہوا کہ اب کون ہمارا مقابلہ کر سکتا ہے؟ اللہ کو ان کی یہ شان پسند نہ آئی، فوراً شکست کا اثر دکھائی دینے لگا، اب مسلمانوں کا یہ عجب دور ہوا، تب نصرت الٰہی نے ان کے پاؤں تھام لیے اور شکست فتح سے بدل گئی، اللہ نے فرمایا:

﴿ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا ﴾ (۹/ التوبۃ:۲۵)

’’اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تم میں خود بینی پیدا کر دی، تو اس کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا۔‘‘

اسی لیے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جہاد کو نکلیں تو ان میں جھوٹا غرور اور خود بینی اور نمائش نہ پیدا ہو، بلکہ ان میں سے ہر ایک اخلاص اور ایثار کا پیکر ہو:

﴿ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ ﴾ (۸/ الانفال:۴۸)

’’اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھاتے نکلے۔‘‘

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوت کی نمائش کو نکلے تھے۔

جب کسی قوم میں تمدن کی وسعت، دولت کی بہتات اور خوشحالی عام ہو جاتی ہے تو افراد میں خود غرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے، نہ اللہ کا فرض یاد رہتا ہے اور نہ بندوں کا حق۔ ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھمنڈ میں رہتا ہے اور یہی ان کی تباہی کا وقت ہوتا ہے، فرمایا:

﴿ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۖ ﴾ (۲۸/ القصص:۵۸)

’’اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کر دیں، جب وہ اپنے گزران میں اترا کر چلیں۔‘‘

یہ تو چند بستیوں کی تباہی کا حال تھا، لیکن ایک وقت آئے گا جب ساری دنیا ایک ساتھ برباد ہو جائے گی، یعنی قیامت آئے گی، تو اس بربادی کے دن کی جو نشانیاں آنحضرت ﷺ نے بتائی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ’’جب ہر شخص کو اپنی ہی رائے بھلی معلوم ہو گی اور اسی پر ناز کرے گا اور اترائے گا اور یہی وہ

موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہیے۔'' ❶

مذہبی حیثیت سے جن لوگوں کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہے، ان کو اسی عجب وخود بینی کی بنا پر اپنی پرہیز گاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعلی کی ممانعت فرمائی ہے:

﴿ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴾ (۵۳/ النجم:۳۲)

''تم (بہت) اپنی پاکیزگی نہ (جتایا) کرو، پرہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہے۔''

قدیم مذہبی اور علمی شرف نے یہود نصاریٰ میں عجب وخود بینی کا اس قدر مادہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے:

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۸)

''اور یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔''

﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَاۗءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ ﴾ (۶۲/ الجمعۃ:۶)

''(اے پیغمبران یہودیوں سے) کہو کہ اے یہودیو! اگر تم کو اس بات کا گھمنڈ ہے کہ اور تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی اللہ کے چہیتے ہو۔''

ان تمام آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عجب وخود بینی ایک فریب کا نام ہے اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہ تھی، لیکن معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی میں چاک ہو جاتا ہے، مگر مذہبی حیثیت سے آخرت میں چاک ہوگا۔

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے، اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا ہے۔ حدیث میں ہے، کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ ''تم نے اس کو ہلاک کر دیا''۔ ❷ ایک بار آپ ﷺ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم نے اس کی گردن کاٹ لی اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہے تو یہ کہو کہ میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں۔'' ❸ مدح کی یہ ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ اس سے ممدوح میں عجب وخود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

لیکن اس بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور عطیہ سمجھے۔ اسی لیے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے، فرمایا:

﴿ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲۵)

''اللہ نے جو دیا ہے، اس پر اتراؤ نہیں۔''

---

❶ ابوداود، کتاب الملاحم، باب الامر و النهی:۴۳۴۲۔

❷ بخاری، کتاب الادب، باب مایکره من التمادح: ۶۰۶۰۔ ❸ ایضا:۶۰۶۱۔

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے، چونکہ اسلام عرب میں آیا اور عربوں کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک تھی، اس لیے تمام مذہبوں میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے فضول خرچی کو روکا ہے اور انسان کو اپنی حد میں رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بری طرح برباد ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور اس بے موقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، نیز فضول خرچی عموماً فخر وغرور اور نمائش کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے اور ان بداخلاقیوں کی برائی چھپی نہیں۔

اہلِ عرب جب جلسوں میں شراب پیتے اور جوا کھیلتے تو جوا میں جو کچھ جیتتے، نشہ کے ترنگ میں اسی وقت لٹا دیتے، جانور ملتے تو اسی وقت بے وجہ ذبح کر ڈالتے، جاہلیت کی شاعری میں اس قسم کے فخریہ اشعار باکثرت ہیں، شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دو شخص فیاضی کے اظہار کے لیے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے، یہاں تک کہ دونوں میں ایک کے تمام اونٹ ختم ہو جاتے تھے، تو وہ اپنے حریف کے مقابل میں مغلوب سمجھا جاتا تھا، اس کو معاقرہ کہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس ریائی فیاضی کو روک دیا۔ [1]

اہلِ عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر وغرور اور نام ونمود پر قائم تھی اور اس نے ان کی فیاضی میں بے اعتدالی پیدا کر دی تھی، اسی کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے نہ ہونے سے وہ اللہ کے نزدیک مقبول نہ تھی اور دنیوی حیثیت سے بعض اوقات وہ تمام مال ودولت کو اڑا کر خود مفلس اور قلاش ہو جاتے تھے، پھر اس قسم کی فیاضی کے لیے جائز مال کافی نہیں ہوتا تھا، تو وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے اور نمائش کے موقعوں پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے، اس بے اعتدالی کے دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حقوق مقرر فرمائے اور فضول خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا:

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۲۶۔۲۷)

''اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر (ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو اور (دولت کو) بے جا مت اڑاؤ (کیونکہ دولت کے) بے جا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔''

آیت کے اخیر ٹکڑے سے ثابت ہوتا ہے کہ فضول خرچی اللہ کی ناشکری ہے، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''بعض علما کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہل عرب کی عادت کے موافق ہے، کیونکہ وہ لوگ لوٹ

[1] ابوداود، کتاب الضحایا، باب ماجاء فی اکل معاقرۃ الاعراب: ۲۸۲۰۔

مار سے مال جمع کرتے تھے، پھر اس کو فخر وغرور کے حاصل کرنے کے لیے صرف کرتے تھے۔“ ❶

آج بھی جو لوگ شادی بیاہ اور خوشی وغم کی تقریبوں میں اس قسم کی فضول خرچیوں کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ قرآن کی اصطلاح میں شیطان کے بھائی کہلائیں گے، یہ تعلیم فیاضی کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ فیاضی بخل واسراف کے درمیان کا نام ہے اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور بتادیا ہے کہ فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مفلس اور تہی دست ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے، بلکہ الٹے تمہیں کو لوگ قابل ملامت ٹھہرائیں گے:

﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۲۹)

”اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑو کہ (گویا) گردن میں بندھا ہے اور نہ بالکل اس کو پھیلا ہی دو (ایسا کرو گے،) تو تم ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی کریں گے، (اور) تم تہی دست بھی ہو گے۔“

کیونکہ یہ اعتدال کا وصف خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسکو مسلمانوں کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۷)

”اور خرچ کرنے لگیں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں، بلکہ ان کا خرچ افراط اور تفریط کے درمیان بیچ کا ہو۔“

کوئی اس تعلیم کا یہ نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بدحیثیتی پسند کرتا ہے اور کھانے، پینے، پہننے اور اوڑھنے میں ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہے، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے اندر رہنا چاہیے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہیں کرنا چاہیے، مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی فضول خرچی کا معیار خود اسی کی اپنی ذات ہے، سورۂ اعراف میں اللہ فرماتا ہے:

﴿ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۳۰)

”اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔“

صدقات اور مبرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہیں، مگر اس میں بھی بعض مفسروں کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہیں۔

﴿ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ ﴾

(۶/ الانعام:۱٤۱)

”درخت کے پھل سے جب وہ پھل تم کھاؤ اور اس کا حق ادا کرو جب فصل کٹے اور حد سے آگے نہ بڑھو، اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

---

❶ تفسیر کبیر، بهامشه تفسیر ابی السعود، ج ٥، ص: ٥٧٧۔

حسد

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے، مثلاً: اس کو علم وفضل، مال ودولت، عزت وشہرت یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے، تو ان چیزوں کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک ومنافست کہتے ہیں اور یہ کوئی بداخلاقی نہیں، بلکہ دینی امور میں پسندیدہ ہے، لیکن اگر وہ ان چیزوں کو دوسرے کے لیے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ اللہ کی نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو اسی کا نام حسد ہے اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے، کیونکہ عہد رسالت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا خاص احسان یہ کیا تھا کہ ان کو قرآن وایمان کی دولت عطا فرمائی تھی، جس کو دیکھ کر مسلمانوں کے حاسد یعنی یہود جلے مرتے تھے:

﴿ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ﴾ (٤/ النسآء:٥٤)

''یا اللہ نے جو اپنے فضل سے لوگوں کو نعمت (قرآن) عطا فرمائی ہے اس پر جلے مرتے ہیں۔''

اور ان کی یہ خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانوں سے چھین لی جائے:

﴿ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم ﴾

(٢/ البقرة:١٠٩)

''(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں۔''

حسد کی تین قسمیں ہیں:

① یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کر لی جائے، گو وہ اس کو نہ حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے، حسد کی مذموم ترین قسم یہی ہے اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی ان کی طرح کافر ہو جائیں:

﴿ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً ﴾ (٤/ النسآء:٨٩)

''ان منافقوں کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہو گئے ہیں، اسی طرح تم (سچے مسلمان) بھی کفر کرنے لگو (اور وہ) اور تم (سب) ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔''

② دوسرے یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہو جائے، اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے، لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے، اس کو مل نہیں سکتی، اس لیے بالفرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

③ تیسرے یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے، لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسرے

سے سلب کر لی جائے۔

ان میں پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے، دوسری صورت میں چونکہ زوال نعمت بالذات مقصود نہیں ہوتا، اس لیے اس کو حقیقی معنوں میں حسد تو نہیں کہہ سکتے، تاہم قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ ﴾ (٤/ النسآء:٣٢)

''اور اللہ نے جو تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے، اس کا کچھ ارمان نہ کرو۔''

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی چیز اگر کسی کو حاصل ہو بعینہٖ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے، اس لیے یہ بھی مذموم ہے، البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہیں، اسی لیے فرمایا:

﴿ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ ﴾ (٤/ النسآء:٣٢)

''اور اللہ سے اس کا فضل مانگو۔''

تیسری صورت بالکل مذموم نہیں بلکہ دینی امور میں مستحسن ہے اور شریعت میں اسی کو مسابقت کہتے ہیں، حسد کے سات اسباب ہیں۔

① بغض وعداوت، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک دشمن کی برائی اور بھلائی دونوں یکساں ہوں، اس لیے ایک دشمن کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، اس کی بجائے اللہ اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا اور اسی کا نام حسد ہے۔

کفار اور منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جو عداوت تھی، وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی تھی:

﴿ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ ﴾ (٣/ آل عمران:١١٨)

''چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے، دشمنی تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور (غیظ وغضب) جو ان کے دلوں میں (بھرے) ہیں، وہ (اس سے بھی) بڑھ کر ہیں۔''

﴿ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۖ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ ﴾ (٣/ آل عمران:١٢٠)

''(مسلمانو)! اگر تم کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔''

بغض وعداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے، اس کے لیے مساوات شرط نہیں، بلکہ ایک ادنیٰ آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص کا بدخواہ ہو سکتا ہے۔

② حسد کا دوسرا سبب ذاتی فخر کا غلط خیال ہے، کیونکہ امثال واقران میں جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گزرتا ہے اور وہ اس کے اس ترفع کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب اس سے چھن جائے، تاکہ وہ ان کے مساوی ہو جائے۔

③ حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع ومنقاد بنانا چاہتا ہے، اس لیے جب وہ کسی شرف وامتیاز کی وجہ سے اس کے حلقہ اطاعت سے نکل جاتا ہے، تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا رہے، تاکہ وہ اس کا مطیع ومنقاد ہو سکے، کفار قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی حقیر جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے:

﴿ اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ ﴾ (٦/ الانعام :٥٣)

''کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے (اسلام کی توفیق دے کر) اپنا فضل کیا ہے۔''

حسد کا یہ سبب اکابر واشراف سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے لیے کبر وغرور اور دوسروں کی تحقیر وتذلیل لازمی ہے۔

④ حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنی پندار میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں اس کو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہو جاتا ہے، تو ان کو تعجب ہوتا ہے اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہیں، کفار اسی وجہ سے پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے اور تعجب سے کہتے تھے:

﴿ اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ ﴾ (١٧/ بنی اسرآئیل: ٩٤)

''کیا اللہ نے آدمی (کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا ہے۔''

⑤ حسد کا پانچواں سبب یہ ہے کہ جب دو شخصوں کا ایک مقصد ہوتا ہے تو دونوں باہم ایک دوسرے کو رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں جب ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہو جاتا ہے، ایک شوہر کی متعدد بیویوں اور ایک باپ کے متعدد بیٹوں میں جو رشک وحسد ہوتا ہے، اس کی وجہ یہی ہوتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی، اس کا سبب یہی تھا:

﴿ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ ﴾ (١٢/ یوسف:٨)

''جب یوسف کے (بے ماں) بھائیوں نے (آپس میں) کہا کہ باوجودیکہ ہم (حقیقی) بھائیوں کی بڑی جماعت ہے، تاہم یوسف اور اس کا (حقیقی) بھائی (بن یامین) ہمارے والد کو ہم سے البتہ بہت ہی زیادہ عزیز ہیں۔''

⑥ حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے، اس لیے جو لوگ اس حیثیت سے یگانۂ روزگار ہونا چاہتے ہیں، جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس میں ان کا شریک وسہیم ہو گیا ہے، تو یہ ان کو سخت گراں گزرتا ہے اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف وامتیاز سے دوسرا شخص جاہ ومنزلت میں ان کا شریک ہو گیا ہے وہ اس سے چھن جائے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہود اسی لیے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوق حاصل تھا، لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفوق جاتا رہا، اس لیے وہ اسلام ہی کی بیخ کنی پر

آمادہ ہو گئے، منافقین میں عبداللہ بن ابی کو اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے، لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمہ کر دیا، اس لیے اس کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک مجمع میں وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا۔ ❶

⑦ حسد کا ساتواں سبب خبثِ نفس اور بد طینتی ہے، کیونکہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو ان کو مسرت ہوتی ہے، اس صورت میں حسد کے پیدا ہونے کے لیے اشتراک، رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس قسم کے خبیث النفس لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہیں۔

حسد کے یہ اسباب زیادہ تر ان لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں کوئی چیز مابہ الاشتراک ہوتی ہے، اس لیے بیگانوں میں یہ جذبہ نہیں ہوتا، بلکہ صرف ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جن میں باہم رابطہ واشتراک ہوتا ہے۔ ایک عالم دوسرے عالم پر، ایک عابد دوسرے عابد پر اس لیے حسد کرتا ہے کہ ان میں ایک چیز یعنی علم وعبادت مشترک ہے، اس کے بخلاف ایک عالم یا کسی عابد کو کسی تاجر پر حسد نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں کوئی چیز مابہ الاشتراک نہیں۔

اسلام نے مسلمانوں میں باہم اخوت کا رشتہ قائم کر کے نہایت وسیع اور عالمگیر اشتراک پیدا کر دیا تھا، اس لیے ان میں حسد کا جذبہ نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہو سکتا تھا اور حسد کے جس قدر اسباب ومراتب ہیں وہ سب کے سب اس وسیع برادری میں جمع ہو سکتے تھے، اس لیے اصولاً جو بداخلاقیاں اس اخوت کا شیرازہ برہم کر سکتی تھی، رسول اللہ ﷺ نے ان سب سے مسلمانوں کو بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

((ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا ولا تباغضوا وکونوا عباداللّٰه اخوانا)) ❷

''بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے، نہ لوگوں کے عیوب کی ٹوہ لگاؤ، نہ باہم حسد کرو، نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو، نہ باہم بغض رکھو، بلکہ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔''

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح میں قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

المعنی کونوا کاخوان النسب فی الشفقة والرحمة والمحبة والمواساة والمعاونة والنصیحة۔ ❸

''اس کے معنی یہ ہیں کہ رحم وشفقت، غم خواری، محبت، اعانت اور خیر خواہی میں نسبی بھائیوں کی

❶ بخاری، کتاب الاستئذان، باب التسلیم فی مجلس فیه اخلاط من المسلمین والمشرکین: ٦٢٥٤۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ماینھی عن التحاسد والتدابر: ٦٠٦٤۔

❸ فتح الباری، کتاب الادب، باب ماینھی عن التحاسد والتدابر، ج ١٠، ص: ٤٠٣۔

طرح ہو جاؤ۔“

لیکن یہ اخوت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے، جب ان تمام بداخلاقیوں سے احتراز کیا جائے، ورنہ اس کے بجائے دشمنی پیدا ہو جائے گی اور یہ اس قسم کے تمام محاسنِ اخلاق جو اخوت کا لازمی نتیجہ ہیں یا ان سے اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے فنا ہو جائیں گے، چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

کانہ قال اذاترکتم ھذہ المنھیات کنتم اخوانا و مفھومہ اذالم تترکوھا تصیروا اعداء و معنی کونوا اخوانا اکتسبوا ماتصیرون بہ اخوانا مما سبق ذکرہ وغیر ذلک من الامور المقتضیۃ لذلک نفیاواثباتا۔ ❶

”گویا رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جب تم لوگ ان منہیات کو چھوڑ دو گے تو بھائی بھائی ہو جاؤ گے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب ان کو نہ چھوڑو گے تو دشمن ہو جاؤ گے اور بھائی بھائی بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اخلاقی خوبیاں حاصل کرو، جن کی وجہ سے بھائی بھائی بن جاؤ اور یہ اخلاقی خوبیاں وہ ہیں، جن کا ذکر اوپر گزرا اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جو اخوت کو نفیاً یا اثباتاً پیدا کرتے ہیں۔“

ان بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے، کیونکہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے بمشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ”کوئی شخص شگون، بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا۔“ کہا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے، فرمایا: ”شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرنا چاہتے ہو، اس کی وجہ سے اس کو مت چھوڑ دو اور جب بدگمانی پیدا ہو تو اس کو سچ مت سمجھو اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ“ ❷ لیکن اگر عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہوا تو اسلام کے تمام محاسنِ اخلاق کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ شرارہ خرمنِ اسلام کو پھونک کر خاکِ سیاہ کر دے گا، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

((ایاکم والحسد فان الحسد یاکل الحسنات کما تأکل النار الحطب)) ❸

”تم لوگ حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اور ہر مسلمان کو اس کے خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے:

﴿ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝ ﴾ (۱۱۳/ الفلق ۵)

”اور برا چاہنے والے کی بدی سے جب وہ حسد کرنے لگے۔“

---

❶ ایضاً۔ ❷ مصنف عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری، کتاب الادب، باب ما ینھی عن التحاسد، ج ۱۰، ص: ۴۰۲ مصر۔ ❸ ابوداود، کتاب الادب، باب فی الحسد: ۴۹۰۳۔

فحش گوئی

فحش گوئی کی مختلف قسمیں ہیں، ایک قسم تو قوتِ شہوانیہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے مرتکب زیادہ تر رند، بے باک، نوجوان اور بے تکلف دوست واحباب ہوتے ہیں، مثلاً: جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں، تو عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر ہوتا ہے اور اس سلسلے میں اس قسم کے حالات وواقعات بیان کیے جاتے ہیں، جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

عربی زبان میں اس قسم کی فحش گوئی کو رفث کہتے ہیں اور قرآن مجید کی اس آیت میں

﴿ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۷)

''حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہیے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی۔''

اس کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن زمانہ حج کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ اس زمانہ میں مردوں اور عورتوں کا عام اجتماع ہوتا ہے اور اس سفر میں پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے، اس لیے اس قسم کے چرچے نہایت آزادی کے ساتھ کیے جاسکتے ہیں، حالانکہ یہ زمانہ ذکرِ الٰہی کا ہوتا ہے، ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہیں، بلکہ اسلام میں عام طور پر اس قسم کی فحش گوئی ممنوع ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور مردوں کے ایک [1] مجمع میں خطبہ دیا اور حمد و ثنا کے بعد مردوں کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ ''کیا تم میں کوئی آدمی ہے جو اپنی بی بی کے پاس جاتا ہے تو دروازہ بند کر لیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس طرح اللہ کے پردے میں چھپ جاتا ہے؟'' لوگوں نے کہا: ہاں۔ پھر فرمایا کہ ''اس کے بعد لوگوں کی صحبتوں میں بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا''۔ اس پر سب لوگ خاموش رہے، پھر عورتوں کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ ''کیا تم سب اس قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟'' اس پر ایک عورت نے دوزانو بیٹھ کر کہا کہ ہاں مرد اور عورت دونوں اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ فرمایا: ''تم لوگ جانتے ہو کہ اس کی کیا مثال ہے؟ اس کی مثال اس چڑیل کی ہے جو گلی میں ایک شیطان سے ملی اور اس نے اس سے مباشرت کی، حالانکہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے۔'' [2] مقصود یہ ہے کہ علانیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونوں کی بے شرمی کی صورت یکساں ہے، اس فحش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدودِ الٰہی کی حرمت کا تخیل ہر حال میں برقرار رہے، ورنہ جب باتیں زبانوں پر آئیں گی تو وہ اپنی اہمیت کھودیں گی اور قول، عمل کے لیے ایک دن راستہ صاف کر دے گا، یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتوں کے بیان کے لیے جب ناگزیر ضرورتیں پیش آتی ہیں تو مجاز و استعارہ کی زبان میں ان کو ادا کیا جاتا ہے، تاکہ مدعا ظاہر ہو اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے،

---

[1] دونوں کی نشستیں الگ تھیں۔ ''س''

[2] ابوداود، کتاب الطلاق، باب مایکرہ من ذکر الرجل مایکون من اصابتہ اھلہ:۲۱۷٤۔

چنانچہ قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات مجاز و استعارہ ہی کے پردہ میں بیان کیے گئے ہیں، مثلاً:

﴿ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ ﴾ (٤/ النسآء:٢١)

''حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے (یعنی میاں بی بی، ہم صحبت ہو چکے)۔''

﴿ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ ﴾ (٤/ النسآء:٤٣)

''یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو (یعنی ان سے صحبت کی ہو)۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اللہ شرمیلا اور شریف ہے، اسی لیے اس نے جماع کو کنایۃً لمس (چھونے) کے لفظ سے بیان کیا ہے، اسلام نے اس کے لیے اور جو الفاظ پیدا کیے ہیں، جو فقہی مسائل کی تشریح میں مجبوراً آتے ہیں، گو وہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہیں، لیکن درحقیقت وہ سب کے سب کنایے اور استعارے ہیں، اسلامی تعلیمات کے مطابق پائخانہ، پیشاب اور دوسرے نفرت انگیز اور شرمناک امراض...... کا ذکر بھی کنایۃً کرنا چاہیے، پائخانہ اور پیشاب کے لیے احادیث میں ''قضائے حاجت'' کا لفظ مستعمل ہے، جو ایک کنایہ ہے، قرآن مجید میں اس کے لیے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں۔

﴿ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ ﴾ (٤/ النسآء:٤٣)

''یا تم میں سے کوئی پست زمین سے (ہو کر) آیا ہو''

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لیے پست زمین کو پسند کرتے ہیں، اس لیے استعارۃً اس سے پائخانہ مراد لیا گیا۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پائخانہ بھی ایک استعارہ ہے، جس کی اصل پائیں خانہ ہے، چونکہ پائخانے عموماً مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں، اس لیے استعارۃً ان کو پائیں خانہ کہا گیا، پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پائخانہ ہو گیا اور اب کثرت استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے برص کی تعبیر سوء کے لفظ سے کی ہے، جس کے معنی برائی یا عیب کے ہیں:

﴿ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴾

(٢٠/ طٰہٰ:٢٢)

''اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنی بغل میں رکھ لو (اور پھر نکالو) تو وہ بدوں اس کے کسی طرح کا روگ ہو، سفید (براق) نکلے گا (اور یہ) دوسرا معجزہ ہے۔''

فحش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوت غضبیہ سے ہے، جس کا نام سب و شتم یا گالی گلوچ ہے اور یہ صورت عموماً جنگ و جدل کے موقع پر پیش آتی ہے، زمانہ حج میں چونکہ عام اجتماع ہوتا ہے اور اس حالت میں لڑائی

جھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک عام لفظ ''فسق'' سے اس کی ممانعت کی ہے:

﴿ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۷)

''حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہیے، نہ فسق کی، نہ جھگڑے کی۔''

گالی گلوچ کی مختلف صورتیں ہیں، بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو برا بھلا کہتا ہے، اس کے نسب میں عیب نکالتا ہے، کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض مثلاً: برص یا جذام میں مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے، بعض حالتوں میں اگر اس نے کوئی برا کام کیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی برا برتاؤ کیا گیا ہے، تو اس کا اظہار کرتا ہے۔

قرآن مجید نے اجمالی طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہے:

﴿ لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَن ظُلِمَ ۚ ﴾ (٤/ النسآء:١٤٨)

''اللہ کو بری بات کا پکار کر کہنا پسند نہیں، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، (وہ ظلم کو برملا بیان کر سکتا ہے)۔''

قرآن وحدیث میں جابجا بدزبانی سے بچنے کے حکم ومصالح نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں:

① ایک مصلحت یہ ہے کہ گالی گلوچ میں لوگ عموماً تعدی کرتے ہیں، یعنی اگر ایک شخص ایک گالی نکالتا ہے تو دوسرا دو دیتا ہے۔ اگر ایک شخص کسی کے باپ کو برا کہتا ہے تو دوسرا اس کے باپ ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے، اس لیے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کو گالی نہ دی جائے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں یہی نکتہ بیان کیا ہے:

﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ ﴾

(٦/ الانعام:١٠٨)

''اور (مسلمانو)! اللہ کے سوا دوسرے جن معبودوں کو یہ پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ (بھی) نادانی سے بڑھ کر اللہ کو برا کہہ بیٹھیں گے۔''

اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا کہ ''سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ پر لعنت بھیجے۔'' کہا گیا کہ یارسول اللہ! کوئی اپنے باپ ماں پر کیونکر لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا: ''اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ اس کے باپ ماں دونوں کو برا بھلا کہے گا۔'' [1]

② بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں اور حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ سے ملنے آیا، آپ ﷺ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ ''اپنے قبیلہ میں یہ نہایت برا آدمی ہے''۔ لیکن جب وہ آپ ﷺ کے پاس بیٹھا تو آپ ﷺ اس سے

[1] بخاري، كتاب الادب، باب لا يسب الرجل والديه:٥٩٧٣۔

نہایت خندہ پیشانی سے ملے، جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ جب آپ نے اس کو دیکھا برا کہا، پھر اس سے نہایت لطف ومحبت کے ساتھ ملے، فرمایا: ''عائشہ! تم نے مجھ کو بدزبان کب پایا؟ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے برا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔'' ❶

③ بدزبانی دورِ وحشت وجہالت کی یادگار اور تہذیب وشائستگی کے خلاف ہے۔ ایک بار حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی، رسول اللہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: ''تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔'' ❷ امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں۔ ❸

④ رفق وملاطفت اور شرم وحیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے، لیکن بدزبانی ان کے بالکل مخالف ہے۔ ایک بار کچھ یہود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بجائے السام علیکم۔ تم کو موت آئے۔ کہا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں کہا عَلَيْكُمْ وَلَعَنَكُمُ اللّٰهُ وَغَضَبُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔ تم کو موت آئے، اللہ تم پر لعنت بھیجے اور تم پر اللہ کا غضب نازل ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ ''اے عائشہ! نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے بچو۔'' ❹

⑤ گالی گلوچ کی ممانعت کا ایک نہایت دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بےشرمی اور بےحیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے اور سنایا جاتا ہے، اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کے سننے اور سنانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے اور بےحیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آنحضرت ﷺ نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا۔ ارشاد ہے کہ ''بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے، اس کو بدنما بنا دیتی ہے اور حیا جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے۔'' ❺ اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہے۔

⑥ گالی گلوچ سے لوگوں کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے، حالانکہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہیے اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔'' ❻ مردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لیے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مُردوں کے عزیز واقارب اور دوست واحباب کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے۔ ❼

---

❶ بخاری، کتاب الادب، باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا ولا ...: ٦٠٣٢۔

❷ بخاری، کتاب الادب، باب ماینھی من السباب واللعن: ٦٠٥٠۔

❸ ادب المفرد، باب سباب العبید: ١٨٩۔ ❹ بخاری، کتاب الادب، باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا ...: ٦٠٣٠۔ ❺ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الفحش ١٩٧٤۔

❻ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام: ١٦٢۔

❼ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الشتم: ١٩٨٢۔

(۷) گالی گلوچ لڑائی کا پیش خیمہ ہے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا بھڑنا کفر ہے، اس لیے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے، وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق تو ضرور ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((سباب المسلم فسوق وقتاله كفر)) ❶

''مسلمان کو برا بھلا کہنا گناہ ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر۔''

ان تمام مراتب کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بدزبانی اور فحاشی اسلامی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے، اس لیے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، وہ اس بداخلاقی میں مبتلا رہنا پسند نہ کرے گا، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ليس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی)) ❷

''جو مسلمان ہے وہ طنز و تشنیع نہیں کرتا، لعنت نہیں بھیجتا، بدزبانی اور فحش کلامی نہیں کرتا۔''

ایک اور حدیث میں بدزبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ ❸

یہ تمام وجوہ تو انسانوں کی باہمی گالی گلوچ اور لعن وطعن سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس قسم کی بدزبانیاں صرف انسانوں تک محدود نہیں ہیں، بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزوں سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی برا بھلا کہہ بیٹھتے ہیں، مثلاً: جب کوئی شخص حوادثِ زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانہ کو برا بھلا کہنے لگتا ہے، یہ نہیں سوچتا کہ اس میں زمانہ کا کیا قصور ہے، یہ جو کچھ ہوا ہے، مشیتِ الٰہی سے ہوا ہے، اس بنا پر اسلام نے ان چیزوں کے برا بھلا کہنے کی ممانعت کی ہے اور اس مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ ''اللہ کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو برا بھلا کہتا ہے، حالانکہ میں خود زمانہ ہوں اور رات دن میرے ہاتھ میں ہیں۔'' ❹ یعنی زمانہ کو برا بھلا کہنا خود اللہ کو برا بھلا کہنا ہے۔

ایک بار ہوا ایک شخص کی چادر کو ادھر ادھر اڑانے لگی، اس نے ہوا پر لعنت بھیجی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس پر لعنت نہ بھیجو، وہ تو صرف اللہ کی فرماں بردار ہے۔'' ❺

ایک سفر میں ایک عورت نے اپنی اونٹنی پر لعنت بھیجی، رسول اللہ ﷺ نے اس اونٹنی کو الگ کر دیا، ❻ اور یہ اس عورت کی سزا تھی، تاکہ وہ دوبارہ اس قسم کا کلمہ نہ کہہ سکے۔ اسلام میں گالی گلوچ کے صرف یہی معنی نہیں کہ کسی کو مغلظات سنائے جائیں، بلکہ ہر وہ بات جس سے کسی کی توہین یا دل آزاری ہو گالی ہے، کسی کو فاسق یا

---

❶ بخاری، کتاب الادب، باب ماینهی من السباب واللعن:٦٠٤٤۔

❷ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی اللعنة:١٩٧٧۔

❸ بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق:٣٤۔

❹ بخاری، کتاب الادب، باب لاتسبوا الدهر:٦١٨١۔

❺ ابوداود، کتاب الادب، باب فی اللعن:٤٩٠٨۔

❻ ابوداود، کتاب الجهاد، باب النهی عن لعن البهيمة:٢٥٦١۔

کافر کہنا اگرچہ عرف عام میں گالی نہیں ہے، لیکن اسلام میں وہ ایک سخت گالی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافر نہ کہے، کیونکہ اگر وہ فاسق و کافر نہ ہوگا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے والے پر لوٹ آئے گی۔'' [1] اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہوگا تو اس کا کہنے والا فاسق و کافر نہ ہوگا، تاہم اگر اس کا مقصود محض اس شخص کی تفضیح و تشہیر ہو تو وہ گناہگار ضرور ہوگا۔ [2] بہر حال اسلام نے جان و مال کی طرح ہر مسلمان کی عزت و آبرو کو بھی محفوظ کر دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ایک مقدس دن، ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر میں (یعنی حجۃ الوداع میں) ایک خطبہ میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ اللہ نے تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت کو اسی طرح حرام کر دیا ہے، جس طرح تمہارا یہ دن، تمہارے اس مہینہ اور تمہارے اس شہر میں محترم ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب ماینهی من السباب واللعن: ٦٠٤٥ ومسلم، کتاب الایمان، باب بیان حال ایمان من قال لاخیه المسلم یاکافر: ٢١٥، ٢١٦۔

[2] فتح الباری، کتاب الادب، ماینهی من السباب واللعن، ج ١٢، ص: ٣٨٨۔

رذائل پر مختصر تبصرہ

گزشتہ صفحوں میں جن رذائل کی تشریح کی گئی ہے، ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی بد اخلاقیوں اور بری عادتوں کو گنایا جا سکتا ہے، جن کی ممانعت اسلام میں کی گئی ہے، مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت ان ہی مذکورہ بالا رذائل میں سے کسی کے تحت میں ہیں، اس لیے ان کے پورے استقصا کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور چونکہ ان رذائل کے اخذ و رد میں خالص فلسفیانہ اصول کی پیروی نہیں کی گئی ہے، اس لیے صرف ان ہی کے بیان پر قناعت نہیں کی گئی جن کو فلسفہ اخلاق کے مصنفوں نے رذائل میں شمار کیا ہے، بلکہ مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اخلاق و عاداتِ ذمیمہ کی یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔ اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھید کھل جاتا ہے کہ اسلام نے تین اساسی برائیاں قرار دی ہیں اور جس قدر رذائل ہیں ان میں ان ہی تین میں سے کوئی برائی پائی جاتی ہے۔ سب سے پہلی اساسی برائی عدمِ صدق ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان میں یکسانی نہ ہو۔ جھوٹ، غیبت، خلاف وعدگی، اتہام، بدگمانی، خوشامد، چغل خوری، دورخاپن، جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ دوسری اساسی برائی حبِ مال ہے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبت ہے، بخالت، حرص و طمع، چوری، غصب، خیانت، غلول، ناپ تول میں کمی و بیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہیں۔ تیسری اساسی برائی حبِ ذات ہے، اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے۔ حسد، تکبر، عجب، فخاری، غیظ و غضب، ظلم، کینہ وغیرہ، ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص ان تینوں اساسی برائیوں سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا، وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کر لے گا۔ یہ تینوں اساسی برائیاں ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بے جا خواہشیں ہیں، جو ان سے اپنا دامن بچائے گا، وہ جنت میں آرام پائے گا:

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ ﴾

(۷۹/ النازعات: ۴۰-۴۱)

''اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو غلط خواہش سے بچایا، تو جنت اس کی آرام گاہ ہے۔''

آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، نہانے دھونے کے وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جزو ہیں، آداب کہلاتے ہیں۔ ان ہی آداب کی پابندی وعدم پابندی کے بدولت وحشی اور متمدن لوگوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ ان آداب میں خوبی ولطافت ملحوظ رکھنا حسن ادب ہے، اس کی پابندی سے اجتماع اور معاشرتی امور میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے اور انسان مہذب، شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے۔

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ ان روزانہ کے کاموں کے بجالانے میں ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے، جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو آرام مل سکے اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواری کا باعث نہ ہو جائے اور یا یہ کہ وہ کام خوبی، خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے، پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی عملی وقولی ہدایات سے مسلمانوں کے لیے اس کا بہترین نمونہ قائم کر دیا ہے۔

دنیا کی دوسری قومیں مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب وعوائد یعنی ایٹی کیٹ کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہیں، عیسائی قوموں نے مذہب انجیل سے اور آداب وآئین یونان اور روم سے حاصل کیا۔ لیکن اسلام میں جو مذہب کا سرچشمہ ہے، وہی اس کے آداب وعوائد کا ماخذ بھی ہے، اس لیے اسلام وحشی سے وحشی قوموں میں صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لے کر جاتا ہے اور ان کو چند روز میں مہذب اور شائستہ بنا دیتا ہے۔

ہمارے محدثین کرام ؒ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارم اخلاق سے الگ کر دیا ہے اور ان کو کتاب الطھارۃ، کتاب الاطعمۃ، کتاب الاشربۃ، کتاب اللباس، کتاب الاستیذان، کتاب الآداب اور کتاب السلام میں درج کیا ہے، ہم صحاح وسنن کی عام کتابوں اور خصوصاً بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کر کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

فطری آداب

اسلام دین فطرت ہے، اس لیے اس کے آداب کا بڑا حصہ بھی فطری ہے۔ یعنی فطرۃً وہ پسندیدہ ہیں اور تمام انبیا علیہم السلام نے ان کی پیروی کی ہے۔ یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں، انسان کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے، اس کے بال بڑھتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں، بدن گندہ ہوتا ہے، کپڑے میلے ہوتے ہیں، تو ان سب چیزوں کی اصلاح شائستہ اور ناشائستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں، حیا کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا اور نکاح کرنا۔'' 1 ایک روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے۔

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا یعنی سترِ عورت اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا ہے، عطر لگانا اور مسواک کرنا، صفائی اور طہارت کی تمام اقسام کو بتاتا ہے اور ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی مبارک نسل کی سنت ہے، یہاں تک کہ تورات کے بیان کے مطابق یہ اللہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہے۔ 2

حضرت ابراہیم علیہ السلام انسانیت کے سب سے پہلے معلم ہیں، ان کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی جب کہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جسمانی طہارت و نظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے، جن کو خصالِ فطرت کہتے ہیں۔ امام بخاری کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے ختنہ کرایا، مونچھیں ترشوائیں اور ناخن کٹائے۔ 3 ایک حدیث میں ہے، ایک صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''خصالِ فطرت پانچ ہیں، ختنہ کرانا، موئے زیر ناف اور بغل کے بال صاف کرنا اور ناخن اور مونچھ ترشوانا۔'' 4 ایک دوسری حدیث میں یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہیں، مونچھ ترشوانا، ڈاڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا، بغل کے بال صاف کرنا، زیر ناف کو صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا۔ راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا، غالباً کلی کرنا ہوگی۔ 5

فطرت کے یہ آداب اسلامی طہارت کے اصول بن گئے ہیں، چنانچہ وضو میں مسواک کرنا مستحب اور انگلیوں کا دھونا، ناک میں پانی ڈالنا اور کلی کرنے کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ ناخن ترشوانا، بال بنوانا، مونچھیں ترشوانا، صفائی کے ضروری لوازم ہیں، جن کے ناخن بڑے اور مونچھیں بڑی ہوتی ہیں، وہ کھانے پینے کی ہر چیز

---

1 ترمذی، ابواب النکاح، باب ما جاء فی فضل التزویج والحث علیه: ۱۰۸۰۔ 2 توراۃ پیدائش، باب: ۱۷، آیات: ۱۱، ۱۲۔ 3 ادب المفرد، باب الختان للکبیر: ۱۲۵۰۔ 4 صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة: ۵۹۸۔ 5 صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة: ۶۰۴۔

کو گندہ کر کے کھاتے پیتے ہیں، جس سے نہ صرف دوسروں کو کراہت ہوتی ہے، بلکہ خود ان کو بھی طبی طور پر نقصان پہنچتا ہے، یورپ میں ناخن بڑھانا اور ان کو ریت ریت صاف کرنا اور اسی طرح بعض لوگوں میں بڑی بڑی مونچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے، مگر یہ دونوں باتیں صریحاً خلاف فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں۔ مونچھوں کے بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے، مگر ڈاڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے، بلکہ اب تو ڈاڑھی اور مونچھ دونوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے۔ یہ تمام باتیں اسلامی شعار کے خلاف ہیں اور اس شعار کے مخالف ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے مقرر کیا تھا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ اور ڈاڑھی بڑھاؤ۔'' [1] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مشرکوں کے برخلاف تم مونچھیں باریک ترشواؤ اور ڈاڑھی بڑھاؤ۔'' [2] ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرت مند مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے۔ اچھی اور بری معلوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم و رواج کا واہمہ ہے، جس رنگ کی عینک لگائیے، دنیا اسی رنگ کی نظر آئے گی۔

[1] صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة:٦٠٣۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب خصال الفطرة:٦٠٢۔

طہارت اوراس کے آداب

تہذیب وشائستگی کی باتوں میں سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہے۔گوکہ اسلام ایک ایسے ملک میں ظاہر ہوا جہاں پانی بہت کم تھا۔پھر بھی اس نے بعض خاص حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا۔زن وشوہر کی ہم بستری کے بعد جب تک دونوں غسل نہ کرلیں ،نماز جوفرض ہے ادانہیں ہوسکتی۔فرمایا:

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ﴾ (۵/ المآئدۃ:٦)

''اوراگرتم ناپاک ہوتو نہاکر پاک ہو۔''

کپڑے شرعی طور سے پاک ہوں۔فرمایا:

﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ (۷٤/ المدثر:٤)

''اوراپنے کپڑے کو پاک کر۔''

اگر پاکی کے لیے پانی نہ مل سکے یا بیماری کے سبب سے پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہوتو پاک مٹی سے تیمم کرنا چاہیے:

﴿ فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا ﴾ (۵/ المآئدۃ:٦)

''توپاک مٹی کا قصد کرو۔''

جب نماز پڑھنا چاہیں تو پہلے ہاتھ،منہ اور پاؤں دھولیں اور بھیگے ہاتھوں کوسر پر پھیرلیں۔اس کا نام وضو ہے:

﴿ اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ﴾ (۵/ المآئدۃ:٦)

''جب نماز کا ارادہ کروتو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھولو اوراپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں دھوؤ۔''

جمعہ کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہادھوکر جماعت میں شریک ہوں تاکہ کسی کی گندگی اور بدبو سے دوسرے نمازیوں کوتکلیف نہ ہواور پورا مجمع پاکی اور صفائی کی تصویر ہو۔قضائے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجا اور عضو خاص ومقامِ خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ٹھہرایا گیا۔

ان احکام سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔بلکہ وہ اللہ کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے۔فرمایا:

﴿ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۲)

''اور (اللہ) طہارت کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

اسی طہارت کی پابندی اور دلوں میں طہارت کا خیال پیدا کرنے کے لیے مختلف سنن اور طریقے سکھائے گئے مثلاً:

① آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص سو کر اٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھو لے، اس کو پانی کے برتن میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ کیوں کہ سونے میں معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے''۔ [1] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے ہر حالت میں خیال رکھنا چاہیے۔ سونے میں کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہو جائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا۔ [2] ہاتھ کی صفائی پر اس لیے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے میں ناپاک ہاتھ پانی میں بھیگ کر پانی کو ناپاک نہ کر دے۔ اس لیے خیال رکھنا چاہیے کہ ہاتھ پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈبونے جائیں جب تک ہاتھوں کی طہارت کا یقین نہ ہو۔

② دانتوں کی صفائی جو بہت سی گندگیوں اور بیماریوں کی جڑ ہے، ضروری بتلائی، مسواک کرنا سنت ٹھہرایا۔ فرمایا: ''اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔'' [3] ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے۔ تو فرمایا: ''تمہارے دانت زرد کیوں دیکھ رہا ہوں۔ مسواک کیا کرو۔'' [4]

③ عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں قضائے حاجت نہیں کرنا چاہیے۔ [5] یہ اس لیے کہ راستہ چلنے والوں اور درخت کے سایہ میں بیٹھنے والے مسافروں کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو۔

④ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کر کے پھر اس میں غسل کرنا جائز نہیں۔ ایسے ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل جنابت بھی نہیں کرنا چاہیے۔ [6] بلکہ مجنب کو چاہیے کہ اس سے پانی لے کر غسل کرے۔ کیوں کہ ہماری تھوڑی سی سہل انگاری سے وہ پانی دوسروں کے لیے ناپاک یا قابلِ کراہت، بلکہ عام حالت میں خود اسی کی طبیعت کے لیے گھن پیدا کرے گا۔

⑤ عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس حالت میں یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑ جائیں، نیز بے ستری کا بھی امکان ہے اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے۔ اگر یہ احتمالات نہ ہوں یا زمین بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے۔

⑥ پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہیے۔ کیوں کہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑ کر جسم پر پڑ سکتے ہیں۔

---

[1] مسلم، كتاب الطهارة، باب كراهية غمس المتوضي وغيره يده ...:٦٤٣۔ [2] ابوداود، كتاب الطهارة، باب في الرجل يجد البلة في منامه: ٢٣٦۔ [3] ايضا، باب السواك:٤٦۔ [4] مسند أحمد، ج١، ص:٢١٤۔

[5] ابوداود، كتاب الطهارة، باب المواضع التي نهى عن البول فيها:٢٥، ٢٦۔

[6] ايضا، باب البول في الماء الراكد:٦٩، ٧٠۔

⑦ غسل خانہ کی زمین میں پیشاب نہیں کرنا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ وہ کچی ہو۔ کیوں کہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹیں گندی اور ناپاک ہو کر اڑیں گی اور بدن کو ناپاک کریں گی یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل میں پیدا کریں گی۔

⑧ بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہیے۔ ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھو لینا اچھا ہے۔ استنجا بائیں ہاتھ سے کیا جائے۔ اس میں داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے۔

⑨ طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہیے۔ ❶

⑩ ہفتہ میں ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے بدلنا عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے۔ بلکہ بعض فقہا اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہے۔

اسلام نے اس کے لیے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے، جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے اور اس کی وجہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بیان کی ہے کہ عرب کے لوگ سخت تنگ دست اور پشمینہ پوش تھے اور محنت مزدوری کرتے تھے۔ ان کی مسجد نہایت تنگ اور اس کی چھت نہایت پست تھی جو چھپر کی تھی۔ ایک بار گرم دن میں رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے آئے تو لوگوں کو اس پشمینہ میں پسینہ آیا اور اس کی بو کے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا: ''لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو اور ہر شخص کو جو بہترین تیل اور خوشبو میسر ہو سکے لگائے۔'' ❷ جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بودار چیز مثلاً: لہسن یا پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت بھی فرمائی۔ ❸

⑪ جمعہ کے علاوہ عام حالات میں بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہیے۔ چنانچہ ایک بار جب رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں تو فرمایا کہ ''اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟'' ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ ''اس کو پانی نہیں ملتا تھا جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھو لیتا۔'' ❹

اسی کے ساتھ اسلام نے طہارت و نظافت کی تعلیم میں سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور ایسی تعلیم نہیں دی ہے جو تشدد، غلو اور وہم و وسوسہ کی حد تک پہنچ جائے۔ اس بنا پر اسلام نے بعض ان سختیوں کو دور کیا ہے جو اس معاملہ میں اور مذاہب میں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً: یہودیوں کے مذہب کی رو سے ناپاکوں کی پاکی کے لیے ضروری تھا کہ نہانے کے بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوب لے تب نہانے والا پاک ہو۔ لیکن اسلامی تعلیمات کی رو سے انسان کو اس معاملہ میں صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہیے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم یا

---

❶ یہ تمام مسائل کتب سنن کی کتاب الطہارۃ میں دیکھیے۔ ❷ ابو داود، کتاب الطهارة، باب الرخصة فى ترك الغسل يوم الجمعة: ٣٥٣۔ ❸ مسلم، كتاب المساجد، باب النهى من اكل ثوما او بصلا...... : ١٢٥١، ١٢٥٢۔

❹ ابو داود، كتاب اللباس، باب فى الخلقان: ٤٠٦٢۔

کپڑے پر نہ پڑنے پائیں۔ اس سے زیادہ احتیاط تشدد اور غلو کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ شدتِ احتیاط کی وجہ سے شیشی میں پیشاب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بنو اسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے۔ لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی نہ کرتے۔ کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو معمولی طور پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ❶

یہودیوں کے یہاں یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ ﴾ (٢/ البقرة:٢٢٢)

''اور (اے پیغمبر ﷺ! لوگ) تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو (ان کو) سمجھا دو کہ وہ گندگی ہے، تو حیض کے دنوں میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک پاک نہ ہو لیں ان سے مقاربت نہ کرو اور جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ۔''

اس کے مطابق آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وقاع کے علاوہ ان سے سب کام لے سکتے ہو اور خود اپنے طرزِ عمل سے اس کی مثالیں قائم کر دیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں آپ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی اور آپ کے سر کو دھوتی تھی۔ ایک بار آپ ﷺ نے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی۔ میں نے معذرت کی تو فرمایا: ''یہ ناپاکی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔'' ❷ ناپاکی کی حالت میں مقدس مقامات مثلاً: مسجد میں نہیں جا سکتے۔ قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے۔ اسی اصول کی بنا پر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حالتِ جنابت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان نجس نہیں ہوتا''۔ ❸ یعنی مسلمان جنابت اور حاجتِ غسل سے ایسا نجس نہیں ہو جاتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے۔

ایک عورت نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ میں عورت ہوں اور میرے دامن لمبے ہوتے ہیں اور میں گندے مقامات میں چلتی ہوں۔ یعنی زمین میں گھسٹنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ دامن میں نجاست لگ جاتی ہو۔ بولیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کر دیتی ہے۔'' ❹ یعنی اس

❶ صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب المسح علی الخفین:٦٢٥۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب جو از غسل الحائض رأس زوجها:٦٨٨ تا ٦٩١۔ ❸ ابوداود، کتاب الطهارة، باب في الجنب یصافح: ٢٣٠، ٢٣١۔ ❹ ابوداود، کتاب الطهارة، باب الاذی یصیب الذیل:٣٨٣۔

کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے وہ اس نجاست کو زائل کر دیتی ہے۔ ایک عورت نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو راستہ جاتا ہے وہ بدبودار ہے۔ جب بارش ہو تو ہم کیا کریں۔ فرمایا کہ ''اس کے بعد اس سے اچھا راستہ نہیں ہے۔؟'' بولیں، ہاں ہے۔ فرمایا: ''تو وہ اس کی تلافی کر دیتا ہے۔'' ❶ غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے اور وہ پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات میں پاک کر سکتی ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ زمین میرے لیے پاک کر دی گئی ہے اور اسی لیے وہ حالت تیمم میں پانی کی قائم مقام ہو جاتی ہے۔ جوتا زمین پر رگڑ لینے سے پاک ہو جاتا ہے۔

اسلام نے اس باب میں سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمم کو غسل اور وضو کا قائم مقام کر دیا ❷ اور اس کو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک برکت سمجھا۔

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھو لیے جائیں۔ پھر کمر سے دھو کر نجاست دور کر لی جائے۔ پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے۔ آنحضرت ﷺ ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے پہلے دونوں ہاتھ دھوتے، پھر داہنے ہاتھ سے پانی بہا کر بائیں ہاتھ سے کمر کے نیچے دونوں طرف دھوتے۔ پھر وضو کرتے۔ لیکن پاؤں نہیں دھوتے پھر سر پر تین بار پانی بہا کر بال کی جڑوں کو ملتے۔ پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے۔ ❸

اسلام میں ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہیں ہے اور نہ عرب جیسے ملک میں یہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اگر کوئی ایسے ملک میں جہاں پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لیے ہر روز نہا لے تو مباح ہے۔ آنحضرت ﷺ پانچوں وقت کی نماز کی تمثیل میں فرماتے ہیں کہ ''اگر کسی کے دروازہ پر نہر بہہ رہی ہو اور اس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہایا کرے تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے۔'' ❹

---

❶ ابو داود، کتاب الطهارة، ایضًا: ۳۸٤۔

❷ بیماری یا پانی نہ ملنے کی صورت میں۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب صفة غسل الجنابة: ۷۱۸۔

❹ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوة، باب الصلوة الخمس کفارة: ۵۲۸۔

کھانے پینے کے آداب

① کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینا چاہیے۔کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگر چہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے،لیکن اگر پیالہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو تو سو کر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے۔اسی طرح بے ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں اور ابوداؤد میں بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے۔ ❶ ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی لگی رہ جائے اور وہ سو جائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''ایسا اسی کی غلطی سے ہوگا اور اس کو اس تساہل پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہیے۔'' اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اس کے لیے ہے جس کی انگلیاں کھانے میں ملوث ہوتی ہوں۔

② مسلمانوں کا ہر کام اللہ کے نام سے شروع ہونا چاہیے، جیسا کہ حدیثوں میں مذکور ہے اور دنیا کے سب کاموں میں کھانا جو زندگی کی بقا اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے کتنا بڑا کام ہے۔یہ کام اللہ کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہیے۔اس لیے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لینی چاہیے۔صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جب ہم کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپ ﷺ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔لیکن ایک بار ایک بدو دوڑا ہوا آیا اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور فرمایا کہ ''جس کھانے پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لیے جائز کر لیتا ہے۔'' ❷ اور اگر کوئی شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے تو ((بسم اللّٰہ اولہ و آخرہ)) کہہ لے۔ ❸

③ انسان کو ضرورت کے منشا کے مطابق پاک و ناپاک ہر قسم کے کاموں اور چیزوں میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کاموں کے لیے خاص کر دیے جائیں۔چنانچہ سب اچھے کاموں کے لیے داہنے ہاتھ کو اور دفعِ نجاست وغیرہ کے لیے بائیں ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے۔اس تخصیص میں ایک طبی اور فطری مصلحت بھی ہے۔انسان کے زیادہ تر کام فطرۃً پاک اور مباح ہوتے ہیں اور دفعِ نجاست وغیرہ کے کام کبھی کبھی ہوتے ہیں۔اس لیے زیادہ تر کاموں کے لیے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے، جدھر قلب نہیں ہے۔یعنی ''دایاں پہلو'' تا کہ کام کے ہچکولوں اور جھٹکوں سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے۔یہی وجہ ہے کہ سب انسان فطرۃً سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بایاں ہاتھ

❶ ابوداود، کتاب الاطعمة، باب فی غسل الید من الطعام: ۳۷٦۱۔

❷ ابوداود، کتاب الاطعمة، باب التسمیة علی الطعام: ۳۷٦٦۔

❸ ایضًا: ۳۷٦۷۔

صرف اس کی مدد کے لیے لگاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ داہنے میں زیادہ پھرتی، چستی اور طاقت ہوتی ہے۔ اسی لیے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہیے۔ [1] صرف کھانے پینے ہی کی خصوصیت نہیں، بلکہ شریعت نے اکثر باتوں میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ ایک بار آپ ﷺ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا۔ مجلس میں آپ کے داہنے جانب ایک بدو بیٹھا تھا اور بائیں جانب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ نے دودھ پی کر بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ "ترتیب میں داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے۔" [2]

ایک بار آپ ﷺ کے دائیں جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ "اگر تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں۔" اس نے کہا، میں اپنا حصہ کسی کو نہیں دے سکتا۔ مجبوراً آپ نے پہلے اسی کو دیا۔ [3]

④ کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہیے بیچ سے نہیں کھانا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بچ جائے گی، گندی نہ ہوگی دوسرے یہ کہ برتن گندا نہ ہوگا اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے اور حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اسی کو رسول اللہ ﷺ نے برکت سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا کہ "برکت کھانے کے بیچ میں نازل ہوتی ہے۔" [4]

⑤ اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو کر کے نہیں کھانا چاہیے۔ [5] کیوں کہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے، تا کہ کوئی دوسرا آ کر شریک نہ ہو جائے اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھا لے۔ یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حرص وطمع پر دلیل ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہیے۔

⑥ کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے گھر والوں میں اور کام کرنے والوں میں بات بات میں عیب نکالنے والے کی طرف سے چڑ اور نفرت پیدا ہوتی ہے اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی جگہ اور بگڑتا ہے۔ اس لیے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھا لینا چاہیے ورنہ چھوڑ دینا چاہیے۔ [6]

⑦ سب کا مل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسن معاشرت کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ

---

[1] ابوداود، کتاب الاطعمة، باب الاکل بالیمین: ۳۷۷۶۔۳۷۷۷۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الاشربة، باب الایمن فالایمن فی الشرب: ۵۶۱۹۔ [3] ایضًا: ۵۶۲۰۔ [4] ترمذی، ابواب الاطعمة، باب ماجاء فی کراهیة الاکل من وسط الطعام: ۱۸۰۵۔ [5] سنن ترمذی، ابواب الاطعمة، باب فی کراهیة القران بین التمرتین: ۱۸۱٤۔
[6] بخاری، کتاب الاطعمة، باب ماعاب النبی ﷺ طعاما قط: ۵٤۰۹۔

نے اس کو پسند فرمایا ہے کہ دوست واحباب یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں۔ جیسا کہ قرآن پاک (۲۴/النور:۶۱) میں ہے۔ الگ الگ کھانا بھی جائز ہے اور ایک ساتھ بھی۔ لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ برکت ہوتی ہے۔ اس طرح کھانا زیادہ برباد نہیں ہوتا۔ کوئی تھوڑا کھاتا ہے کوئی زیادہ کھاتا ہے سب مل کر برابر ہوجاتے ہیں اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے۔ پھر اس سے گھر والوں کا ایثار ثابت ہوتا ہے اور گھر کے مالک کا تشخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے، مٹتا ہے۔ اس سے گھر والوں اور عزیزوں اور دوستوں میں محبت ہوتی ہے۔ ایک بار صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں، لیکن آسودہ نہیں ہوتے۔ فرمایا: ''غالباً تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا، ہاں۔ فرمایا کہ ''ایک ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ پڑھ لو تو برکت ہوگی۔'' ❶

⑧ کھانا ٹیک لگا کر بیٹھ کر یا منہ کے بل لیٹ کر نہیں کھانا چاہیے۔ ❷ کیوں کہ روحانی کیفیت کے علاوہ یہ طبی حیثیت سے اس لیے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ میں اچھی طرح سے بآرام نہیں پہنچتی ہے۔ کھانے کے لیے بیٹھنے کی مسنون صورتیں یہ ہیں کہ یا تو ایک پاؤں کھڑا کر کے اور دوسرے پاؤں کو گرا کر اسی پر بیٹھ کر کھایا جائے یا دوزانوں بیٹھ کر اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں تو اکڑوں بیٹھ کر۔ ❸ آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا میں بندہ ہوں، غلاموں کی طرح کھاتا ہوں یعنی خاکساری سے۔'' ❹

⑨ کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہیے۔ ادھر ادھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیے۔ ❺ خصوصاً جب کئی آدمی ایک ہی برتن میں ساتھ ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گندا نہیں ہوتا۔ دوسرے ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہو جاتا ہے اور دوسرے کے کھانے میں کوئی اچھا ٹکڑا اتفاقاً پڑ گیا ہے تو اس کے لیے لالچ سے بچتا ہے اور ایثار سیکھتا ہے۔

⑩ کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیوں سے اور انگلیوں کو منہ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہیے اور اس کے بعد رومال سے ہاتھ پونچھنا چاہیے۔ ❻

⑪ پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس میں پینا چاہیے۔ ❼ اس طرح پانی پینے سے پوری سیری ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے اور اندر سے نکلنے والی گندی سانس پانی میں نہیں لگنے پاتی۔

⑫ پانی کے برتن میں سانس نہیں لینی چاہیے۔ ❽ کیوں کہ ممکن ہے کہ منہ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر

❶ ابوداود، کتاب الاطعمة، باب فی الاجتماع علی الطعام:۳۷٦٤۔ ❷ ابوداود، کتاب الاطعمة فی الاکل متکئا: ۳۷٦۹۔ ❸ ابوداود، کتاب الاطعمة: ۳۷۷۰ وابن ماجه کتاب الاطعمة: ۳۲٦۳ وشرح سفر السعاد فصل فی طعامه، ص: ۸۷ فیروزآبادی للشیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ ❹ ابو داود وابن ماجه مع زرقانی علی السیر ج ٤، ص: ۳۹۸۔ ❺ بخاری، کتاب الاطعمة، باب التسمیة علی الطعام:۵۳۷٦۔ ❻ بخاری، کتاب الاطعمة، باب لعق الاصابع: ۵٤۵٦۔ ❼ بخاری، کتاب الاشربة، باب الشرب بنفسین اوثلاثة:۵٦۳۱ ❽ ابوداود، کتاب الاشربة، باب فی النفخ فی الشراب: ۳۷۲۸۔

برتن میں پڑ جائے اور وہ آدمی کو مکروہ معلوم ہو۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر سانس جو اندر سے باہر آتی ہے وہ بدن کی کثافتوں کو لے کر باہر نکلتی ہے۔ اس لیے اس سانس سے ملی ہوئی چیز کو پھر اندر نہیں کرنا چاہیے۔

⑬ پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہیں پینا چاہیے۔ (1) کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے اور طبی حیثیت سے بھی مضر ہے۔ البتہ کبھی کبھی اگر کوئی پی لے تو کچھ حرج نہیں۔ کیوں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے۔ (2) مگر اس کی عادت نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ پانی پینے میں ضرورت ہے کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائیں اور یہ بات بیٹھ کر پانی پینے سے حاصل ہوتی ہے۔ البتہ زمزم کا پانی برکت، دعا اور شاید تعظیم کی خاطر کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے۔

⑭ پانی مشکیزہ کے منہ یا پیالہ کے سوراخ سے نہیں پینا چاہیے۔ (3) کیوں کہ اس سے اول تو پانی کی مقدار کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا پی لیا پھر یہ دیکھا نہیں جا سکتا کہ اس کے اندر کوئی مضر چیز تو نہیں۔

⑮ کھانے اور پانی کے برتنوں کو ڈھانک کر رکھنا چاہیے۔ (4) تا کہ اس میں گرد و غبار یا کوئی نجس چیز یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑنے پائے یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے۔

⑯ کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے کھلایا اور پلایا۔ اس موقع پر کی مختلف دعائیں حدیثوں میں آتی ہیں۔ جن میں سے ایک مختصر دعا یہ ہے: ((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ)) ''یعنی اس خدا کا شکر ہے جس نے کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔'' (5)

---

(1) صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب فی الشرب قائما: ٥٢٧٧۔ (2) بخاری، کتاب الاشربة، باب الشرب قائما: ٥٦١٦۔ (3) صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب استحباب تخمیر الاناء......: ٥٢٧٢؛ بخاری، ٥٦٢٩۔ (4) صحیح مسلم، کتاب الاشربة: ٥٢٤٦۔ (3) عمل الیوم واللیلة ابن السنی، باب مایقول اذا اکل: ٤٦٤ نوٹ من المسلمین کے بجائے مسلمین کے الفاظ ہیں۔

آدابِ مجلس

آدابِ مجلس میں اصولی بات یہ ہے کہ مجلس میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو اور شرکائے مجلس میں سے ہر ایک کا حق برابر ہو، تاکہ یہ مجلس شرکا کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو۔ ان ہی دو باتوں کو قائم رکھنے کے لیے آنحضرت ﷺ کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب سکھائے ہیں۔

① مجلس میں انسان کو جہاں بے تکلف پہلے جگہ مل جائے، یعنی جہاں تک نشست کا دائرہ اس کے آنے تک پہنچ چکا ہے، وہیں بیٹھ جانا چاہیے، یہ نہیں کرنا چاہیے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے۔ اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے۔ [1] انتہا یہ ہے کہ مسجدوں میں بعد کے آنے والے نمازیوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں کو روندتے ہوئے آگے کی صف میں بیٹھنے کی کوشش کریں۔ جمعہ کی نماز میں یہ خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی لیے تخطی رقاب یعنی دوسروں کی گردنوں کو روند کر اور زیر قدم لا کر آگے بڑھنے کو جمعہ میں خاص طور سے منع کیا گیا ہے۔

② مجلس میں کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہیں بیٹھنا چاہیے۔ [2] اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے کے دل میں کدورت پیدا ہوتی ہے۔

③ اگر کوئی شخص مجلس میں ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہے۔ [3] دوسرا اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔ کیونکہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلا نہیں جاتا۔

④ اگر مجلس میں دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوئے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ [4] کیوں کہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس میں بات چیت کرنے کے لیے یا کسی اور مصلحت باہمی سے بیٹھتے ہیں اور ان دونوں میں موانست اور بے تکلفی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا الگ کر دینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے۔

⑤ اگر کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوئے ہوں تو کسی کو اس حلقہ کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ایسے شخص پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت بھیجی ہے۔ [5] کیوں کہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف

---

[1] ادب المفرد، باب یجلس الرجل حیث انتهى: ۱۱٤۱۔

[2] ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ماجاء فی کراهیة ان یقام الرجل من مجلسه ثم یجلس فیه: ۲۷٤۹، ۲۷۵۰۔

[3] ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ما جاء اذا قام الرجل من مجلسه ثم رجع......: ۲۷۵۱۔

[4] ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ما جاء فی کراهیة الجلوس بین الرجلین بغیر......: ۲۷۵۲۔

[5] ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ماجاء فی کراهیة القعود وسط الحلقة: ۲۷۵۳۔

اس کا منہ ہوگا اور کچھ لوگوں کی طرف پیٹھ ہوگی، جو ایک قسم کی بدتمیزی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہوں، تاکہ سب کو ہنسا سکیں اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے۔

⑥ مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہیے۔ [1] کیوں کہ یہ عجمیوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر، آقا اور رعایا، بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈانڈا شرک سے مل جاتا تھا۔ اس طرح ایک شخص گویا اللہ بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خودداریوں اور عزتِ نفس کو فنا کر دیتے تھے، جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب میں اچھا نہیں سمجھا جا سکتا۔

⑦ راستہ میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے۔ اور ہر آنے والے کو تکنا بداخلاقی ہے۔ لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''چند اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہیے۔ یعنی نگاہ نیچی رکھنا، ضرر رساں چیزوں کو راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا، بری باتوں سے روکنا، راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت میں مارے ہوؤں کی مدد کرنا۔'' [2]

⑧ انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے۔ اس لیے اپنے ہم نشینوں کے انتخاب میں اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے۔ ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے، اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ روحیں ایک مخلوط فوج ہیں۔ جن میں باہم آشنائی ہوتی ہے۔ ان میں الفت و موانست پیدا ہو جاتی ہے اور جن میں بیگانگی ہوتی ہے ان میں تفریق و اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ [3] ایک مشہور مثل ہے کہ ''اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پتہ لگاؤ''۔ اس نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔'' اس لیے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ''اچھے ہم نشین اور برے ہم نشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی کی ہے۔ مشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا یا اس کو خرید و گے یا اس کی خوشبو پاؤ گے۔ لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلائے گی یا تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بو پہنچے گی۔'' [4]

مجلس میں جو معزز جگہ ہو وہاں بیٹھنے کی از خود کوشش نہ کی جائے۔ کسی دوسرے کے یہاں جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے۔ فرمایا کہ ''اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے۔'' [5]

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب فی قیام الرجل یقوم للرجل من مجلسه: ٤٨٢٧، ٤٨٢٨۔

[2] ابوداود، کتاب الادب، باب فی الجلوس بالطرقات: ٤٨١٥ تا ٤٨١٧۔

[3] ادب المفرد، باب الارواح جنود مجندة: ٩٠٠، ٩٠١۔

[4] بخاری، کتاب البیوع، باب فی العطار وبیع المسك: ٢١٠١۔

[5] ترمذی، ابواب الاستئذان، باب حدیث لا یؤم الرجل...... : ٢٧٧٢۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس معزز جگہ میں نہیں تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی میں بیٹھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے اور لوگوں کو وہاں سے ذرا سرکنے اور دوسروں کے لیے جگہ بنانے کے لیے کہا جائے تو وہ برا مانتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس ادب کو خود سکھایا۔ فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَإِذَا قِيلَ انشُزُوا فَانشُزُوا يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ (٥٨/ المجادلة:١١)

''اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی کرو تو کشادگی کرو۔ اللہ تمہارے لیے کشادگی کرے گا۔ اور اگر کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ اللہ ان کے رتبے اونچے کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا اور اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے۔''

اسی طرح مجلس میں بیٹھ کر اس طرح آپس میں کانا پھوسی نہیں کرنی چاہیے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ ان ہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں۔ منافقوں کے اس طرز عمل کی برائی قرآن پاک میں برملا کی ہے:

﴿إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (٥٨/ المجادلة:١٠)

''یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے کہ دل گیر کرے ایمان والوں کو۔''

جہاں چند آدمی بیٹھے ہوں وہاں کوئی دو آدمی آپس میں ایسی سرگوشی کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کو یہ برا معلوم ہوتا ہے ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے ہم کو اس راز کے قابل نہیں سمجھا، دوسرے یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ ''تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ اس سے تیسرا غمگین ہوگا''۔ [1]

مجلس کی راز کی باتوں کو برملا نہیں بیان کرنا چاہیے کہ ((المجالس بالامانة)) قول نبوی ﷺ ہے۔ [2]

[1] ابوداود، کتاب الادب، باب في التناجي: ٤٨٥١۔ [2] ایضا، باب في نقل الحديث: ٤٨٦٩۔

آداب ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لیے جانا ایک ثواب کا کام ہے۔ایک حدیث میں ہے کہ ''جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا اپنے بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دے گا کہ تم اچھے، تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لیے ایک مکان بنالیا۔'' [1]

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

[1] دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوشدلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہیے۔اسی لیے فرمایا کہ ''تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا یہ بھی صدقہ ہے''۔ [2] ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن وسلامتی کا پیام ہو، جس کو شریعت نے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ (تم پر سلامتی ہو) کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے۔چھوٹے بڑے کو، بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں۔

دنیا کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا اور ہے۔عرب کے لوگ ملاقات کے وقت انعم اللّٰہُ بكَ عینا ، وانعم اللّٰہ بك صباحًا کہتے تھے۔یعنی تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔تمہاری صبح خوشگوار ہو۔امراو سلاطین کے لیے دوسرے الفاظ تھے۔ایرانی ''ہزار سال بزی'' ہزار برس جیو، کا فقرہ کہتے تھے۔یورپ کے لوگوں میں صبح کو ''گڈ مارننگ'' (اچھی صبح) شام کو گڈ ایوننگ (اچھی شام) رات کو گڈ نائٹ (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے۔مگر اسلام نے سب کے بجائے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کا لفظ ایجاد کیا اور اس میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں۔

① یہ تمام انبیا علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے۔جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے استعمالات سے جو انبیا علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں ﴿ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ ﴾ (۱۹/مریم:۳۳) یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں ﴿ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ (۳۷/الصافات:۱۸۱) ظاہر ہوتا ہے۔

② اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے، دنیوی تمتعات مثلاً: طولِ عمر وغیرہ سے اس کو تعلق نہیں اور نہ محدود و معین اوقات سے مقید ہے، اس میں دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے۔

③ اس میں مذہبی شان زیادہ پائی جاتی ہے، کیونکہ اس سلامتی سے مقصود جس کی طرف اسلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے۔

④ اس میں مبالغہ آمیز تعظیم نہیں پائی جاتی جو بندگی، کورنش، آداب عرض اور دوسرے قسم کے غیر مشروع

---

[1] ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء فی زیارة الاخوان:۲۰۰۸۔

[2] ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی صنائع المعروف:۱۹۵۶۔

طریقوں میں پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کہا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں، تو آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم لوگ آپ کو سجدہ کریں تو آپ نے اس کی اجازت نہیں دی [1] ایک اور شخص نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لیے جھک جائے، فرمایا: ''نہیں۔'' اس نے کہا: تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے فرمایا: ''نہیں'' (یہ ممانعت اسی موقع سے مخصوص ہے جہاں کوئی شرعی محذور ہو مثلاً: ملنے والا امرد ہو، یا کوئی اور شہوت انگیز صورت ہو) اس نے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے؟ فرمایا: ''ہاں۔'' [2]

⑤ دنیا میں انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جاسکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے کہ یہ جان و مال، آل واولاد، دنیا اور آخرت ہر قسم کی سلامتی پر مشتمل ہے۔

⑥ جب دو انسان آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بے گانگی کے سبب سے متوحش اور چوکنے ہوتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے، اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونوں اس لفظ کو اپنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

⑦ اسلام نے اپنے پیروؤں کے درمیان اس کو گویا آپس میں پہچان کی علامت اور ''واچ ورڈ'' مقرر کیا ہے، آمنے سامنے جب دو زبانوں سے یہ لفظ نکلتے ہیں تو دونوں اپنے سینوں میں ہزار بے گانگی کے باوجود آشنائی کی ایک لہر پاتے ہیں اور آپس میں محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں، یہ بتاتا ہے کہ دونوں ایک ہی ملتِ محمدیہ کے ایمانی فرزند ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی وہ یہ تھی:

((یاایھاالناس افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ بسلام)) [3]

''لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ اور جب تمام لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو، یہ سب کرو گے تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔''

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض و غایت بھی بیان فرما دی اور فرمایا کہ ''تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لے آؤ اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو، میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کرو گے تو باہم محبت کرنے لگو گے اور وہ یہ

---

[1] ابوداود، کتاب النکاح، باب فی حق الزوج علی المرأۃ: ۲۱۴۰۔ [2] ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی المصافحۃ: ۲۷۲۸۔ [3] ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ، حدیث: أفشوا السلام: ۲۴۸۵۔

ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ۔'' ❶

سلام کرنے کے لیے شناسا و غیر شناسا، جانے اور انجان کی تخصیص نہیں۔ ❷ مرد اور عورت کی تفریق نہیں ❸ بڑے اور بچہ کی تمیز نہیں ❹ البتہ اسلام نے سلام کی ابتدا کرنے کے لیے دو اصول کو ملحوظ رکھا ہے، جو تمام متمدن قوموں میں رائج تھے، ایک یہ کہ چھوٹا ادب و احترام کا لحاظ کرے اور اس اصول کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو، گزرنے والا بیٹھنے والے کو اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے، دوسرا یہ کہ سلام کے ذریعہ سے تواضع و خاکساری کا اظہار ہو، اس اصول کی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہیے۔ ❺

ان مصالح کے لحاظ سے آپ ﷺ نے اپنے اہل و عیال کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا۔ ❻ مجلس سے اٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہیے۔ ❼ سلام میں رحمۃ اللہ و برکاتہ، کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہے، چنانچہ ایک بار ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا ''السلام علیکم'' آپ نے فرمایا: ''اس کو دس نیکیاں ملیں۔'' دوسرا آدمی آیا تو کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' آپ نے فرمایا: ''اس کو بیس نیکیاں ملیں۔'' تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو تیس نیکیاں ملیں۔'' ❽

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریق سے بلکہ اس سے بہتر طریقہ سے دے، یعنی سلام کرنے والے نے جو الفاظ کہے ہیں، ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے، ورنہ کم از کم وہی الفاظ دہرا دے، چنانچہ خود قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ہے:

﴿ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ﴾ (٤/ النسآء:٨٦)

''اور (مسلمانو!) جب تم کو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب میں) اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو یا (کم سے کم) ویسا ہی جواب دو۔''

اس سے کم الفاظ میں سلام کا جواب دینا اگرچہ فقہا کے نزدیک جائز ہے، لیکن آیت کا ظاہری مفہوم

❶ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی افشاء السلام: ٢٦٨٨۔

❷ بخاری، کتاب الاستئذان، باب السلام للمعرفة وغير المعرفة: ٦٢٣٦۔

❸ بخاری، کتاب الاستئذان، باب تسليم الرجال على النساء والنساء على الرجال: ٦٢٤٨۔

❹ بخاری، کتاب الاستئذان، باب التسليم على الصبيان: ٦٢٤٧۔

❺ بخاری، کتاب الاستئذان، باب فی یسلم الراکب علی الماشی: ٦٢٣٢۔

❻ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی التسليم اذا دخل بيته: ٢٦٩٨۔

❼ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی التسليم عند القيام وعند القعود: ٢٧٠٦۔

❽ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما ذکر فی فضل السلام: ٢٦٨٩۔

یہی ہے کہ استحساناً یہ ناکافی ہے۔

[2] ملاقات کے وقت اظہارِ محبت اور اظہارِ مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے اور اس سے سلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے، اس لیے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جزو قرار دیا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اسلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے۔'' [1] مدینہ میں سب سے پہلے یہ تحفہ اہل یمن لائے، [2] اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو قبول کر لیا اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا۔ بعض حالات میں ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسہ دینے کی جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے ممانعت آئی ہے، لیکن اگر شرعی مجبوری نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے، چنانچہ ایک بار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو گلے سے لگا لیا اور ان کا بوسہ لیا۔ [3]

کسی محبوب و محترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوشِ محبت اور جوشِ عقیدت میں کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آتی تھیں تو آپ کھڑے ہو جاتے تھے، ان کا ہاتھ چومتے تھے اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے تھے اور جب آپ ان کے یہاں آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھیں، ایک موقع پر جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو بیمار اور زخمی تھے، آئے تو آپ نے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ اٹھ کر جائیں اور ان کو لے آئیں۔ [4]

دوسری قوموں میں ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے، اسلام نے ان کو یک قلم منسوخ کر دیا، ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیروں اور بادشاہوں کے لیے کھڑے ہوتے تھے اور اسی طرح کھڑے رہ جاتے تھے، آپ ﷺ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے لیے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہیں۔ [5]

اس قسم کے موقعوں پر خوش آمدید کے الفاظ مثلاً: مرحبا کہنے کی مثال بھی شریعت میں موجود ہے۔ [6]

[3] ملاقات یا کسی اور کام کے لیے کسی کے گھر میں جانے کے لیے صاحبِ خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں دیا ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَدْخُلُوا۟ بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا۟ وَتُسَلِّمُوا۟ عَلَىٰٓ أَهْلِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا۟ فِيهَآ أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۖ

[1] ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی المصافحۃ: ۲۷۳۰۔
[2] ابو داود، کتاب الادب، باب فی المصافحۃ: ۵۲۱۳۔
[3] ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ماجاء فی المعانقۃ والقبلۃ: ۲۷۳۲۔
[4] یہ دونوں واقعے ابو داود، کتاب الادب، باب فی القیام: ۵۲۱۵، ۵۲۱۷ میں ہیں۔
[5] ابوداود، کتاب الادب، باب یقوم الرجل یقوم للرجل یعظمہ بذلك: ۵۲۳۰۔
[6] ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی مرحبا: ۲۷۳٤۔

وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝﴾

(۲۴/ النور:۲۷۔۲۸)

''مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے اور ان سے سلام علیک کیے بغیر نہ جایا کرو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے) کہ (جب ایسا موقع ہو تو) تم (اس کا خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جب تک تمھیں (خاص) اجازت نہ ہو، ان میں نہ جاؤ اور اگر (گھر میں کوئی ہو اور) تم سے کہا جائے کہ (اس وقت موقع نہیں) لوٹ جاؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ، یہ (لوٹ آنا) تمہارے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔''

غیر محرم عورتوں سے ملنے کے لیے ان کے شوہروں سے اجازت لینے کی ضرورت ہے۔ ❶

کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہو سکتے ہیں، لیکن اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا، کہ دوسروں کی نگاہ اس پر پڑے، یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی کے مکان پر جاتے تھے، تو چونکہ اس وقت دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا، ❷ اس لیے اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہوتے تھے، سامنے نہیں کھڑے ہوتے تھے ❸ تاکہ اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑے، ایک بار ایک شخص آئے اور آپ کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ'' دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو، کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑنے پائے۔'' ❹ ایک حدیث میں ہے کہ'' اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر میں تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہیں۔'' ❺ ایک بار کسی نے آپ کے حجرہ میں تاک جھانک کی، آپ اس وقت ایک لوہے کی کنگھی سے سر جھاڑ رہے تھے، فرمایا:'' اگر میں یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس کو تمہاری آنکھوں میں کونچ دیتا۔'' پھر فرمایا:

((انما جعل الاذن من قبل البصر)) یا فرمایا: ((انما جعل الاستئذان من اجل البصر))

❶ ترمذی، کتاب الادب، باب ما جاء فی النھی عن الدخول علی النساء الا باذن ازواجھن: ۲۷۷۹۔

❷ ابوداود، کتاب الادب، باب الاستئذان فی العورات الثلاث: ۵۱۹۲۔

❸ ادب المفرد، باب کیف یقوم عند الباب: ۱۰۷۸۔ ❹ ابو داود، کتاب الادب، باب فی الاستئذان: ۵۱۷۴۔

❺ ترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی الاستئذان قبالۃ البیت: ۲۷۰۷ وبخاری، کتاب الدیات، باب من اطلع فی بیت قوم ففقئوا عینیه فلادیة له: ۶۹۰۱، ۶۹۰۲۔

''یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لیے ہے کہ اس کو دیکھو نہیں۔'' ❶

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کر کے یہ کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں؟ ❷ تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہیے، ❸ البتہ اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں، ❹ اگر کوئی شخص گھر کے دالان میں بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے، ❺ دوکانوں میں جانے کے لیے اور اسی قسم کے دوسرے پبلک مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں، ❻ خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کر کے جانا چاہیے، اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تکلفی کی حالت میں ہوں گی یا گھر میں غیر محرم عورتیں آ گئیں ہیں تو وہ ہوشیار ہو جائیں۔

یہ آداب تو اجنبی اور نا آشنا لوگوں کے لیے تھے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں، مثلاً: چھوٹے چھوٹے بچے یا لونڈی غلام، اس لیے اگر ان کے لیے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہوگی، البتہ خاص خاص اوقات میں جن میں لوگ اکثر بے پردہ رہتے ہیں، ان کے لیے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے اور خود قرآن مجید نے ان اوقات کی تعیین کر دی ہے، یعنی نمازِ عشاء کے بعد سے نمازِ صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہے اور دو پہر کو جب قیلولہ کے لیے کوئی لیٹے کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے، فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ۭ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاۗءِ ڜ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ۭ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ﴾ (۲٤/ النور:٥٨-٥٩)

''مسلمانو! تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈی غلام) اور تم میں سے جو سن بلوغ کو نہیں پہنچے، تین وقتوں میں تمہارے پاس آنے کی تم سے اجازت لے لیا کریں، (ایک تو) نمازِ صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب تم دو پہر کو (سونے کے لیے معمول کے مطابق) کپڑے اتار دیا

❶ اس کتاب کے ''اسلام کا فلسفہ اخلاق'' کے ذیلی عنوان ''تجسس اور غیبت کی ممانعت'' میں اس حدیث کے لفظ یہ لکھے گئے ہیں: انما الاذن لاجل الرؤية مگر صحیح لفظ یہ ہیں جو یہاں نقل کیے گئے ہیں، دیکھیے صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب الاستئذان من اجل البصر: ٦٢٤١ وکتاب الديات باب من اطلع فی بيت قوم…: ٦٩٠١۔

❷ ابوداود، کتاب الادب، باب کیف الاستئذان: ٥١٧٧۔ ❸ ابوداود، کتاب الادب، باب کم مرة یسلم الرجل فی الاستئذان ٥١٨٠۔ ❹ ادب المفرد، باب دعاء الرجل اذنه: ١٠٧٤تا١٠٧٦۔ ❺ ادب المفرد، باب مالا یستاذن فیه: ١٠٩٧۔ ❻ ادب المفرد، باب الاستئذان فی حوانیت السوق: ١٠٩٨۔

کرتے ہو اور (تیسرے) نماز عشاء کے بعد (یہ) تین وقت تمہارے پردے کے وقت ہیں، ان (اوقات) کے سوا نہ (تو بے اذن آنے دینے میں) تم پر کچھ گناہ اور نہ (بے اذن چلے آنے میں) ان پر (کچھ گناہ کیونکہ وہ) اکثر تمہارے پاس آتے جاتے ہیں (اور) تم میں سے بعض کو (یعنی لونڈی غلاموں کو) بعض (یعنی تمہارے پاس آنے جانے کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے، (تو بار بار اذن مانگنے میں تم لوگوں کو بڑی تکلیف ہوگی) یوں اللہ (اپنے) احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے اور (مسلمانو! جب تمہارے لڑکے حد بلوغ کو پہنچیں تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے گھروں میں آنے کے لیے) اذن مانگا کرتے ہیں، اسی طرح ان کو بھی اذن مانگنا چاہیے۔''

آدابِ گفتگو

آدابِ گفتگو میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کریں۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ باتیں کرو:

﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا ﴾ (۲/ طٰہٰ: ۴۴)

''تو تم ان سے نرم بات کہنا۔''

پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو، فائدہ مند ہو۔ اس کے کہنے میں اپنا یا دوسرے کا نفع ہو، اسی لیے فرمایا:

﴿ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ (۲/ البقرۃ: ۸۳)

''اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔''

مجلس میں بیٹھیں تو ایسے فقرے نہ کہیں جن میں کسی پر کوئی طعن چھپا ہو یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو۔ یہود آنحضرت ﷺ کی مجلس میں آتے تو اسی قسم کی باتیں کہتے "انظرنا" (ہمارا خیال کیجئے) کی جگہ "راعنا" کہتے، جس میں تخفیف کا چھپا پہلو نکلتا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے باز رکھا، فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۰۴)

''اے ایمان والو! ''راعنا'' نہ کہو، انظرنا'' کہو''۔

اس کی پوری تفصیل سورۂ نساء رکوع ۷ میں ہے۔

باتیں ایسی کرنی چاہییں جو منصفانہ اور درست ہوں، اگر جماعت کے بیشتر افراد اس کا لحاظ رکھیں تو آپس میں لڑائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو، فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۷۰۔۷۱)

''اے ایمان والو! اللہ سے تقویٰ کرو اور بات سیدھی کہو، اللہ تمہارے کاموں کو سنوارے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا۔''

عورتوں کو جب نامحرم مردوں سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات میں اور لہجہ میں ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال پیدا ہو، فرمایا:

﴿ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۚ ﴾

(۳۳/ الاحزاب: ۳۲)

''تو (اے نبی کی بیویو!) دبی زبان سے بات نہ کیا کرو، ایسا کرو گی تو جس کے دل میں کسی

طرح کا کھوٹ ہے وہ اللہ جانے تم سے کس طرح کے توقعات پیدا کر لے گا اور بات کرو تو معقول بے لاگ۔''

مردوں کو نرم، معقول اور دل جوئی کے ساتھ باتیں کرنے کی تاکید آئی اور اس کا ثواب صدقہ کے برابر بتایا ہے، فرمایا:

﴿ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۳)

''نیک بات کہنی اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔''

بات کی جائے تو آہستگی کے ساتھ، بے موقع چیخ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے، فرمایا:

﴿ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۹)

''اور کچھا اپنی آواز پست کر کہ سب آوازوں میں بری آواز گدھوں کی ہے۔''

فضول باتوں سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے، مسلمانوں کی صفت یہ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۳)

''اور جو لغو سے اعراض کرتے ہیں۔''

کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے، اس پر اللہ کا فرشتہ گواہ رہتا ہے، اللہ فرماتا ہے:

﴿ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴾ (۵۰/ قٓ:۱۸)

''آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا لیکن ایک نگران اس پر حاضر رہتا ہے۔''

اس لیے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ نیک بات کہے یا چپ رہے۔'' [1] اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضور کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں، کیونکہ جب ہم بری بات بولیں گے تو اس کی جزا بھی پائیں گے، ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو ادھر توجہ نہ دے۔'' [2] یہ حدیث ان جوامع الکلم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں، مگر درحقیقت اس کوزہ میں دریا بند ہے، مسلمان اگر اسی بات کا دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے کام بن جائیں۔

زبان انسان کو اظہارِ مطلب کے لیے ملی ہے، اسی لیے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصود

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی اکرام الجار و الضیف:۱۷۳، ۱۷۴۔

[2] ترمذی، ابواب الزھد، باب من حسن اسلام المرء:۲۳۱۷، ۲۳۱۸؛ ابن ماجہ، کتاب الفتن:۳۹۷۶۔

معنی درست اور صحیح ہوں، پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں، اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا جائے اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

﴿ وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَٰهِلُونَ قَالُوا سَلَٰمًا ﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۳)

''اور جب ناسمجھ ان کو خطاب کریں تو وہ جواب میں سلامتی کی بات کہیں۔''

گفتگو بضرورت کرنی چاہیے، احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے جو فضول باتیں کرتے ہوں اور بکواس میں مبتلا رہتے ہوں اور فرمایا کہ ''ایسے لوگ امت کے بدترین افراد ہیں۔'' 1 یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو اللہ تعالیٰ کی تا قیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تا قیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے۔ 2 یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رخ صرف زبان کے سبب سے ادھر یا ادھر پھر جاتا ہے، یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے، اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں، اسی لیے آیا ہے کہ ''جو دونوں جبڑوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا، وہ جنت میں جائے گا۔'' 3

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کے ساتھ کہا جائے، بلکہ اس کو دہرا کر کہا جائے، تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے، اسی غرض سے جب رسول اللہ ﷺ کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے 4 اور گفتگو اتنی جلدی جلدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے۔ ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے، بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا، 5 حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں ترتیل و ترسیل پائی جاتی تھی، یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے، اسی مفہوم کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس طرح ادا فرماتی ہیں:

كان كلام رسول الله ﷺ كلامًا فصلاً يفهمه كل من سمعه. 6

''رسول اللہ ﷺ کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا تھا اور جو شخص اس کو سنتا تھا سمجھ

---

1 ادب المفرد، باب فضول الكلام: ۱۳۰۸۔ 2 مؤطا امام مالك، كتاب الكلام، باب ما يؤمر به من التحفظ في الكلام: ۱۸۴۸؛ بخاری، كتاب الرقاق: ۶۴۷۷؛ مسلم، كتاب الزهد: ۷۴۸۱، ۷۴۸۲۔
3 مؤطا امام مالك، كتاب الكلام، باب ما جاء في ما يخاف من اللسان: ۴ ۱۸۵۔ 4 ابوداود، كتاب العلم، باب تكرير الحديث: ۳۶۵۳۔ 5 ابو داود، كتاب العلم، باب في سرد الحديث: ۳۶۵۴۔
6 ابوداود، كتاب الادب، باب الهدى في الكلام: ۴۸۳۹۔

لیتا تھا۔"

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہیے، ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے سنا تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں، کیونکہ اختصار بہتر ہے۔" ❶

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر ومباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے، بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا جاتا ہے، کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے، ان اغراض کے حاصل کرنے کے لیے لوگ نہایت مسجع مقفی اور تکلف آمیز تقریر کرتے ہیں، گفتگو کو طول دیتے ہیں، چبا چبا کے باتیں کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ان تمام باتوں کی ممانعت کی اور فرمایا کہ "اللہ اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے، جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کے گھاس کھاتا ہے"۔ نیز فرمایا کہ "جو شخص اسلوب کلام میں اس لیے ادل بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے، ❷ اللہ قیامت کے دن اس کا فدیہ و توبہ نہ قبول کرے گا۔" ❸

جب چند لوگوں کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ رہے، بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی طرف منہ کیا جائے، تاکہ دوسروں کو عدم التفات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے۔ ❹

---

❶ ابوداود، كتاب الادب، باب ما جاء في التشدق في الكلام: ٥٠٠٨۔

❷ یعنی حق کی تبلیغ نہیں بلکہ اپنی تعریف کرانی مقصود ہو۔

❸ ابوداود، كتاب الادب، باب ما جاء في التشدق في الكلام: ٥٠٠٦۔

❹ ادب المفرد، باب اذا احدث الرجل القوم لا يقبل على واحد: ١٣٠٤۔

باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ میں متانت، سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیے، اللہ اچھے مسلمانوں کی تعریف میں فرماتا ہے:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا ﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۳)

''اور رحمت والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں۔''

اکڑ کر نہیں چلنا چاہیے، یعنی چال میں غرور اور تکبر کے انداز نہ ہوں، فرمایا:

﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآءیل:۳۷)

''اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، (کہ اس طرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں تک اونچائی میں پہنچ سکتا ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۚ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۸)

''اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ مغرور اور فخار کو پسند نہیں کرتا۔''

عورت کو بجنے والے زیور مثلاً: پازیب، چھڑے یا چھانجھ پہن کر چلنے میں زمین پر زور زور سے پاؤں نہیں رکھنا چاہیے، کیونکہ اس کی آواز سے سننے والوں میں انتشارِ خیال پیدا ہوتا ہے، عرب کی عورتیں مردوں کے سامنے سے گزرتی تھیں تو اپنے پازیب کی آواز سنانے کے لیے زور زور سے زمین پر پاؤں رکھتی تھیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا:

﴿ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ ﴾ (۲۴/ النور:۳۱)

''اور (چلنے میں) اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو۔''

شریف عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پاؤں تک چھپا لے، جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب و زینت کی ساری چیزیں چھپ جائیں اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منہ پر بھی آجائے، تاکہ ہر مرد کو معلوم ہو جائے کہ یہ شریف خاتون ہے، لونڈی نہیں۔ پھر نگاہیں شرم سے جھکی رہیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَاۗءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۭ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۹)

''اے پیغمبر ﷺ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو کہہ دے کہ نیچے لٹکا لیں

اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں، اس سے لگتا ہے کہ پہچانی پڑیں، ❶ تو کوئی نہ ستائے۔"

﴿ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۠ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ ﴾

(۲٤/ النور:۳۱)

"اور اے پیغمبر ﷺ! ایمان والیوں کو کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنا ستر چھپائیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں، مگر جو (فطرۃً کھلا رہتا ہے اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں، لیکن شوہر (وغیرہ محرم) کو۔" (اخیر تک پڑھیے)

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوشبو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہیے، ❷ کیونکہ اس سے میلانِ طبع پیدا ہوتا ہے اور عورت کا یہ خیال برملا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافتِ نسوانی کے خلاف ہے۔

راستہ میں مرد اور عورت کو مل جل کر نہیں چلنا چاہیے، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے، عورتوں کو وسط راہ سے الگ ہو کر راستے کے کنارے سے چلنا چاہیے۔ ایک بار راستہ میں مرد اور عورت باہم مل جل گئے تو آپ ﷺ نے یہ حکم دیا اور اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ عورتیں راستہ کی ادھر ادھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگیں۔ ❸

راستہ چلنے میں ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہیے، یہاں تک کہ اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت میں ملنے کے لیے متانت کے خلاف دوڑنا نہیں چاہیے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اگر مسجد میں تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس میں شامل نہ ہو، بلکہ تم متانت اور وقار کے ساتھ آ کر جماعت میں ملو۔" ❹

مقدور ہو تو پاؤں کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کے لیے جوتے پہنے جائیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اکثر جوتے پہنا کرو، یعنی جوتے پہن کر چلا کرو کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے۔" ❺

جوتے دونوں پاؤں میں پہن کر چلنا چاہیے یا دونوں پاؤں ننگے رہیں، یعنی یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو اور دوسرا پاؤں ننگا ہو۔ ❻ کیونکہ یہ ادب و وقار کے خلاف ہے، ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھیں گے لیکن اگر گھر میں کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہیں۔ ❼

---

❶ یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خواتین ہیں، ان کو کوئی راستہ میں چھیڑے نہیں۔ ❷ ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ماجاء فی کراهية خروج المرأة متعطرة:۲۷۸٦۔ ❸ ابوداود، کتاب الادب، باب فی مشی النساء مع الطریق فی الطریق: ۵۲۷۲۔ ❹ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب إتيان الصلوة بوقار: ۱۳٦۰۔

❺ ابو داود، کتاب اللباس، باب الانتعال:٤۱۳۳۔ ❻ ایضًا:٤۱۳٦۔

❼ ترمذی، کتاب اللباس، باب ماجاء فی الرخصة فی المشی فی النعل الواحدة:۱۷۷۷، ۱۷۷۸۔

آدابِ سفر

آنحضرت ﷺ نے جس زمانہ میں سفر فرمایا، اس وقت زمانہ کے حالات اور سواریوں کے طریقے اور تھے، اس لیے اس کے آداب عرب کی سرزمین، عرب کی آب و ہوا اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت و مطابقت رکھتے تھے۔ عرب کی زمین خشک، بنجر اور پتھریلی، پانی کی قلت، ہوا کی گرمی، دھوپ کی تمازت، قتل و غارت گری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ، ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر آنحضرت ﷺ نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتیں کی ہیں، جن میں سے بعض کی حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ میں پابندی ضروری نہیں، تاہم جہاں اب بھی وہ حالات باقی ہیں، ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، بالخصوص دیہات وقصبات کے لوگ ان سے زیادہ متمتع ہو سکتے ہیں، جن کو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے اور صحرا و بیابان کے راستوں میں ضروریاتِ زندگی کے وہ ساز و سامان میسر نہیں آتے جن کی اسٹیشنوں اور ہوٹلوں میں بہتات ہوتی ہے۔

① سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہیے اور اس کو خیر و عافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہیے اور ہو سکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہیے، جس کو رسول اللہ ﷺ فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے: [1]

((اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكُمْ وَاَمَانَتَكُمْ وَخَوَاتِيْمَ اَعْمَالِكُمْ))

''یعنی تمہارے دین، امانت اور خاتمہ عمل اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔''

② سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہیے، [2] اس سے انسان کا وقت ضائع نہیں ہوتا، بلکہ پورا دن کام میں آ جاتا ہے اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہے اور ایک معتدبہ مسافت طے کر کے دوپہر کے وقت آرام کر سکتا ہے۔

③ سفر تنہا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چاہییں۔ [3] اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے اور اسبابِ سفر کی حفاظت و نگرانی میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

④ اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کریں تو ان میں ایک کو اپنا امیر بنا لینا چاہیے۔ [4] اسی شخص کو کاروان سالار کہتے ہیں۔

⑤ سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ گھر والوں کو تیاری کا تھوڑا موقع دینا چاہیے۔ [5]

---

[1] ابو داود، كتاب الجهاد، باب في الدعاء عند الوداع: ٢٦٠١۔

[2] ابو داود، كتاب الجهاد، باب في الابتكار في السفر: ٢٦٠٦۔

[3] ابو داود، كتاب الجهاد، باب في الرجل يسافر وحدة: ٢٦٠٧۔

[4] ابو داود، كتاب الجهاد، باب في القوم يسافرون يؤمرون احدهم: ٢٦٠٨، ٢٦٠٩۔

[5] ابو داود، كتاب الجهاد، باب في الطروق: ٢٧٧٦۔

⑥ اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہیے۔ ❶

⑦ سفر رات کو کرنا چاہیے، حدیث میں اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے کہ رات کو مسافت خوب طے ہوتی ہے، ❷ اور درحقیقت لو، گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے، بہرحال عرب کی سرزمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لیے دو مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے، صبح کا وقت اور رات کا وقت۔

⑧ مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام وآسائش کا خیال رکھنا چاہیے۔

⑨ رات کو مقام راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہیے، کیونکہ راستہ سے جانور گزرتے رہتے ہیں اور موذی جانوروں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ ❸

⑩ جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً واپس آ جانا چاہیے، کیونکہ سفر بہرحال تکلیف اور بے اطمینانی کی چیز ہے۔ ❹

---

❶ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی التلقی:٢٧٧٩۔ ❷ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الدلجة:٢٥٧١۔

❸ مسلم، کتاب الامارة، باب مراعاة مصلحة الدواب فی السیر...... ٤٩٥٩، ٤٩٦٠۔

❹ مسلم، کتاب الامارة، باب السفر قطعة من العذاب:٤٩٦١۔

آدابِ خواب

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات میں شمار کیا ہے اور فرمایا ہے:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ ﴾ (۳۰/ الروم:۲۳)

''اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک تمہارا رات کو سونا ہے۔''

سورۂ فرقان میں فرمایا:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۴۷)

''اور اسی نے تمہارے لیے رات کو پردہ، نیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا۔''

سورۂ نبا میں ہے:

﴿ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ ﴾

(۷۸/ النبا:۹۔۱۱)

''اور ہم نے نیند کو تمہارے لیے آرام اور رات کو پردہ اور دن کو کاروبار بنایا۔''

ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لیے رات کا وقت ہے اور دن کا وقت کاروبار اور محنت کے لیے ہے۔ یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گزرے، البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب سے کچھ دیر اہلِ عرب آرام کرتے تھے، جس کو قیلولہ کہتے تھے، جس کا ذکر سورۂ نور میں ہے:

﴿ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ ﴾ (۲۴/ النور:۵۸)

''اور رات آرام میں گزاری جائے اور ہو سکے تو اس کے کچھ حصوں میں اللہ کی یاد کی جائے۔''

جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے، غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہیں، وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں، یہاں تک کہ ساری رات عبادتوں میں جاگ جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے۔'' [1] یہ تو عام افراد کے لیے ہے، لیکن خاصانِ الٰہی ایسے بھی ہو سکتے ہیں، جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے:

﴿ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ ﴾ (۵۱/ الذاریات:۱۷)

''یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے۔''

① سنت نبوی نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتا دیئے ہیں، نماز عشاء پڑھنے سے پہلے سونا

---

[1] بخاري، كتاب النكاح، باب لزوجك عليك حق:۵۱۹۹۔

نہیں چاہیے، کیونکہ اس سے پہلے سوجانا غفلت کی نشانی ہے اور نماز عشاء پڑھ کر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہیے۔ 1 یہ اس لیے، تاکہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے اور اخیر رات میں اللہ کی عبادت میں نیند کی کمی کے سبب سے سستی نہ ہو۔

لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نماز عشاء کے بعد اس کے لیے بات چیت کرنا منع نہیں، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نماز عشاء کے بعد بعض ضروری کاموں میں مشورہ کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں اور آپ نے بات چیت فرمائی ہے۔ 2

② احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہیے، پھر داہنی کروٹ لیٹنا چاہیے۔ 3

③ ایسی چھت پر نہیں سونا چاہیے، جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی ہو۔ 4 کیونکہ ایسی حالت میں زمین پر گر پڑنے کا اندیشہ ہے۔

④ پاکی کی حالت میں سونا چاہیے، بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے۔ 5

⑤ پیٹ کے بل نہیں سونا چاہیے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اسی طرح سوتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ "سونے کا یہ طریقہ اللہ کو پسند نہیں۔" 6

⑥ ایک پاؤں کو اٹھا کر اس پر دوسرے پاؤں کو رکھ کر لیٹنا نہیں چاہیے 7 کیونکہ عرب کے لوگ عموماً تہبند باندھتے ہیں، اس لیے اس میں کشف عورت کا احتمال ہے، البتہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار خود رسول اللہ ﷺ اس طریقہ سے لیٹے تھے۔ 8

⑦ سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہیے۔ کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہیے، چراغ کو بجھا دینا چاہیے، کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی بتی کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے۔ یہی حال آگ کا بھی ہے۔ ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "آگ تمہاری دشمن ہے، جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو۔" 9

---

1 ابوداود، کتاب الادب، باب فی السمر بعد العشاء: ٤٨٤٩۔ 2 صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب اکرام الضیف: ٥٣٦٥۔ 3 ابوداود، کتاب الادب، باب ما یقول عندالنوم: ٥٠٥٠۔

4 ابوداود، کتاب الادب، باب فی النوم علی السطح: ٥٠٤١۔

5 ابوداود، کتاب الادب، باب مایقال عند النوم، ٥٠٤٦تا٥٠٤٨ وباب فی النوم علی طهارة: ٥٠٤٢۔

6 ابوداود، کتاب الادب، باب فی الرجل ینبطح علی بطنه: ٥٠٤٠۔

7 ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ماجاء فی کراهیة فی ذلك: ٢٧٦٦۔

8 ترمذی، ابواب الاستئذان، باب ما جاء فی وضع احدی الرجل علی الاخری مستلقیا: ٢٧٦٥۔

9 بخاری، کتاب الاستئذان، باب لاتترك النار فی البیت عند النوم: ٦٢٩٤ وباب غلق الابواب باللیل: ٦٢٩٦ مگر یہ اس حالت کے متعلق ہے جب گھر کی چھتیں پست ہوں اور بتی کا پرانا دیا جلایا جائے۔

⑧ سوتے اور سو کر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہیے، سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے:

((اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ اَحْيٰى وَاَمُوْتُ))

''اے اللہ! میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں۔''

اور جاگے تو کہے:

((اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ)) [1]

''اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا اور جس کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔''

حدیثوں میں اس موقع کے لیے اور بہت سی مؤثر دعائیں منقول ہیں۔

[1] ابو داود، کتاب الادب، باب مایقول عند النوم:٥٠٤٩۔

آدابِ لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہیں، ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی۔ جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصوں پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہیے وہ چھپے رہیں۔ اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہیں جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جزو ٹھہرایا، یہاں تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔

مردوں کے لیے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتوں کے لیے سر کے بالوں سے لے کر ٹخنوں اور گٹوں تک اور لونڈیوں کے لیے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے، [1] جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہیں، یہاں تک کہ تنہائی میں بھی ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہیں۔ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو؟ فرمایا: ''اللہ تو دیکھتا ہے، اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہیے۔'' [2] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کبھی ننگے نہ ہو، کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں، جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں، تو ان سے شرم کرو اور ان کا لحاظ رکھو۔'' [3]

حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو بہشت میں جو بہشتی جوڑے ملے تھے، اللہ کی نافرمانی کرنے سے وہ ان کے بدن سے اتر گئے تو وہ فوراً درخت کے پتوں سے اپنی برہنگی چھپانے لگے:

﴿ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ ﴾

(۷/ الاعراف:۲۲)

''تو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا، ان کے ستر ان پر کھل گئے، تو اپنے اوپر درخت کے پتوں کو جوڑنے لگے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے، مگر دنیا میں آ کر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی، جنگلی اور صحرائی قومیں ستر کے حدود کو صرف شرم گاہوں تک محدود کر لیتی ہیں، عرب میں بھی یہی حال تھا، بلکہ حج میں انھوں نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورت خانہ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے، [4] ورنہ یوں ہی ننگے پھرا کرتے تھے، وحی الٰہی نے انسانوں کو تہذیب وسلیقہ کا یہ سبق دیا۔

---

[1] عورت کا چہرہ، قدم اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں۔ [2] سنن ترمذی، ابواب الادب، باب ما جاء فی حفظ العورۃ: ۲۷۹۴۔ [3] ایضا، باب ما جاء فی الاستتار: ۲۸۰۰۔ [4] صحیح مسلم، کتاب التفسیر، تفسیر فی قولہ تعالی: خذوا زینتکم: ۷۵۵۱ وطبری، تفسیر آیات ذیل، ج۸، ص:۹۹۔

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ﴾

(۷/ الاعراف:۲۶)

''اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری ستر اور زینت کا سامان۔ اور پرہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔''

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (۷/ الاعراف:۳۱)

''اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (یعنی لباس) اختیار کرو۔''

﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ ﴾ (۷/ الاعراف:۳۲)

''کہہ دے کس نے اللہ کی اس زینت کو جس کو اس نے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے، منع کیا ہے۔''

﴿ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۳۳)

''کہہ دے کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ہوں منع کیا ہے۔''

ان آیتوں میں جس بے حیائی کی طرف اشارہ ہے وہ برہنگی ہے اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا وہ ستر پوشی ہے۔ ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصد ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے، پہلی آیت کے آخر میں لباس کے باب میں اصول کلیہ کی صورت میں ایک بلیغ فقرہ ہے، جو بہت سی جزئیات کو حاوی ہے:

﴿ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ﴾ (۷/ الاعراف:۲۶)

''اور پرہیز گاری کا لباس یہ بہتر ہے۔''

پرہیز گاری کے لباس سے کیا مقصود؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان، دوسروں نے اعمال صالحہ یا شرم و حیا مراد لی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہیے، اسی لیے کچھ مفسروں نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہے۔ مشہور تابعی مفسر ابن زید نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے، کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباس تقویٰ قرار دیا ہے، کسی نے اس سے زہد و ورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہیں، [1] لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہونا ہے، صحیح یہ ہے کہ لباس التقویٰ سے تقویٰ اور پرہیز گاری ہی کا لباس مراد ہے، یعنی وہ لباس پہننا چاہیے جو تقویٰ اور پرہیز گاری کا منشا ہے، اس کو آنحضرت ﷺ نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرما دیا ہے، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمہ قرآن کے حواشی میں لکھتے

[1] روح المعانی، تفسیر آیت مذکور، ج۸، ص:۹۰۔

ہیں: ''اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیز گاری ہو، مرد لباس ریشمی نہ پہنے اور دامن دراز نہ رکھے اور جو منع ہوا ہے سونہ کرے اور عورت باریک نہ پہنے، کہ لوگوں کو نظر آئے اور اپنی زینت نہ دکھائے۔'' (تفسیر سورۂ اعراف آیت مذکور)

اسلام میں لباس و پوشاک کی حد بندی اس کے سوا کچھ اور نہیں کی گئی ہے، اس حد بندی کی تشریح احادیث کے مطابق حسب ذیل ہے:

① مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا انہیں پہننا چاہیے، کیونکہ اس سے زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے جو مردوں کی جدوجہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے۔ ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں، تاکہ لوہے کی کڑیاں بدن میں نہ چبھیں، یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردرا پن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے ان دونوں موقعوں پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں، اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے میں لگالے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ ❶

② مردوں کے لیے عورتوں کی سی پوشاک اور عورتوں کے لیے مردوں کی سی پوشاک پہننا جائز نہیں، کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس اور طور وطریق کی مشابہت کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس اور طور وطریق کی نقالی کریں لعنت فرمائی ہے۔ ❷

③ عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، ان کے بڑے بڑے امراء اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی اپنا لباس فخر وغرور اور بڑائی کے اظہار کے لیے گھسیٹ کر چلے گا، اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں اٹھائے گا۔'' ❸ اسی لیے مرد کو پائجامہ کی مہریوں اور تہبند کو اتنا نیچا نہیں کرنا چاہیے کہ ٹخنے چھپ جائیں، بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''پائجامہ اور تہبند نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنوں سے اونچا رہے۔'' ❹ فرمایا ''ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا۔'' ❺ البتہ عورتوں کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے۔

④ ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگوں کی انگلیاں اٹھیں، پہننا ٹھیک نہیں۔ خواہ وہ امیروں کی زرق برق پوشاکیں ہوں یا مولویوں کا نمائشی عبا، جبہ، یا صوفیوں کا گیروا رنگ۔ کیونکہ ایسے کپڑوں کے پہننے والوں کا اصل منشا اپنے کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے اور یہ تفوق و امتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے۔

---

❶ صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب تحریم لبس الحریر: ٥٤٠١ تا٥٤٢٨۔ ❷ ابو داود، کتاب اللباس، باب فی لباس النسآء: ٤٠٩٧۔ ❸ ابو داود، کتاب اللباس، باب فی قدر موضع الازار: ٤٠٩٣۔
❹ ابو داود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار: ٤٠٨٤۔ ❺ ایضًا۔

⑤ مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے، عورتوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ ''کتنی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں ننگی رہتی ہیں۔'' [1]

⑥ ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو۔ یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپیں، جائز نہیں۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کوئی ایسا ہی (یا باریک) کپڑا پہن کر حضور ﷺ کے سامنے آئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اسماء! جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے سوا کچھ کھولنا حلال نہیں۔'' [2]

⑦ مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں، سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں، ایسی سرخ دھاریوں کی چادر آپ ﷺ نے اوڑھی ہے، زرد رنگ کے کپڑے پہنے جا سکتے ہیں، آپ ﷺ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے۔ البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں اور خوشبو کے لیے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا، مردوں کے لیے منع ہے۔ سبز رنگ کی چادر بھی آپ ﷺ نے اوڑھی ہے اور اس رنگ کا تہبند بھی آپ ﷺ نے باندھا ہے، سیاہ رنگ کا عمامہ بھی زیب سر فرمایا ہے۔

⑧ مردوں کے لیے عام طور سے سفید رنگ کے کپڑے آپ ﷺ نے پسند فرمائے ہیں۔

⑨ آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہیے۔

⑩ نیا لباس پہنتے وقت آپ ﷺ دعا پڑھا کرتے تھے، جس میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے، یہ دعا پڑھتے تھے: [3]

((اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ كَسَانِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَقُوَّةٍ)) [4]

''اس اللہ کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا اور روزی کیا میری قوت کے بغیر (یعنی محض اپنے فضل سے)۔''

---

[1] صحیح مسلم، کتاب اللباس، باب النسآء الکاسیات: ۵۵۸۲۔

[2] ابو داود، کتاب اللباس، باب فیما تبدی المرأۃ من زینتها: ۴۱۰۴۔

[3] اس باب کی یہ ساری حدیثیں صحاح اور سنن کی کتاب اللباس میں ہیں، میرے پیش نظر اس وقت ابوداود اور ترمذی ہیں ان مسائل کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔

[4] ابو داود، کتاب اللباس، باب ما یقول اذا لبس ثوبا جدیدا: ۴۰۲۳

نوٹ: ابوداود میں ''هٰذَا الثَّوْبَ'' کے الفاظ ہیں۔

آدابِ مسرت

انسان کو جن چیزوں پر مسرت حاصل ہوتی ہے ان کی کوئی انتہا نہیں۔ مال و دولت، علم و فضل، عہدہ و منصب، شادی بیاہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی میں اظہارِ مسرت کے سینکڑوں مواقع پیش آتے ہیں، لیکن یہ مسرت جب حدِ اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے، قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اسی قسم کی فخر آمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا:

﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ۝ ﴾ (۲۸/ القصص:۷۶)

''جب کہا اس کو اس کی قوم نے اترا مت، اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے۔''

اسلام نے چونکہ تمام جذبات میں اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے، اس لیے اس نے اس قسم کی مسرتوں کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے:

﴿ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ۝ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ۝ ﴾

(۱۱/ ھود:۹۔۱۰)

''اور اگر ہم چکھادیں آدمی کو اپنی طرف سے مہر پھر وہ چھین لیں اس سے تو وہ ناامید، ناشکر ہوا اور اگر ہم چکھادیں اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچے اس کو تو کہنے لگے گئیں برائیاں مجھ سے تو وہ خوشیاں کرتے بڑائیاں کرتا۔''

اور اس کی ممانعت کی ہے:

﴿ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ۝ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲۳)

''اور نہ اتراؤ اس پر جو تم کو اس نے دیا اور اللہ نہیں چاہتا ہے کسی اتراتے بڑائی مارتے کو۔''

ساتھ ہی اس کے مسلمانوں میں مردہ دلی نہیں پیدا کی ہے، بلکہ معتدل طریقہ پر اظہارِ مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں۔

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اسی کے فضل و کرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی، اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدہ شکر بجا لانا چاہیے، تاکہ غایت مسرت کی حالت میں دنیوی فخر و غرور کے بجائے انسان کی نیازمندی کا اظہار ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدہ شکر بجالاتے، ایک بار مکہ سے مدینہ جارہے تھے، جب غروراء کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے، اس کے بعد دیر تک دعا کی پھر سجدہ میں گر پڑے، اسی طرح تیسری بار بھی دعا کی اور سجدہ میں گر پڑے اور فرمایا کہ ''میں نے اللہ سے اپنی

امت کے لیے شفاعت کی دعا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے شفاعت قبول کر لی، اس لیے میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے سر اٹھا کر اپنی امت کے لیے یہی درخواست کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے اور میری درخواست قبول کی، اس لیے میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں گر پڑا، پھر میں نے یہی التجا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے اور میری التجا کو قبول کیا، تو میں اپنے اللہ کے لیے سجدہ میں گر پڑا۔'' ❶

صحابہ کرام کا یہی دستور تھا۔ چنانچہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ جب قبول ہوئی اور ان کو اس کا مژدہ سنایا گیا تو وہ سجدہ میں گر پڑے۔ اس قسم کے مسرت آمیز موقعوں پر دوسرے مسلمانوں کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارک باد دے کر اس کی مسرت میں شریک ہوں۔ چنانچہ اس موقع پر صحابہ کرام بھی ان کے پاس جوق در جوق آئے اور ان کو مبارک باد دی۔ ❷

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن میں پہنچنے کی مسرت ہوتی ہے، اس موقع پر اعزہ و احباب کی دعوت کی جا سکتی ہے کہ وہ بھی اس مسرت میں شریک ہوں، چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ سفر سے مدینہ میں آئے تو اونٹ یا گائے ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا، ❸ اس موقع پر دوسروں کا فرض بھی یہ ہے کہ سفر سے واپس آنے والے کا استقبال کریں، تا کہ اس طریقہ سے ان کی مسرت کا اظہار ہو۔ رسول اللہ ﷺ جب غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو لوگوں نے ثنیۃ الوداع تک جا کر آپ ﷺ کا استقبال کیا، جس میں بچے بھی شامل تھے۔ ❹

اجتماعی طور پر اظہار مسرت کا عام موقع شادی بیاہ میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے اظہار مسرت کے لیے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے، تا کہ خوب اعلان ہو اور سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((فصل مابين الحلال والحرام الدف والصوت))

''حلال اور حرام میں دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے۔'' ❺

یعنی زنا اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ گا کر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے، تا کہ عام طور سے سب کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مرد اور فلاں عورت نے باہم مل کر ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا ہے اور زنا چھپ کر چپکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔

---

❶ ابو داود، کتاب الجهاد، باب في سجود الشكر: ٢٧٧٥۔ ❷ بخاري، كتاب المغازي، حديث كعب بن مالك: ٤٤١٨۔ ❸ ابو داود، كتاب الاطعمة، باب الاطعام عند القدوم من السفر: ٣٧٤٧۔

❹ ابو داود، كتاب الجهاد، باب في التلقي: ٢٧٧٩۔

❺ ترمذي، كتاب النكاح، باب ما جاء في اعلان النكاح: ١٠٨٨۔

حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا تو رسول اللہ ﷺ تشریف لا کر ان کے پاس بیٹھے، چند لڑکیاں دف بجا بجا کر حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا کے ان بزرگوں کی تعریف میں اشعار گانے لگیں، جو غزوۂ بدر میں شہید ہوئے تھے، اسی حالت میں ایک نے یہ مصرع گایا:

وَفِينَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَافِي غَدٍ.

''ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔''

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس کو چھوڑ دو اور جو گا رہی تھیں اسی کو گاؤ۔'' ❶

ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشتہ دار عورت کا نکاح کر کے اس کو رخصت کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''عائشہ! تم لوگوں کے ساتھ گیت نہ تھا، حالانکہ انصار کو گیت پسند ہے۔'' ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگوں نے اس کے ساتھ ایک لونڈی کیوں نہیں بھیجی جو دف بجاتی اور گاتی جاتی۔'' ❷

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا، قرظہ بن کعب رضی اللہ عنہ اور ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیٹھے لڑکیوں کا گانا سن رہے تھے، اتنے میں عامر بن سعد ایک تابعی آ گئے، انھوں نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا، آپ دو صاحب بدری صحابی ہیں اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے، انھوں نے کہا تمہارا جی چاہے تو تم بیٹھ کر سنو، رسول اللہ ﷺ نے شادی بیاہ کے موقع پر ہم کو اس کی اجازت دی ہے۔ ❸ عربوں میں رسم تھی کہ دولہا کو بالرفاء والبنین کہہ کر عیش و آرام اور اولاد نرینہ کی دعا دیتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی:

((بارك الله لك وبارك عليك وجمع بينكما في خير))

''تمہارے لیے اللہ مبارک کرے، تم پر برکت اتارے اور تم دونوں میں بھلائی میں میل ملاپ رکھے۔'' ❹

شادی بیاہ میں دوستوں اور عزیزوں کی دعوت مسنون ہے، اس کو ولیمہ کہتے ہیں۔ جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزوں اور دوستوں کو اس موقع پر کھلائے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اور کچھ نہیں تو ایک بکری ذبح کر کے کھلا دو۔'' ❺ اور خود کبھی پنیر، گھی اور چھوہارے بھی کھلائے ہیں، ❻ اسی طرح دوست اور عزیز کو اس کی شادی میں تحفہ کے طور پر بھی کچھ بھیج سکتے ہیں۔ ❼

❶ بخاری، کتاب النکاح، باب ضرب الدف فی النکاح والولیمة:٥١٤٧۔
❷ بخاری، کتاب النکاح، باب النسوة التی یهدین المرأة الیٰ زوجها ودعاء هن بالبرکة:٥١٦٢۔
❸ نسائی، کتاب النکاح، باب اللهو والغناء عندالعرس:٣٣٨٥۔ ❹ ابوداود، کتاب النکاح، باب ما یقال للمتزوج: ٢١٣٠۔ ❺ بخاری، کتاب النکاح، باب الولیمة ولوبشاة:٥١٦٧۔ ❻ نسائی، کتاب النکاح، باب البناء فی السفر:٣٣٨٢۔ ❼ نسائی، کتاب النکاح، باب الهدیة لمن عرس: ٣٣٨٩۔

مسلمانوں کے لیے اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر اجتماعی اظہار مسرت کا موقع عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن پیش آتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نے سال میں دو دن مقرر کیے تھے، جن میں وہ خوشیاں مناتے تھے، رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ ''تم لوگ پہلے دو دن خوشیاں مناتے تھے، اب اللہ نے ان کو تمہارے لیے ان سے دو بہتر دنوں سے بدل دیا، یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن۔'' ❶ خوشی کے ان دو دنوں کی تعیین میں دوسری مشرک قوموں کی طرح فصل و موسم اور دوسرے غیر موحدانہ مشاہد کو یادگار کا ذریعہ نہیں بنایا گیا، بلکہ دین حنیف کے دو عظیم الشان واقعوں کو اظہار مسرت کے لیے پسند کیا گیا، عید الاضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی خوشیوں اور خانہ کعبہ کی بنا اور عید الفطر اسلام کی آمد اور قرآن پاک کے نزول کی یادگار ہے۔ ان دونوں میں اظہار مسرت کے لیے عمدہ لباس پہننا اور خوشبو لگانا مسنون فرمایا، اس کے علاوہ خوشی و مسرت کا گانا اور دوسری قسم کے جائز کھیلوں کو پسند فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دو لونڈیاں جو پیشہ ور گانے والیاں نہ تھیں، وہ اشعار گا رہی تھیں، جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے، اسی حالت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور کہا کہ ''شیطان کے مزامیر اور رسول اللہ ﷺ کے گھر میں''۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوبکر! ہر قوم کے لیے عید کا دن ہوتا ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے۔'' ❷ یعنی اس دن گانا مباح ہے۔ ❸

حبشی لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے اور رسول اللہ ﷺ اس کو پسند فرماتے تھے، ایک بار عید کے دن یہ لوگ اسی قسم کا کرتب دکھا رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ تماشا دکھایا اور حبشیوں سے کہا کہ ''ہاں بنوارفدہ''! اس سے آپ کا مقصد ان میں مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا، یہاں تک کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھک گئیں تو آپ نے کہا کہ ''بس'' انھوں نے کہا، ہاں۔ ارشاد ہوا: ''تو جاؤ۔'' ❹

مسرت کے اس طریقہ اظہار کا نام ''تقلیس'' تھا، جس کے معنی دف بجانے، گانے اور دلچسپی کے لیے شمشیر بازی، نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں راستوں پر کھڑے ہو کر ڈھول بجا کر اچھلیں کو دیں، تماشے دکھائیں، عہد رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر رواج تھا کہ جب صحابہ کو کسی جگہ عید کے دن اظہار مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا، تو ان کو تعجب ہوتا تھا، چنانچہ ایک بار حضرت عیاض اشعری رضی اللہ عنہ نے انبار میں عید کی تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کے پاس لوگ ''تقلیس'' کیا کرتے تھے، اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے۔

---

❶ نسائي، كتاب صلوة العيدين: ١٥٥٧۔ ❷ بخاري، كتاب العيدين، باب سنة العيدين لاهل الاسلام: ٩٥٢۔ ❸ بشرطیکہ اس کے مضامین اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے برے نہ ہوں۔
❹ بخاري، كتاب العيدين، باب الحراب والدرق يوم العيد: ٩٥٠۔

حضرت قیس بن سعد فرماتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جو چیزیں تھیں وہ سب میں نے دیکھ لیں، بجز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ ﷺ کے سامنے ''تقلیس'' ہوتی تھی۔ [1]

عیدین کے دن خوشی و مسرت کے اس طریقہ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک دو موقع ایسے مذہبی و قومی جشن کے آئیں، جن میں لوگ کھل کر خوشی کر سکیں اور متین سے متین آدمی کچھ دیر انبساط خاطر کا اظہار کرلے، اسی لیے ان دنوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''یہ دن کھانے پینے، اہل و عیال سے لطف اٹھانے اور یاد الٰہی کے ہیں۔'' [2] اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے کہ قلب کو اللہ کی یاد سے غفلت نہ ہو، اسی لیے عید کے دونوں موقعوں پر دو گانہ ادا کرنا سنت ٹھہرایا، تکبیر کہتے ہوئے ایک راستہ سے عید گاہ کو جائیں اور دوسرے راستہ سے لوٹیں، تاکہ ہر طرف اسلام کی شان و شوکت کا اظہار ہو اور ﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵) کی تعمیل ہو۔

---

[1] ابن ماجه، كتاب الصلوة، باب ماجاء فى التقليس يوم العيد:۱۳۰۳۔

[2] شرح معانی الآثار طحاوی، ص: ۴۲۹، یہاں بعال کا ترجمہ اہل و عیال سے لطف اٹھانا کر دیا گیا ہے۔

آدابِ ماتم

خوشی اور غم توأم ہیں، جس طرح انسان خوشی میں بے اعتدالی کرتا ہے، غم کی حالت میں بھی وہ اعتدال سے گزر جاتا ہے، عربوں میں فخر وغرور اور جہالت ووحشت کی وجہ سے تعزیت وماتم کی عجیب عجیب رسمیں قائم ہوگئیں تھیں، فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہیں جاتا تھا، اس لیے اظہار فخر کے بہت سے طریقے جاری ہوگئے تھے، سب سے مقدم یہ کہ میت جس درجہ کا ہو اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہیے چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے۔

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے:

اذا مـتُّ فـابـكـيـنـي بِـمَا انا اَهْلُهٗ وشـقـي عَلَيَّ الجيب يا ابنة معبد [1]

جب میں مر جاؤں تو میرے لیے میرے درجہ کے موافق رونا اور میرے لیے گریبان کو چاک کر ڈالنا

منہ پر تھپڑ مارنا، چھاتی کوٹنا، سر کے بال کھول دینا، عام رسم تھی اور شعراء اس کا فخر یہ اظہار کرتے تھے:

مـن كـان مسـرورًا بـمقتل مـالك فـلـيـأت نسـوتـنـا بـوجـه نـهـار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہوتا تھا تو ہماری مستورات کو دن دھاڑے آ کر دیکھے

يَـجـد الـنـسـاءَ حـواسـرًا ايندبنه يـلـطـمـن اوجـهـهـن بـالاسـحـار

وہ دیکھے گا کہ عورتیں سر کھول کر نوحہ کر رہی ہیں اور صبح کے وقت اپنی گالوں پر طمانچہ مار رہی ہیں

آنحضرت ﷺ نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص گریبان پھاڑتا اور گالوں پر طمانچہ مارتا اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاتا اور بین کرتا ہے، وہ میری امت میں سے نہیں۔'' [2] یعنی یہ میری امت کے کام نہیں۔

حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ کو نہایت محبت تھی، ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو ان کے خاندان کی عورتوں نے نوحہ شروع کیا، آپ نے منع کرا بھیجا، وہ باز نہ آئیں، دوبارہ منع فرمایا، جب پھر نہ مانیں تو آپ نے حکم دیا کہ ''ان کے منہ میں خاک بھر دو۔'' [3]

یہ بھی فخر میں داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رونے والے ہوں، اس بنا پر دور دور سے عورتیں بلا کر آتی تھیں، رفتہ رفتہ یہ رسم مبادلہ کے طور پر داخل مراسم ہوگئی تھی، یعنی کسی میت کے لیے کسی خاندان کی عورتوں نے

---

[1] شرح المعلقات السبع، طرفة بن العبد، ص:٦١۔

[2] ترمذی، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی النهی عن ضرب الخدود:٩٩٩۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب من جلس عند المصيبة يعرف فيه الحزن: ١٢٩٩۔

نوحہ کیا ہے تو اس میت کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا۔ ایک دفعہ ایک خاتون نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ”وہ کون سی بات ہے، جس میں ہم کو آپ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کہ ”نوحہ نہ کرو“۔ وہ بولیں کہ میرے چچا نے جب انتقال کیا تو فلاں خاندان کی عورتیں آ کر روئیں تھیں، ان کا یہ فرض مجھ کو ادا کرنا ہے، آپ نے منع فرمایا، لیکن وہ کسی طرح نہ مانیں، بالآخران کے بار بار اصرار پر اجازت دی، لیکن وہ خاتون آنحضرت ﷺ کا اصلی منشا سمجھ گئیں تھیں، اس لیے پھر کبھی کسی کے نوحہ میں شریک نہیں ہوئیں۔ [1]

دستور تھا کہ جب کوئی مر جاتا تھا تو عام منادی کراتے کہ لوگ کثرت سے آئیں، اس کو عربی میں ”نعی“ کہتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جب مرنے لگے تو (فرمان نبوی کی اس قدر احتیاط مدنظر تھی کہ) وصیت کی کہ ”میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا، میں نے آنحضرت ﷺ کو اعلان مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے اور شاید خبر کرنا بھی اعلان میں داخل ہو۔“ [2]

جنازہ کے ساتھ نوحہ اور ماتم کرنے والے چلتے اور بخوردان جلا کر لے جاتے، [3] آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لے جائے، راگ سے مقصود کفار ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہوسکتا ہے، تب یہ مطلب ہوگا کہ ”جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور باجا نہ لے جائے۔“ [4]

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ ایک جنازہ میں شریک تھے، ایک عورت انگھیٹی لے کر آئی، آپ نے اس کو اس زور سے زجر کیا کہ وہ بھاگ گئی۔ [5]

جنازہ کے پیچھے چلتے تھے تو چادر پھینک دیتے تھے، صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا، ایک دفعہ آپ ﷺ نے لوگوں کو اس صورت میں دیکھا تو فرمایا کہ ”جاہلیت کی رسم پر چلتے ہو؟ میرا یہ ارادہ ہوا کہ میں تمہارے حق میں ایسی بددعا کروں کہ تمہاری صورتیں بدل جائیں۔“ لوگوں نے فوراً چادریں اوڑھ لیں اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا۔ [6]

آنحضرت ﷺ نے سوگ کی مدت بھی مقرر کر دی اور فرمایا کہ ”کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ تین دنوں سے زیادہ کسی کا سوگ کرے، البتہ بیوہ کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا، جس میں وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنے، خوشبو نہ لگائے اور نہ کوئی اور آرائش و زیبائش کرے۔“ [7] کسی عزیز کی موت پر آنکھوں سے

---

[1] ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ الممتحنۃ: ۳۳۰۷۔ [2] ترمذی، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی کراھیۃ النعی: ۹۸۶۔ [3] مسلم، کتاب الایمان: ۳۲۱؛ مسند أحمد، ج ٤، ص: ۱۹۹۔

[4] ابو داود، کتاب الجنائز، باب فی اتباع المیت بالنار: ۳۱۷۱۔ [5] اسد الغابۃ، ج ٤، ص: ۳۹۵۔

[6] ابن ماجه، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی النھی عن التسلب مع الجنازۃ: ۱٤۸۵۔

[7] ترمذی، کتاب الطلاق، باب ماجاء فی عدۃ المتوفی عنھا زوجھا: ۱۱۹۵، ۱۱۹٦۔

آنسو نکلنا جو فطرت کا اقتضا ہے، برا نہیں۔ لیکن زور زور سے چیخنا چلانا بین کرنا منع ہے اور اس پر سخت تہدید فرمائی، آنحضرت ﷺ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب وفات پائی تو آنحضرت ﷺ کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے نکل آئے اور فرمایا کہ ''اے ابراہیم! ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں، لیکن زبان سے وہی نکلے گا جو رب کی مرضی ہے۔'' [1]

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''مردہ پر اس کے اعزہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے''۔ صحابہ اور محدثین کے درمیان اس حدیث کے مطلب میں اختلاف ہے جس بات پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ عرب میں جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ لوگ فخر وغرور کے لیے حسب حیثیت ماتم کرنے کی وصیت کر جاتے تھے، اس وصیت کے مطابق اس پر رونے سے اس کو عذاب ہوتا ہے۔ [2] ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی موت ہو تو مناسب ہے کہ عزیز، دوست، یا محلّہ کے لوگ اس کے ہاں کھانا بھیجیں، کیونکہ غم کے سبب سے اس کے گھر میں کھانا پکانے کا سامان مشکل ہوتا ہے، آنحضرت ﷺ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے موقع پر ان کے گھر کھانا بھجوانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا کہ ''ان کے گھر کے لوگوں کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملے گا۔'' [3] ایک مسلمان کا فرض مشکلات میں صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے، صبر اور دعا دفع غم کا وہ نسخہ ہے جس کو قرآن نے مسلمانوں کے لیے تجویز کیا ہے۔ ﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ (۲/ البقرۃ :۴۵) صبر کا موقع حادثہ کے شروع ہی میں ہے، یہ نہیں کہ شروع میں خوب رو پیٹ لیا جائے اور پھر آخر میں مجبوری کا صبر کیا جائے، آنحضرت ﷺ نے ایک عورت کو جو اپنے بچہ کی موت پر رو رہی تھی سمجھایا، مگر وہ نہیں مانی، بعد کو جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ تھے تو معذرت کرنے آئی اور صبر کا کلمہ ادا کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''صبر صدمہ کے شروع ہی میں کرنا چاہیے۔'' [4] اللہ فرماتا ہے کہ اچھے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے، ﴿ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۵۶) اسی لیے مسلمانوں میں دستور ہے کہ جب غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو انا للّٰہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہیں اور یہ دستور مستحسن ہے۔ تقدیر کا عقیدہ غم کا چارہ کار ہے، جو کچھ ہوا اللہ کے حکم اور مصلحت سے ہوا، یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتایا ہے:

﴿ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲۳)

''تاکہ تمہارے ہاتھ سے جو جاتا رہے اس پر غم نہ کرو۔''

---

[1] مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمته ﷺ الصبیان والعیال:۶۰۲۵۔

[2] فتح الباری، ج۳، ص: ۱۲۲۔ [3] ابو داود، کتاب الجنائز، باب صنعة الطعام لاهل المیت:۳۱۳۲۔

[4] ایضاً، باب الصبر عند المصیبة:۳۱۲۴۔

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتیں ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہیں، ان کو دیکھ کرنا گواری پیدا ہوتی ہے، مثلاً: جمائی لینے میں انسان کا منہ کھل جاتا ہے آہ، آہ یا ہاہ کی ناگوار آواز منہ سے نکلتی ہے اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر مضحکہ انگیز شکل پیدا ہو جاتی ہے، اسی مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: ''جمائی شیطان کی جانب سے ہے اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کہتا ہے، تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے۔'' [1] بعض حدیثوں میں ہے کہ ''جب تم میں کوئی جمائی لے تو اپنے منہ کو بند کر لے، کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے۔'' [2] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس میں حقیقت و مجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کر دیتا ہے، [3] اس لیے اسلام نے مختلف طریقوں سے اس بدنمائی کو دور کیا ہے۔

① پہلا حکم تو یہ ہے کہ جمائی روکنے کی چیز ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو اس کو روکنا چاہیے اور ہاہ ہاہ نہیں کہنا چاہیے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہیے۔ [4]

② جمائی کے برخلاف آپ ﷺ نے چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہیں کی ہے، بلکہ اس کو اللہ کی جانب سے بتلایا ہے، [5] ہمارے شراحِ حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ ''چھینک بدن کے ہلکے پھلکے ہونے، مسامات کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے، لیکن جمائی بدن کے ثقل اور کسل و سستی کا نتیجہ ہے، اس لیے چھینک عمل کے لیے نشاط اور جمائی اس کے لیے کسل پیدا کرتی ہے۔'' شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ چھینک سے دماغی ابخرے نکلتے ہیں اور اس طریقہ سے وہ شفا کا ذریعہ بن جاتی ہے، [6] اس بنا پر شریعت نے چھینکنے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر اللہ کا شکر کرے اور ''**الحمدلله**'' کہے، دوسرے لوگ اس کے جواب میں ''**یرحمك الله**'' کہیں۔ [7]

③ تاہم وہ ایک بدنما چیز ہے۔ بعض اوقات اس حالت میں ناک سے بلغم نکل آتا ہے۔ اس لیے چھینکتے وقت منہ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہیے۔ اور اس طریقہ سے چھینک کی آواز کو پست کرنا چاہیے رسول اللہ ﷺ کا یہی طریقہ تھا۔ [8]

④ انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپ ﷺ نے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عام مجمع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے، خصائص کی بعض کتابوں میں ہے کہ

---

[1] ترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء ان الله یحب العطاس ویکره التثاؤب:٢٧٤٦۔ [2] ابو داود، کتاب الادب، باب فی التثاؤب:٥٠٢٦۔ [3] حجة الله البالغة آداب الصحبة، ج٢، ص:١٤٩۔ [4] ترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء ان الله یحب العطاس ویکره التثاؤب:٢٧٤٧۔ [5] ایضاً:٢٧٤٦، ٢٧٤٧۔

[6] حجة الله البالغة، باب العطس والتثاؤب، ج٢، ص:١٤٩۔ [7] ترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء کیف یشمت العاطس: ٢٧٤١۔ [8] ابو داود، کتاب الادب، باب فی العطاس: ٥٠٢٩۔

ہو، یا سوتے وقت چراغ کو جلائے رکھنا، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''چوہے چراغ کی بتی سے گھر میں آگ لگا دیتے ہیں۔''

④ بعض آداب ایسے ہیں جن سے عجمیوں کے مسرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے، مثلاً: حریر، تصویر دار کپڑوں اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت۔

⑤ بعض چیزیں وقار و تمدن کے منافی ہیں اور انسان کو بالکل وحشیوں اور بدوؤں میں شامل کر دیتی ہیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کی ممانعت فرمائی، تاکہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ نکل آئے۔ [1]

اس تفصیل کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قوموں کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی، اسلام کے احکام میں اور رسول انام ﷺ کے آداب میں وہ سب ملحوظ ہیں اور مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور طبی، غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہیں، یعنی ان آداب کی پیروی سے اللہ کی رضا، رسول ﷺ کی اتباع، روح و جسم کی پاکیزگی، گھر کی صفائی، اخلاق کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحت کی حفاظت اور ترقی، بزرگوں کے آزمودہ اصولِ کار اور طریق زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن و معاشرت ہے۔

اسلام نے ان آداب میں بڑی لچک رکھی ہے، یعنی ان میں جو اصلی اور بنیادی باتیں ہیں، ان کی تو قرآن پاک اور احادیث نبویہ ﷺ میں پوری تاکید کر دی ہے اور اسی تاکید سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ان میں بعض ایسے امور ہیں، جو وقتی مصلحت، عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں، اسی لیے ان کے متعلق کوئی ایسی تاکید نہیں کی جس سے ان کا شعار اسلامی ہونا ظاہر ہو یا ان کے چھوڑنے پر کوئی وعید فرمائی گئی ہو، [2] اور اسی لیے ان کے دنیوی مصالح اور فائدے بھی بتا دیے گئے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان میں کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت نہ ہو، بلکہ اس کی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے، تو وہ برا نہیں۔ جیسے جہاں ہاتھ دھونے میں اصل مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے، وہاں اگر مٹی کی جگہ صابن استعمال کیا جائے، تولیے استعمال میں لائے جائیں، کھانے میں ہاتھ کے بجائے چمچوں سے کھانا نکالا جائے، چھری سے گوشت کاٹا جائے، [3] پلیٹیں بدلی جائیں، یا صفائی اور ستھرائی کے اور دوسرے طریقے اختیار کیے جائیں یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنیں، حلال کھانا کھائیں، بیٹھنے اور سونے کے مناسب سامان استعمال کریں تو اس کی پوری اجازت ہے، لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق و محبت کا ہے، جو لوگ اس سے راہِ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا عزم رکھتے ہوں، ان کے لیے زمانہ کچھ ہی بدل جائے، مگر ان کی نظر میں وہی ادائیں محبوب ہیں جو محبوب سے نسبت رکھتی ہیں۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ، ج ۲، ص: ۱۳۳۔ [2] ہمارے فقہا نے اسی کو سنن الہدیٰ اور سنن الزوائد کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔
[3] آنحضرت ﷺ نے چھری سے گوشت کاٹ کر کھایا ہے۔

ہو، یا سوتے وقت چراغ کو جلائے رکھنا، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''چوہے چراغ کی بتی سے گھر میں آگ لگا دیتے ہیں۔''

④ بعض آداب ایسے ہیں جن سے عجمیوں کے مسرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے، مثلاً: حریر، تصویر دار کپڑوں اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت۔

⑤ بعض چیزیں وقار و تمدن کے منافی ہیں اور انسان کو بالکل وحشیوں اور بدوؤں میں شامل کر دیتی ہیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کی ممانعت فرمائی، تا کہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ نکل آئے۔ [1]

اس تفصیل کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قوموں کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی، اسلام کے احکام میں اور رسول انام ﷺ کے آداب میں وہ سب ملحوظ ہیں اور مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور طبی، غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہیں، یعنی ان آداب کی پیروی سے اللہ کی رضا، رسول ﷺ کی اتباع، روح و جسم کی پاکیزگی، گھر کی صفائی، اخلاق کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحت کی حفاظت اور ترقی، بزرگوں کے آزمودہ اصولِ کار اور طریق زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن و معاشرت ہے۔

اسلام نے ان آداب میں بڑی لچک رکھی ہے، یعنی ان میں جو اصلی اور بنیادی باتیں ہیں، ان کی تو قرآن پاک اور احادیث نبویہ ﷺ میں پوری تاکید کر دی ہے اور اسی تاکید سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ان میں بعض ایسے امور ہیں، جو وقتی مصلحت، عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں، اسی لیے ان کے متعلق کوئی ایسی تاکید نہیں کی جس سے ان کا شعار اسلامی ہونا ظاہر ہو یا ان کے چھوڑنے پر کوئی وعید فرمائی گئی ہو، [2] اور اسی لیے ان کے دنیوی مصالح اور فائدے بھی بتا دیے گئے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان میں کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت نہ ہو، بلکہ اس کی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے، تو وہ برا نہیں۔ جیسے جہاں ہاتھ دھونے میں اصل مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے، وہاں اگر مٹی کی جگہ صابن استعمال کیا جائے، تولیے استعمال میں لائے جائیں، کھانے میں ہاتھ کے بجائے چمچوں سے کھانا نکالا جائے، چھری سے گوشت کاٹا جائے، [3] پلیٹیں بدلی جائیں، یا صفائی اور ستھرائی کے اور دوسرے طریقے اختیار کیے جائیں یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنیں، حلال کھانا کھائیں، بیٹھنے اور سونے کے مناسب سامان استعمال کریں تو اس کی پوری اجازت ہے، لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق و محبت کا ہے، جو لوگ اس سے راہِ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا عزم رکھتے ہوں، ان کے لیے زمانہ کچھ ہی بدل جائے، مگر ان کی نظر میں وہی ادائیں محبوب ہیں جو محبوب سے نسبت رکھتی ہیں۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ، ج ۲، ص: ۱۳۳۔ [2] ہمارے فقہا نے اسی کو سنن الہدیٰ اور سنن الزوائد کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔

[3] آنحضرت ﷺ نے چھری سے گوشت کاٹ کر کھایا ہے۔

حکمتِ ربانی کا چشمہ نور

﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۹)

ناظرین! آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا، اسلام کی اخلاقی تعلیموں اور پیغمبر اسلام ﷺ کی اخلاقی ہدایتوں کا ایک ایک حرف آپ کی نظر کے سامنے آ گیا، آپ نے دیکھا کہ اسلام کا فلسفۂ اخلاق کتنا مکمل، اس کی تعلیم کتنی کامل، اس کے تہذیب وتمدن کے اصول کتنے اعلیٰ اور اس کی اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے بلند ہیں اور یہ سب کچھ ایک نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ اگر حضور کی صداقت کی کوئی دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکمائے زمانہ، فلاسفہ روزگار اور قوموں کے معلم پہنچنے سے عاجز رہے، "معلم امی ﷺ" کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہاں تک پہنچ گئے۔

اگر چہ یہ بات خود بھی اپنی جگہ پر بہت بڑی ہے، لیکن اس سے بھی بڑی یہ ہے کہ اس قوم کو جو تہذیب وتمدن سے ناآشنا، اخلاق عالیہ سے بیگانہ اور سلیقہ وشعور سے عاری تھی، نہ صرف اخلاق وتمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے، بلکہ اپنی تعلیم وتربیت کے صیقل سے ان میں ایسی جلا پیدا کر دی کہ دنیا ان کے اخلاقی جلوؤں کو دیکھ کر ششدر رہ گئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا قبول ہوئی یا یہ کہیے کہ وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو اسماعیل نسل کے خاتم المرسلین ﷺ کی آمد کے لیے کی گئی تھی: ﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ ﴾ "یعنی ایسا نبی جو ان امیوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق وحکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم وتربیت سے پاک وصاف کر کے نکھار دے"۔ یہ نکھارنے والا آیا اور نکھار کر دنیا کو پر بہار بنا گیا۔ (ﷺ)

امیدوارِ رحمت

سید سلیمان ندوی

۲۹ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ





سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم